فیضِ سعید (جلد سوم)

موسوم بہ

مقالاتِ اصلاحی

مجموعہ مضامین

مولانا محمد عبد القوی

خلیفہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب مدظلہ العالی

جمع و ترتیب

مولانا سید خواجہ نصیر الدین قاسمی

استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

سلسلہ مطبوعات
برکات بکڈپو Barakaath Book Depot
۶۱

ناشر

برکات بکڈپو Barakaath Book Depot

تفصیلاتِ طباعت

نام کتاب : فیضِ سعید (جلد سوم)

مجموعہ مضامین : حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہٗ

جمع وترتیب : سید خواجہ نصیر الدین قاسمی

صفحات : ۲۸۸

قیمت : 200/-

طباعت وسرورق : البلاغ گرافکس، حیدرآباد 9441025508

ناشر : برکات بکڈپو، خواجہ باغ کالونی، سعیدآباد، حیدرآباد

ملنے کے پتے

مکتبہ فیض ابرار، نزد مسجد اکبری، اکبر باغ، حیدرآباد۔ ۳۶ 040-65709415

ادارہ اشرف العلوم خواجہ باغ، سعیدآباد حیدرآباد۔ ۵۹ 040-24070681

فیضی کتب خانہ، نزد مدرسہ فیض العلوم، سعیدآباد، حیدرآباد 09849766790

مکتبہ کلیمیہ، نزد یوسفین چوراہا، نام پلی، حیدرآباد، 9885655591

مدرسہ خیر المدارس، چودھری نگر، لاتور، مہارشٹرا 09421956690

فہرست عناوین

۱	کلماتِ بابرکات از حضرت مولانا شاہ جمال الرحمن صاحب مدظلہ العالی	۶
۲	تقریظ از حضرت مولانا مفتی محمد عبد المغنی صاحب مدظلہ	۷
۳	تاثرات از حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری مدظلہ	۸
۴	پیش گفتار	۱۱
۵	فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ	۱۳
۶	ہائے یہ اردو صحافت!	۱۷
۷	جب چڑیا چک گئی کھیت	۲۰
۸	عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے!	۲۹
۹	اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے	۳۸
۱۰	چوں کفر از کعبہ برخیزد	۴۳
۱۱	دارالعلوم دیوبند ہی کا پیچھا کیوں؟	۵۳
۱۲	کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا	۷۱
۱۳	مسلم بھائی بہنوں سے ایک اہم گذارش	۸۹
۱۴	بابری مسجد قضیہ کا فیصلہ	۹۵
۱۵	اگر ایسا نہ کروگے تو۔۔۔۔	۱۰۰
۱۶	علاقائی زبانوں میں کام کی ضرورت	۱۰۵
۱۷	شراب سے معاشرہ کو بچائیے	۱۱۰

۱۸	منشیات ومخدارت اور مسلم نوجوان	۱۱۸
۱۹	عالم عرب میں کیا ہورہا ہے اور کیا ہوگا؟	۱۲۲
۲۰	گرما کی چھٹیاں اوران کا استعمال	۱۲۵
۲۱	کرنے کے چند اہم کام یہ بھی ہیں	۱۳۱
۲۲	رمضان المبارک مولائے مہربان کے لئے یا نفس وشیطان کے لئے	۱۴۲
۲۳	ایصالِ ثواب کا عقیدہ برحق اور اجماعی ہے	۱۴۵
۲۴	برہنہ سری اسلامی تہذیب کے خلاف ہے	۱۵۷
۲۵	سن ہجری تاریخ واحکام	۱۶۴
۲۶	حیاتِ برزخی علامہ ابن تیمیہ کی نظر میں	۱۶۸
۲۷	اعتکاف میں آداب کی رعایت	۱۷۹
۲۸	رمضان کے بعد!	۱۸۲
۲۹	منکرین فقہ کا ظلم وعدوان	۱۸۴
۳۰	انها شهادة	۱۹۴
۳۱	وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ أَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ	۱۹۹
۳۲	وقف بورڈ سے ائمہ وموذنین کو تنخواہوں کی ادائیگی کا مسئلہ	۲۰۳
۳۳	رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ پس منظر اور ضرورت	۲۱۲
۳۴	دارالعلوم دیوبند میں تحفظ سنت کا مشاورتی اجلاس	۲۱۷
۳۵	دو گھنٹے حکیمِ جسم وجاں کی صحبت میں	۲۲۳
۳۶	قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا	۲۳۰
۳۷	ادھر بھی تو دیکھئے!	۲۴۷

۳۸	اختلاف سے کہاں مفر ہے؟	۲۵۵
۳۹	چند معروضات علماء کرام کی خدمت میں نہایت ادب واحترام کے ساتھ	۲۶۰
۴۰	ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں	۲۶۸
۴۱	لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو	۲۷۸
۴۲	لوٹ پیچھے کی طرف اے مسلمان تو	۲۸۰
۴۳	تبصرہ بر ''عمدۃ الاقاویل فی تحقیق الاباطیل	۲۸۴

کلماتِ بابرکات[1]

از

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ **محمد جمال الرحمٰن صاحب** مفتاحی دامت برکاتہم

مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد ان اہل علم وخوش نصیب افراد میں سے ہیں جن سے حق تعالیٰ دینی خدمات کے مختلف میدانوں میں خوب کام لے رہے ہیں، مولانا ایک بڑے مدرسہ کے ناظم اور بہت سی دینی وعصری مدارس کے سرپرست ونگران ہیں، وہ متعدد دینی تنظیموں اور اداروں کے ایک فردِ فعال ہیں، وعظ وارشاد اور اصلاح باطن وتربیت نفوس کی جدوجہد میں مشغول ہیں، تصنیف وتالیف اور قلمی دنیا میں بھی بہت گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انہی میں سے ایک وہ ماہنامہ ہے جو پہلے "اشرف العلوم" کے نام سے بعدازاں "اشرف الجرائد" کے نام سے شائع ہورہا ہے، تقریر کی طرح مولانا کی تحریر بھی شستہ وپرتاثیر ہوتی ہے، موصوف محترم کے مضامین ونگارشات عوام وخواص سب کے لئے نہایت نافع ہیں، بندے نے بھی مولانا کی متعدد تصانیف اور مضامین سے استفادہ کیا ہے، عام طور پر ماہنامے موقتی تقاضوں اوراحوال کی مناسبت سے تحریر کئے جاتے ہیں، نتیجۃً عوام مہینوں کے گذرنے کے ساتھ ان جرائد سے بھی بے اعتنائی برتنے لگتے ہیں، حالانکہ دینی ماہنامے کے موادومضامین اپنی افادیت کے اعتبار سے ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، روزناموں کی خبروں کی طرح دن گذرنے کے

[1] تینوں تقریظات فیض سعید کی پہلی اور دوسری جلد کے لئے لکھی گئی تھیں، برکۃً تیسری جلد میں بھی شامل کرلی گئی ہیں۔

ساتھ غیر اہم نہیں ہوتے، اسی لئے مولانا کے فیض یافتہ شاگردِ رشید مولوی خواجہ نصیر الدین صاحب نے مولانا کے ان مضامین کی افادیت کے پیشِ نظر انہیں یکجا کر کے مستقل کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا اور مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو جمع کیا ہے، جس کا نام ”فیض سعید“ رکھا گیا ہے، جو صاحبِ مضامین کے شیخ محترم کی طرف منسوب ہے، جو انشاء اللہ مزید موجبِ برکات ہوگا۔

محترم مرتب کی یہ کاوش کسی شاگرد کی جانب سے اپنے استاد محترم سے حسنِ عقیدت اور متعلقہ حقوق کی ادائیگی کی شکلوں میں ایک عمدہ و مستحسن شکل ہے، حق تعالیٰ مرتب و مضمون نگار کی ان خدمات کو شرفِ قبول بخشے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو استفادہ کی توفیق دے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا شاہ) محمد جمال الرحمن (صاحب) مفتاحی

❁❁❁❁❁

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد عبد المغنی صاحب دامت برکاتہم

ناظم مدرسہ سبیل الفلاح حیدرآباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً امابعد!

پیش نظر علوم و معارف پر مبنی مجموعۂ مضامین جو کہ فیض سعید کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، ملاحظہ و تقریظ کیلئے میرے پاس بھیجا گیا، مضامین کے دیکھنے کا موقع ملا الحمد للہ مختلف مضامین پر مشتمل بہترین گلدستہ ہے، مضامین نہایت مفید اور کارآمد ہیں اور ان

میں تقریباً ضرورت کے اہم عنوانات آ گئے ہیں، جس طرح شاہین کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی ہے اسی طرح عزیزم مولانا حافظ محمد عبد القوی سلمہ اللہ کے مضامین روحانی اعتبار سے بلند سے بلند تر ہیں۔ عزیزم مولوی خواجہ نصیر الدین قاسمی سلمہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے ان مختلف مضامین کو کتابی صورت میں استفادہ عام کیلئے مرتب کر دیا ہے۔

بارگاہِ ایزدی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کتاب ہذا کو مقبولیتِ عامہ وتامہ نصیب فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مخلوق کو منتفع ہونے کی توفیق بخشے اور آخرت کیلئے صدقۂ جاریہ بنائے، نیز مولف ومرتب دونوں کو اپنی شایانِ شان اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا مفتی) محمد عبد المغنی (صاحب مظاہری)

۲ر صفر المظفر ۱۴۳۱ھ م ۲۰ر جنوری ۲۰۱۰ء

تاثرات

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذ ادب دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب حامی دامت برکاتہم، ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد، ونائب ناظم مجلسِ علمیہ آندھرا پردیش، جنوبی ہند کے اُن باتوفیق علماء میں سے ہیں جن کو اللہ رب العزت نے دین متین کی کثیر جہتی خدمت کیلئے منتخب فرمایا ہے، اُن کا قائم کردہ

ادارہ اشرف العلوم بہت کم وقت میں دکن کی ایک معیاری تعلیم گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کا اندازہ اس کی جانب طلبہ کے رجوعِ عام اور یہاں کے مستفید طلبہ کے مادرِ علمی ام المدارس دار العلوم دیو بند میں بکثرت داخلہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حیدر آباد سے باہر، انتہائی ضرورت کے علاقوں میں مکاتب و مدارس کے قیام کا سلسلہ بھی مولانا نے شروع فرمایا ہے، جن میں سے ایک اہم ادارہ امداد العلوم (نارائن کھیڑ) کے اجلاس میں احقر کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

ان انتظامی اور ملی خدمات کے علاوہ مولانا موصوف کا قلمی جہاد بھی جاری ہے، ان کے ادارہ سے ایک معیاری ماہنامہ ''اشرف الجرائد'' شائع ہوتا ہے جو ان کی بصیرت افروز تحریروں سے مزین ہوتا ہے، جو وقت اور حالات کے تحت ہر قسم کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، انہی تحریروں اور مضامین و مقالات کو ادارہ کے استاذ جناب مولانا سید خواجہ نصیر الدین صاحب زید مجدہم نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے، اس وقت احقر کو اس مجموعہ سے ـــــ جس کا نام ''فیض سعید'' رکھا گیا ہے ـــــ استفادہ کا موقع ملا۔ احقر نے فہرست مضامین دیکھنے کے بعد بعض حصوں کو سرسری دیکھا اور بعض مقالات کو بالاستیعاب پڑھا جس کے بعد احقر بلا تکلف اپنا یہ تاثر ظاہر کرتا ہے کہ مولانا موصوف اپنی تعلیمی، تربیتی اور ملی ذمہ داریوں کی طرح اس میدان میں بھی پوری طرح کامیاب اور موفق من اللہ ہیں، اُن کی تحریر میں الحمد للہ زبان و بیان کی سلاست کے ساتھ ساتھ مسلکِ حق کی کامیاب ترجمانی اور حضراتِ اکابر سے حاصل ہونے والا توازن و اعتدال نمایاں ہے۔

ان مقالات و مضامین کے موضوعات کا انتخاب بھی مولانا کی دینی بصیرت کا آئینہ دار ہے، بلکہ بعض موضوعات تو اُن کی جرأت و بیباکی اور سلیقہ کیساتھ حق گوئی کا شاہکار ہیں، پھر اس قدر تعلیمی، تربیتی اور انتظامی مصروفیات کے ساتھ اس معیار کی تحریری خدمات انجام دینا

بلا شبہ ایک کرامت کی چیز ہے۔ یہ مضامین یقیناً اس لائق تھے کہ ان کو مستقل کتابی شکل میں شائع کر کے ان کے فائدہ کو عام کیا جاتا، اس لئے میں اس کتاب کی اشاعت پر حضرت مولانا موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور حق جل مجدہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ باری تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائے اور اس کو تمام مسلمانوں کے لئے خصوصاً اس علاقہ کے لئے ــــ جہاں صحیح فکری رہنمائی کی ضرورت زیادہ ہے ــــ رشد و ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا) محمد سلمان عفی اللہ عنہ (صاحب)
خادم التدریس دار العلوم دیوبند
(نزیل حیدرآباد دکن)
۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ م ۱۷ مارچ ۲۰۱۰ء، چہارشنبہ

❁❁❁❁❁

پیش گفتار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کے انعاماتِ کثیرہ میں سے ایک عظیم انعام یہ بھی ہے کہ ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جو اکابر اہل حق سے وابستہ اور دین کی خدمت میں مشغول تھا، ایک دینی مدرسہ کے ماحول میں پیدائش ہوئی اور پیدائش سے تادم تحریر زندگی کے پانچ دہے مکمل مدرسہ کے ماحول میں گذر گئے، فللّٰہِ الحمد و لا فخر، اللہ پاک سے دعا ہے ــــ قارئین بھی آمین فرمائیں ــــ کہ بقیہ زندگی جتنی بھی اس کے علم محیط اور کتاب مبین میں باقی ہے اپنے دین کی مخلصانہ خدمات سے وابستہ رکھے، اور کسی ناقدری وناشکر گذاری کی پاداش میں اس خدمت سے کبھی معزول نہ فرمائے۔

یہ شعبان ۱۴۱۳ھ م ۱۹۹۳ کی بات ہے، جبکہ اس عاجز کی عمر ۳۴ر سال تھی اسی کے اگلے سال محرم الحرام ۱۴۱۴ھ سے میں نے اپنی دیرینہ تمنا پوری کرتے ہوئے ادارہ اشرف العلوم سے بنام خدا ایک ماہنامہ کا اجراء کردیا، یہ ماہنامہ ابتداءاً ''اشرف العلوم'' کے نام سے آٹھ سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا، پھر بعض عوارض کی بنا پانچ سال تک موقوف رہا، اس کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت کا سلسلہ جنوری ۲۰۰۶ء سے بنام ''اشرف الجرائد'' شروع ہوا، جو تاہنوز بفضلہٖ تعالیٰ جاری ہے، اور علاقہ کے اردو جرائد میں اچھی نظر سے دیکھا جارہا ہے، اس ماہنامہ کی برکت سے مجھے کچھ لکھنے کا موقع ملتا رہا، کبھی حالاتِ پیش آمدہ پر، کبھی مواقع ومواسم کی مناسبت سے، کبھی کسی مسئلہ شرعی پر روشنی ڈالنے کیلئے اس عرصہ

میں اس عاجز نے جو کچھ لکھا ہے زیر نظر کتاب انہی متفرق ومتنوع مضامین کا مجموعہ ہے۔

کتاب کا نام مرشدی ومربی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پرنامبٹی مدظلہ العالی کے اسم گرامی سے تبرک حاصل کرتے ہوئے "فیض سعید" رکھا ہوں، حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس عاجز پر مرشدِ اول محی السنۃ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بے انتہا احسانات اور خصوصی توجہات ہیں، اسی کی برکت سے یہ بندۂ عاجز وعاصی مسلمانوں کی نظر میں کسی عزت کا مستحق ہوسکا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر صحت اور سلامتی میں بے انتہا برکت نصیب فرمائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کے بندوں کی دینی وفکری راہنمائی کیلئے حسبِ حیثیت کی گئی اس سعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے، اور تمام تر کوتاہیوں کے باوجود محض اپنی قدرت سے ان مضامین کے نفع کو تام وعام فرمائے۔ آخر میں عزیزم مولوی خواجہ نصیر الدین سلمہٗ نے اس کی ترتیب میں جو صبر آزما تعاون کیا ہے اسکا میں ممنون ہوں اور ظاہری وباطنی ترقیات کی دعاؤں کے ذریعہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام

محمد عبد القوی غفرلہٗ

یکم ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ

اس کائناتِ رنگ و بو میں بنی نوعِ انسانیت کے وجود کا مقصد عیش کوشی، لذت اندوزی اور شہوت رانی نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد بندگی کی آزمائش اور وفاداری کا امتحان ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: اللہ وہ ہے جس نے موت وحیات کو پیدا کیا، تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے (سورۃ الملک:۱) دوسری جگہ فرمایا: تاکہ اللہ تعالیٰ (علمِ مشاہدہ میں) جان لے کہ تم میں سے کون ایمان لاتا ہے اور کون منافق بنتا ہے؟ (سورۃ العنکبوت:۱۱) ایک اور جگہ فرمایا گیا: تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ تم میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ (سورۃ العنکبوت:۲) حاصل یہ کہ اس دنیا میں انسانوں کو زندگی حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کی بندگی کے لیے دی گئی ہے۔

جب تخلیقِ انسانی کا منشاء عبودیت و بندگی کا امتحان قرار پایا تو مشیتِ الٰہی و حکمتِ ایزدی نے مناسب سمجھا کہ انسانوں کو دیگر حیوانات کے مقابلہ میں زیادہ عقل وشعور بخشا جائے اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اُن کی ہدایت ورہنمائی کا انتظام کیا جائے، اسی ضرورت اور مصلحت کے مدِ نظر ارسالِ رُسل اور انزالِ کتب کا ایسا عظیم الشان نظامِ ہدایت انسانوں کو عطا کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ بندگانِ خدا بہ سہولت وآسانی اپنے خالق ومالک کو پہچان سکیں اور بحسن وخوبی اُس کی بندگی کا فریضہ انجام دے سکیں، چنانچہ ایک دو نہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا میں بھیجے گئے، جن کی ابتداء سب سے پہلے

انسان ابونا حضرتِ آدم علیہ السلام سے کی گئی اور انتہاء سب سے افضل انسان سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر!

تاریخِ انبیاء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی انبیاء علیہم السلام کسی قوم کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیے گئے اور انھوں نے اپنی قوم کو توحید ورسالت اور عقیدۂ آخرت کی طرف دعوت دی تو اُن کی قوم دو حصوں میں بٹ گئی، اُن میں سے ایک حصہ اُن لوگوں کا تھا جنھوں نے انبیاء کی دعوت کو قبول کر کے اُن کی اطاعت وفرمانبرداری کا شرف حاصل کر لیا، دوسرے نے اُن کی دعوت کو جھٹلا کر مخالفت وایذارسانی پر کمر کس لی، اللہ تعالیٰ نے پہلے انھیں سوچنے سمجھنے اور پوری بصیرت کے ساتھ فیصلہ کر لینے کے لیے جب تک چاہا مہلت دی اور بہت دی، اس کے باوجود بھی جب اُن کی یہ صورتِ حال نہ بدلی، طرزِ عمل تبدیل نہ ہوا، وہ اسی طرح اپنے نبی کی خیر خواہی کا جواب بدخواہی وایذارسانی سے دیتے رہے اور اہلِ ایمان کو تنگ وبددل کرتے رہے تو پھر انبیاء علیہم السلام اور اُن کی فرمانبردار جماعت کو تو اللہ تعالیٰ نے نجات وحفاظت عطا فرمائی اور دوسرے گروہ کو اپنے عذاب وعقاب میں مبتلا فرما کر اُن کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

یہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حینِ حیات اور اُن کی موجودگی میں پیش آنے والی صورتِ حال کا ذکر تھا، اقوامِ عالم کے احوال پر غور کرنے سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ جس طرح انبیاء کی دعوت کے زمانہ میں اُن کی قوم ''مومن وکافر'' کے دو زمروں میں منقسم ہو جاتی ہے، اسی طرح اُن کے دنیا سے پردہ فرما لینے کے بعد اُن کی امت کے اہلِ ایمان بھی دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، ایک وہ جو اُن کی دعوت، محنت اور تعلیم کو اپنا مشن اور اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں، اس پر بہ صد ذوق وشوق عمل کرتے اور بہ ہزار مشقت ومحنت دوسروں تک پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اُن کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہیں، اُن کے دین اور اُن کی امت کی صلاح وفلاح اور ہدایت ونجات کے لیے ہر راحت وآرام کو قربان

کرتے اور ہر طرح کی مشقت وکلفت کو گوارہ کر لیتے ہیں، دوسرا وہ جو نخروں اور نعروں میں مگن اور محض چیخ و پکار، نام ونمود کے کاموں میں لگا رہتا ہے، یوم ولادت، یوم وفات جیسے مواقع سے چند من پسند رسوم کی تکمیل اور من گھڑت اعمال کی تعمیل ہی کو وفاداری کا تقاضہ سمجھتا ہے، اس طبقہ کو نبی کی تعلیم ودعوت سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے اور اُن کے پیغام کو اقوامِ عالم تک پہنچانے کی فکروں اور محنتوں سے قطعاً دلچسپی نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو برائے نام ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مٹتا رہتا ہے مگر انھیں اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں مٹتی رہتی ہیں پر اُنھیں اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت الحاد وارتداد کی شکار اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے دو چار رہتی ہے، انھیں محافلِ مولود اور مجالسِ فاتحہ ودرود سے بڑھ کر کوئی کام سمجھ ہی میں نہیں آتا، ان کے نزدیک شریعت کے احکام، مسائلِ حلال وحرام، اور سنت والے نظام کی اشاعت وحفاظت سے زیادہ ضروری بدعات وخرافات اور رسوم ورواج کا تحفظ ہوتا ہے، وہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ[1] جیسی پیشین گوئیوں کے مصداق ہو جاتے ہیں، اس کے نتیجہ میں اُن کے اور اہلِ حق کے درمیان تعارض وتصادم ہوتا رہتا ہے، اہل حق اور اہلِ وفا کو ہر دم نبی کے مقاصد کا تحفظ کرنے اور امت کو سنت کی صراطِ مستقیم پر جمائے رکھنے کی دن رات فکر لگی رہتی ہے، اُنھیں ایجادِ بندہ رسوم سے قطعاً دلچسپی نہیں ہوتی، اس کشمکش میں بظاہر کبھی وہ طبقہ غالب آجاتا ہے، کبھی یہ! مگر نبی کے سچے عاشقوں اور اُس کے دین کے حقیقی محافظوں کے حوصلے کسی حال میں پست نہیں ہوتے، اس لیے وہ اپنے نبی کے مشن کو لے کر مسلسل ان غافلوں سے نبرد آزما رہتے ہیں، جب ان کو حق بات سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کے لیے اہلِ حق کا طبقہ سامنے آتا ہے تو وہ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ[2] کی عملی

[1] ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب اسلام کا صرف نام رہ جائے گا اور قرآن کی صرف رسم رہ جائے گی۔ (ارشادِ نبوی)
[2] گویا کہ وہ وحشی گدھے ہوں جو جنگل کے شیر کو دیکھ کر بھاگ رہے ہوں۔ (ارشادِ خداوندی)

تصویر بن جاتے ہیں، نہ خود حق کو قبول کرتے ہیں نہ دوسروں کو آگے بڑھنے دیتے ہیں، جب یہ حالات حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو ایسے وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی جانب غضب کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، احقاق حق اور ابطال باطل کرنے والوں کو چھوڑ کر سب ہی پر اپنا عذاب نازل فرما دیتا ہے: أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾[۳]

افسوس اور صد افسوس! کہ آج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں بھی ایک بڑا طبقہ یادوں، جشنوں، جلوسوں اور نعروں کے فریب میں مبتلا اور نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق واعمال اور دعوت وتبلیغ کے فریضہ سے دور بلکہ نفور ہو گیا ہے، ربیع الاوّل کے اس مبارک مہینہ کے آغاز سے تادم تحریر امت کے نوجوانوں اور عشق ومحبت کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے جو احوال سامنے آرہے ہیں وہ ہمارے اس دعوے کی کھلی دلیل ہیں۔ والعیاذ باللہ من الزیغ بعد الھدی۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین کی صحیح فہم عطا فرمائے، اور سچا عشق رسول نصیب فرما کر اس کے تقاضوں کی تکمیل میں مصروف فرمائے، آمین۔

(اداریہ مارچ ۲۰۰۹ء)

---

[۳] جب انھوں نے ہماری تعلیمات کو بھلا دیا تو ہم نے برائی پر نکیر کرنے والوں کو تو نجات دے دی اور ظالموں کو ان کی بدعملی کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کر دیا۔ (ارشادِ خداوندی)

ہائے یہ اردو صحافت!

کتابت وصحافت مافی الضمیر کے اظہار اور حق کے احقاق واخبار کا بہترین ذریعہ اور مفید ترین وسیلہ ہے، حق تعالیٰ نے قرآن کریم کی پہلی ہی وحی میں انسان کو مَا لَمْ يَعْلَمْ کی تعلیم ''قلم'' کے ذریعہ دئے جانے کی نسبت اپنی ذاتِ عالی کی طرف کرکے اور پھر دوسری جگہ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ کی قسم کھا کر کتابت وصحافت کی عظمتوں کو اوجِ کمال تک پہونچادیا اور انسانی سماج میں اس کی بنیادی اہمیت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے، جس کے بعد اس سلسلہ میں مزید کسی کی تائید وتقویت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی؛ یہ تو نفسِ فضیلت کی بات تھی، جہاں تک اس کے استعمال کے لیے اسلامی آداب واحکام کی بات ہے تو اس میں کوئی شک یا دورائیں نہیں ہوسکتیں کہ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو اسلامی احکام و آداب کے دائرۂ حدود وقیود سے باہر ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمان بہ حیثیتِ مسلمان کسی میدان میں اور کسی کام میں کلّیۃً خود مختار وآزاد نہیں ہوسکتا، چنانچہ صحافت کے سلسلہ میں بھی وہ اپنی فکر وعقل کی اتباع یا دیگر اقوام کی نقالی میں آزاد نہیں ہے بلکہ اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ احکام وآدابِ اسلامی کا اپنے آپ کو پابند رکھے۔

اسلام نے صحافت واخبار سے متعلق جو احکام دئے ہیں اور جن آداب واقدار کا اپنے متبعین کو پابند کیا ہے وہ ایک مستقل ومفصل موضوع ہے، جو قرآن کریم اور احادیثِ شریفہ میں ضمناً بھی مذکور ہیں اور مستقلاً بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں

واقعات کو بعینہٖ نقل کرنے اور حذف واضافہ سے بچنے کی ہدایت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ، اے نبی ﷺ! آپ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ ان لوگوں کو ٹھیک ٹھیک سنا دیجئے۔ (سورۃ المائدۃ:۲۷) غیر معتبر لوگوں سے پہونچنے والی اطلاعات پر اعتماد نہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا، اگر غیر معتبر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو۔ (سورۃ الحجرات:٦) نامناسب اور نقصان دہ خبروں کی اشاعت سے گریز کرنے کا حکم دیتے ہوئے تنبیہ فرمائی: إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کے معاشرہ میں بُری باتیں عام ہوتی رہیں اُن کے لیے دنیا وآخرت میں عذابِ الیم ہے۔ (سورۃ النور:۱۹) اور لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ، اللہ تعالیٰ بُری باتوں کے اعلان کو پسند نہیں فرماتا، سوائے مظلوم کے۔ (سورۃ النساء:۱۴۸)

قرآن کریم کی طرح نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی تعلیمات میں ان آداب کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا: من ستر عورۃ فکأنما احیا موءودۃ فی قبرھا، جس شخص نے کسی کے عیب کو چھپالیا تو گویا اس نے ایک زندہ درگور کی جانے والی لڑکی کو بچالیا۔ (شعب الایمان) اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا: جس نے کسی مسلمان بھائی کی پردہ دری کی یعنی اس کے عیوب افشاء کرکے بے آبرو کیا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیوب کو مخلوق پر اس طرح ظاہر کریں گے کہ وہ اپنے گھر کے اندر بھی عزت کے ساتھ نہیں رہ پائے گا۔ (ابن ماجہ:۲۵۴٦) تقریر وتحریر کے ممکنہ مضرات سے بچنے کا انتہائی حکیمانہ نسخہ عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ، آدمی کے ایمان واسلام کی تکمیل وتزئین لایعنی کے ترک پر موقوف ہے۔ (ترمذی:۲۳۱۸) مؤمن کی امتیازی شان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا

الفاحش و لا البذی ،مسلمان طعنہ دینے والا ،لعنت کرنے والا ،بدکلام اور بدخو نہیں ہوتا۔(سنن ترمذی:۱۹۷۷)ان کے علاوہ بے شمار آیات واحادیث ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس وقت مقصود نہیں ہے،بطورِ اشارہ ومثال کے ان میں سے چندایک کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

ان احکام وآداب کے برخلاف آج کل مسلم صحافت کی جو صورتحال عموماً پورے ملک میں خصوصاً ہماری ریاست میں پائی جارہی ہے وہ انتہائی تکلیف دہ اور افسوسناک ہے،ایک دوسرے کی بے آبروئی روز روز کا مشغلہ بن گیا ہے،باہمی مخاصمتوں کو ملی ہمدردیوں کے عنوان سے جوڑ کر دشنام وانتقام کی بدترین مثال قائم کی جارہی ہے،ایک دوسرے کی خانگی زندگیوں میں سے تک نکال کر ایسی ایسی باتیں منظر عام پر لائی جارہی ہیں جن سے ایک طرف ملت غیروں کی نظر میں خوار ہورہی ہے تو دوسری جانب خدمت گذارانِ قوم کی شبیہ بگڑ کر عوام الناس کی نظر میں ان کا اعتماد مجروح ہوتا جارہا ہے؛ تیسری جانب لوگوں میں غیبتوں، بہتان طرازیوں اور تبصروں کا بازار گرم ہوتا جارہا ہے،اس سے بھی بڑھ کر شرمناک بات یہ ہے کہ بعض دینی واسلامی جماعتوں کے اختلافات کے نتیجہ میں بسااوقات مذہبی جرائد ومجلّات میں بھی ایسے تبصرے وتذکرے دیکھنے میں آرہے ہیں جو اہلِ علم واصحابِ دین کے قلم سے ہونے کے باوجود اِسی عامیانہ سطحِ جہالت پر گرے ہوئے ہیں۔فیاللاسف

مختصر یہ کہ صحافت بالخصوص اسلامی صحافت انتہائی ذمہ دارانہ کام ہے،اس کے لیے بہت ہی صبر وضبط،حلم وتدبر اور قوم کے ساتھ نصح وخیر خواہی کی ضرورت ہے؛اور ظاہر ہے کہ اس کی پاسداری متعلقہ آداب واحکام سے اچھی طرح واقفیت اور بھرپور رعایت کے بغیر ممکن نہیں !اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے کرم سے ہمیں ہر میدان کار میں سداد وصواب پر قائم اور افراط وتفریط سے محفوظ رکھے۔آمین

(اداریہ اپریل ۲۰۰۹)

جب چڑیا چگ گئی کھیت

دینِ اسلام ایک مکمل دین ہے جو عقیدہ وعمل کا جامع ہے، اس کی اساس اور بنیاد اصلاً کتاب وسنت اور اجماعِ امت پر ہے اور ضرورۃً قیاس سے مدد لی جاتی ہے، اسی وجہ سے جمہورِ امت کے ہاں ''اصول الاسلام اربعة'' کہا اور مانا جاتا ہے، جو لوگ قیاس و اجماع کے اصول میں ہونے کے منکر ہیں وہ بھی انکار کے باوجود اُن سے عملاً مستغنی نہیں ہیں، اس لیے یہ بات طے ہے کہ اسلام کے ــــ خواہی نہ خواہی ــــ یہی چار اصول ہیں، اور سب کے ہاں معمول بہا ہیں۔

یہ بات بھی طے ہے کہ اسلام کا بڑا حصہ وہ ہے جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ سب کے ہاں متفق العمل ہے، صرف چند مسائل ایسے ہیں جو بعض مسلّمہ مشکلات کی وجہ سے تنقیح طلب ہوتے ہیں، انہی چند مسائل میں محققین ومجتہدین کی رائے تمام تر خلوص وللّٰہیت اور حتی المقدور سعی وکوشش کے باوجود بھی یکساں نہیں ہوتی، بلکہ اپنے اپنے طریقۂ تحقیق اور اصولِ اجتہاد کی روشنی میں مختلف ہوجاتی ہے۔ جب کہ ایسا ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ یہ اختلاف صحابہ کرامؓ میں بھی تھا، تابعین عظام میں بھی تھا، ائمہ مجتہدین میں بھی تھا، ائمہ محدثین میں بھی تھا، اور صدرِ اوّل سے تھا آج تک ہے قیامت تک رہے گا، کسی زمانہ میں علماءِ اسلام کو یہ خیال نہ ہوا کہ ایسا کیوں ہوا؟ یا ایسا ہونا تقاضۂ دین کے منافی ہے، یا اس سے امت کو کوئی عملی مشکل پیش آرہی ہے یا یہ کہ اس کو ختم کرکے کسی ایک رائے یا کسی ایک کی رائے پر انحصار کرلینا چاہیے وغیرہ، کبھی کسی عالم دین کو دین میں اس اختلاف

کے پائے جانے پر کسی قسم کی کھٹک نہیں ہوئی، بلکہ اس کے برخلاف ہر زمانہ کے علماء وائمہ کے نزدیک یہ اختلاف تقدیر الٰہی میں طے شدہ اور امت کے حق میں مختلف پہلوؤں سے باعثِ سہولت ورحمت ہے۔

البتہ ایک مختصر طبقہ اہلِ اسلام میں اُن لوگوں کا بھی رہا جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تمام مسائل میں صرف کتاب وسنت پر بغیر کسی قیاس واجتہاد کے عمل کرتے ہیں، صرفِ نظر اس بات کے کہ یہ دعویٰ عملاً کس حد تک حق بجانب ہے، خود اس طبقہ کے علماء کے نزدیک بھی قیاس واجتہاد کی راہ سے احکام کی تحقیق وتعیین کرنے والے اسلام ہی کے پانے والے اور سنت ہی کو تلاش کرنے والے سمجھے جاتے رہے، فکر کے اختلاف اور اپنے موقف پر شدت سے اصرار کے باوجود مسلمانوں کو مسلمان ہی مانتے تھے، فروعی اختلاف کو عبوری اتحاد کے بکھرنے کا سبب بننے نہیں دیتے تھے، لیکن دھیرے دھیرے اس طبقہ کی شدت نے ناحق ظلم وزیادتی کی راہ اختیار کرلی، اور یہ طبقہ صرف اپنے کو حق کا پانے والا اور باقی سب مسلمانوں کو باطل پر مصر اور گمراہی پر قائم رہنے والا قرار دینے کے خبط میں مبتلا ہو گیا۔ جمہور علماء ان کی اس جہالت کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کو اعتدال کے متوارث راستہ کی طرف دعوت دیتے رہے، لیکن جب سے اس طبقہ ــــ غیر مقلدین ــــ کو مملکتِ سعودیہ عربیہ میں قدم جمانے اور وہاں کے غیر محقق اور سطحی علم رکھنے والے حنبلی علماء کے ساتھ گٹھ جوڑ کرلینے کا موقع مل گیا اسی وقت سے اس مسلک کے بدنیت اور متعصب گروہ نے ان غیر محقق سعودی علماء کے ذریعہ مملکت کے دینی ودعوتی اداروں کے سربراہوں کو غلط فہمی اور دھوکہ دہی میں مبتلا کرکے امت کے سوادِ اعظم سے بدگمان بلکہ نفور کردیا، پھر اس بدگمانی اور دوری کا استحصال کرتے ہوئے فقہی مسائل اور اجتہادی اختلافات کو حق وباطل، ہدایت وگمراہی اور توحید وشرک کے خانوں میں بانٹ دیا، نیز مملکت سے مالی اعانتوں اور میڈیا کی سہولتوں کو حاصل کرکے پورے عالم میں انتشار بین المسلمین کی مکروہ ومذموم کوششوں میں مشغول ومصروف ہوگیا۔

ان کے اس غیر ذمہ دارانہ، جانبدارانہ اور متعصّبانہ طرزِ عمل سے امت کو پورے عالم میں ـــــ بالخصوص موجودہ نازک ترین صورتحال میں ـــــ جونقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے ان سے اصحابِ علم وخبر بے خبر نہیں ہیں، ان نقصانات کی المناک تصویر کشی اس وقت ہمارے مدِ نظر نہیں ہے، بتلانا صرف یہ ہے کہ کافی اور ناقابلِ تلافی نقصان ہوجانے اور پورے کھیت کے چُک جانے کے بعد ـــــ ممکن ہے محقق علماء کی فکرمندی وتوجہ دہانی کی وجہ سے ـــــ مملکتِ سعودی عرب کو اپنے ملک میں گذشتہ دودہوں سے جاری یہ ظلم و ناانصافی نظر آئی، اورانہوں نے تلافیِ مافات ـــــ دینی یا سیاسی ـــــ کی خاطر مملکت کے صیغۂ امورِ مذہبی کو چوکنا کیا، جس کے نتیجہ میں اس مسلکی تشدد کو رفع کرنے کے لیے کچھ دانشمندانہ اقدامات کئے جانے کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سعودی اخبارات کی وہ سرخیاں بھی ہیں جو گذشتہ سال شعبان سے جاریہ سال صفر تک وقفہ وقفہ سے شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً:

(۱) ''سعودی عربیہ کی وزارتِ امورِ مذہبی نے اپنے ماتحت اداروں پر پابندی عائد کردی ہے کہ وہ ایسی کتابوں کی اشاعت سے گریز کریں جن میں کسی اسلامی فرقے یا جماعت یا تنظیم کی تردید شامل ہو''۔ (روزنامہ عکاظ)

(۲) ''سعودی فرمانروا خادم الحرمین الشریفین شاہ عبداللہ نے .... سعودی عرب کے سربرآوردہ علماء بورڈ میں حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی مکاتبِ فکر کو نمائندگی دے کر قابلِ استحسان اقدام کیا ہے''۔ (اردو نیوز)

(۳) ''سعودی علماء بورڈ میں مذاہبِ اربعہ کی نمائندگی تاریخی فیصلہ ہے، سنی مذاہب کی شراکت فقہی اجتہادات کو وسیع البنیاد اور مؤثر بنانے کی جہت میں کامیاب اقدام اور اسلامی شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہے''۔ (عالم عرب)

(۴) ''سعودی علماء بورڈ میں حنفی عالم شیخ یعقوب کی اور مالکی عالم شیخ محمد الشنقیطی کی

تقرری'' (عالم عرب)

(۵) ''مسلکی تشدد ناجائز ہے، ائمہ مسالک راسخین فی العلم تھے''۔ (الریاض)

ان عنوانات کے تحت کچھ تفصیلات بھی ہیں، ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر ان بیانات کا اصل مقصد مملکت کے تئیں پیدا ہونے والے مخالف رجحانات کو نرم کرنا ہے، نہ کہ مسلکی تعصب وظلم کو ختم کرنا، اب ہوسکتا ہے کہ ان بیانات کے ذریعہ علماء نے تو اسی انکارِ مسالک ومذاہب کے بڑھتے ہوئے اثرات پر قابو پانا چاہا ہو مگر رپورٹرز نے اس میں اس طرح کی رنگ آمیزی کی ہے کہ وہ مملکت کے دینی شعبوں اور کارندوں پر بہت زیادہ اثر انداز نہ ہوسکے۔ ذیل میں ایک بڑے عالم وصاحبِ افتاء بزرگ کے مطبوعہ بیان کو مکمل نقل کرکے اس کھٹک کی معقولیت واضح کی جارہی ہے۔

''شیخ علامہ عبداللہ بن جبرین نے اپنے ایک محاضرے بہ عنوان ''دین اور زندگی'' کے دوران فرمایا کہ: ''لا مذہبیت ــــ غیر مقلدیت ــــ یا مسلک سے دوری کی دعوت دینا درحقیقت ایک بدعت ہے، کیونکہ یہ چیز سابقہ زمانوں میں نہیں تھی اور یہ بھی کہا کہ ان مسالک کے ائمہ امت کے قابل علماء ہیں یعنی ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ایمان، علم اور تفقہ فی الدین میں (ہم لوگوں پر) سبقت حاصل تھی، تاہم وہ معصوم نہیں ہیں، اس لیے مخالف دلیل حکم دینے کی صورت میں (وہ خائن نہیں معذور ہیں اور) ان کا عذر دلیل تک ان کی رسائی کا نہ ہونا ہے۔ نیز فرمایا کہ ان علماء میں ہر ایک اس بات کا معترف تھا کہ اس نے تمام علوم کا احاطہ نہیں کیا، چنانچہ ان سے کبھی کبھی غلطی بھی واقع ہوجاتی ہے، اسی بناء پر ہم ائمہ کے پیروکاروں سے کہتے ہیں کہ جب تمہارے سامنے کوئی دلیل واضح ہوجائے تو تم پر ضروری ہے کہ تم اس کے قائل ہوجاؤ اور تم اپنے امام کا مذہب چھوڑ دو، اس وجہ سے کہ حق اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے۔ جس کی وجہ سے اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اپنانا صحیح نہیں ہے اور وہ لوگ امام ابوحنیفہ، امام

مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، سفیان ثوری اور لیث بن سعد رحمہم اللہ کے متبعین پر نکیر کرتے ہیں ہم ان سے کہتے ہیں کہ تم ان ائمہ کے متبعین پر نکیر مت کرو، کیونکہ یہ لوگ ان مذاہب کی جانب اجتہاد اور صحیح حدیثوں کے ثبوت کے بعد گئے ہیں، ہاں! تم ایسے شخص کو نصیحت ضرور کرو جو غلطی پر مصر ہے اور اپنے مذہب کو ہی اختیار کئے ہوئے ہیں، ہرگز یہ نہ ہو کہ تم ان کے ائمہ پر لعن طعن کرنے لگو، کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کے فتاویٰ کئی مؤلفات میں جمع کیے گئے ہیں، جبکہ ان کو امام ابو یوسفؒ اور محمد بن الحسنؒ نے ترتیب دیا ہے، ان کا غالب اعتماد نظر و تحقیق پر ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ صاحبِ فکر و ذکاء اور سریع الفہم تھے، اور امام صاحب اہلِ کوفہ کی اس فقہ پر بھروسہ کرتے تھے جو ابنِ مسعودؓ کے شاگردوں اور اس زمانہ کے دیگر علماء سے منقول ہوتی، جب ان کے متبعین سے غلطی ہو تو ان کے امام پر تنقید کرنا جائز نہیں بلکہ ہر ایسے شخص کو نصیحت کریں کہ جس کے پاس دلیل ہو وہ دلیل پر عمل کرے، نہ مذہب کے ساتھ تعصب برتے اور نہ مذہب کی وجہ سے کسی دلیل کا انکار کرے۔ اور امام مالکؒ کے متبعین نے ان کی کتاب ''مؤطا'' پر اعتماد کیا جو کتبِ حدیث میں بہت معتبر سمجھی جاتی ہے اور فوائد کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے، یہ اور بات ہے کہ اس میں بہت سے علوم ذکر سے رہ گئے ہیں، اور اسی وجہ سے منصور عباسی نے ''مؤطا'' پر عمل کو لوگوں پر لازم کر دینے کی اجازت چاہی تو امام مالکؒ نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور وجہ یہ بیان کی کہ صحابہؓ میں بھی مسائل کا اختلاف تھا، حالانکہ ان کے پاس وہ علوم تھے جو ہم تک نہیں پہونچے، (اس لیے ان علمی اختلافات کو باقی رہنے دیا جائے، ایک کتاب کا پابند کر کے ختم نہ کیا جائے) پھر ان کے تلامذہ میں سے ایک عالم نے بہت سے سوالات کو جو ان کے مذہب سے متعلق تھے ایک بڑی کتاب میں جمع کر دیا جس کا نام ''مدوّنہ'' ہے، اس کتاب پر ان کے متبعین نے اعتماد کیا اور ہم ان سے بھی یہی کہتے ہیں کہ جب تمہارے سامنے کوئی ایسی دلیل آ جائے جو تمہارے مذہب کے خلاف ہو تو اس کی اتباع کر لو۔ رہ گئے امام شافعیؒ تو انہوں نے احکامِ فقہ کو اپنی

کتاب ''الام'' اوراس کے علاوہ بہت سے رسائل میں تحریر کیا ہے، جو ان کے متبعین کی معتمد علیہ کتاب ہے، باوجود اس کے انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کا مذہب ''حدیث'' ہے، آپ فرماتے تھے کہ صحیح حدیث میرا مذہب ہے۔ جہاں تک امام احمد بن حنبلؒ کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنے مسائل کو لکھنے سے منع فرمایا، خود بھی فقہ میں کوئی کتاب نہیں لکھی اور اس بات کو زیادہ پسند کیا کہ لوگ مسائلِ دین میں کتبِ حدیث سے مراجعت کریں، لیکن ان کے تلامذہ نے بہت سے ایسے مسائل کو جمع کیا ہے جو آپ کے سامنے پیش آئے اور آپ نے ان کا جواب دیا تھا، ان مسائل کا مجموعہ بیس جلدوں پر محیط ہے، ان کے مذہب کے متبعین انہی مسائل کا اتباع کرتے ہیں۔

اخیر میں شیخ ابن جبرین نے اپنی تقریر کو اس بات پر ختم کیا کہ مذاہب (فقہ) میں تشدد جائز نہیں ہے، کیونکہ ان مذاہب کے ائمہ راسخ فی العلم ہیں اور ان کو غلط قرار دینا صحیح نہیں ہے جب کہ ان پر تنقید و اعتراض کرنے والے ان ائمہ کرام کے مقابلہ میں ایک فیصد علم بھی نہیں رکھتے، اور فقہاء اپنے مذہب میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ عمل کی منتخب و مختار صورتیں جمع کردیں، دلیلِ صریح نہ ہونے کی صورت میں دو یا تین امکانی صورتیں بھی نقل کردیتے ہیں، اس کی وجہ ان کے اجتہاد کی قوت اور نظر کی پختگی ہوتی ہے، اور ہر مجتہد اپنے اجتہاد کے ثمرہ کا مستحق ہے۔ (۱۸ر ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ۔ عکاظ)

اس مضمون میں ـــــ ان کے اخلاص وللٰہیت اور نیک نیتی پر کوئی شبہ کئے بغیر صرف طرزِ عمل اور بنے ہوئے ذہن کو سمجھنے کی خاطر ـــــ توجہ دلانا ہے کہ موصوف بار بار اس کا اعادہ کررہے ہیں کہ ''ہم متبعینِ مسالک سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دلیل کا اتباع کریں'' اسی طرح وہ اصلاحی جدوجہد کرنے والے اداروں سے بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ ''متبعینِ مسالک کو دلیل کے اتباع کی تلقین کریں، مسلک و مذہب پر اصرار کرنے سے منع کریں'' سوال یہ ہے کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک متبعین مسلک علماء کو کیا یہ بات نہیں معلوم کہ دلائل کا

اتباع کرنا چاہیے اور مسلک کو اصل نہیں سمجھنا چاہیے؟ اور کیا ان کے علاوہ دوسرے مسالک کے علماءِ کرام نے بھی اپنے اپنے مسلکوں میں حق کو پانے اور اس پر قائم رہنے کے لیے جس کسی مسئلہ میں اپنے ائمہ کی تحقیق واستدلال میں ضعف کو پایا تو اس کو دلیل صحیح یا راجح کے مطابق کر کے اس پر فتویٰ نہیں دیا ہے؟ تحقیق اور دلیل کا کام تو صدیوں پہلے ہو چکا، اب صرف اتباع کا کام باقی ہے، آپ اپنی دلیل کے مطابق عمل کیجئے، دوسرا اپنی دلیل کے مطابق عمل کرے گا، سب کو آپ ہی تلقین کرنے اور تدین سکھانے والے کون؟ اگر آپ یہ بات اس وجہ سے کہتے ہیں کہ آپ کے نزدیک آپ کے امام کی تحقیق ہی دلیل صحیح ہوسکتی ہے تو اسی اعتماد وثوق کی بنیاد پر ہم بھی آپ کو یہی تلقین کریں گے کہ آپ بھی ہماری فہم کے مطابق دلیل کا اتباع کیجئے، اس صورت میں پھر بات تو وہی تشدد علی المسلک ـــــــ الثورة علی المذهبية ـــــــ ہی کی رہ جائے گی جس کو آپ بدعت اور ناجائز قرار دے چکے ہیں۔ شیخ موصوف کا کہنا ہے کہ ''تمہیں دلیل مل جائے تو تم اپنے امام کا مذہب چھوڑ دو''۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ایسا صدیوں پہلے کر چکے ہیں، تمام مسائل کے دلائل پر ان لوگوں نے جنہیں خود آپ راسخ فی العلم فرما رہے ہیں غور کر لیا ہے اور جہاں جہاں رجوع کی ضرورت تھی وہ رجوع کر چکے ہیں، اب صرف اجتہادی نتائج کا اختلاف ہی باقی ہے، جس پر تشدد نہ کرنے اور ہر ایک کو اس کے متبوع امام کی تحقیق پر عمل کرنے کا حق دلانے کے لیے آپ نے یہ مقالہ لکھا ہے تو اس اصرار کا حاصل اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ ہم جس کو دلیل کہیں اسی کو دلیل مانو، اور اس وقت سارا فساد وخلاف اسی ناروا مطالبے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

ائمہ کرام کی جلالتِ علمی اور ان کے محیر العقول فقہی کارناموں کو سراہنے کے انداز میں بھی اس جھول یا ذہول کو ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے امام اعظمؒ کی فقہ کی خصوصیت ''وغالب اعتماده علی الرأی والنظر'' کہہ کر ان کے دلائل کے سلسلہ میں نقلی کے بجائے محض عقلی ہونے کی طرف اشارہ کیا جو سراسر ظلم ہے۔ اگرچہ آگے کمزور انداز میں ابنِ مسعودؓ کی

مرویات پر ان کے اعتماد کا اشارہ دیا ہے۔ برخلاف اس کے جب امام احمدؒ کا ذکر کیا تو یہ کہا کہ انہوں نے کوئی فقہ مرتب نہیں کی بلکہ انہوں نے چاہا کہ عوام الناس کتاب وسنت ہی سے قریب اور ان ہی سے مستفید ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے تلامذہ نے بعد میں کسی وقت ان سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات کو باقاعدہ جمع کر دیا جب کہ وہ فقہی واجتہادی جوابات اتنے زیادہ ہو گئے کہ بیس مجلدات میں سما سکے۔ آپ غور کریں گے تو یہی صورت امام اعظمؒ کے ہاں بھی ہوئی کہ انہوں نے تو صرف کتاب وسنت سے استدلال کر کے مسائل کی تعیین کا کام کیا تھا اور پیش آمدہ وپیش آئندہ مسائل کا حل فرمادیا تھا، بعد میں ان کے تلامذہ نے ان مسائل کو مدوّن کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انہوں نے کتابتِ فقہ سے خود اپنے کو بچایا اور دوسروں کو روکا اور یہ چاہا کہ لوگ براہِ راست کتاب وسنت سے مستفید ہو جائیں تو ان کے متبعین نے کیوں ان کی فقہ مرتب کی؟ اور کیوں سعودی دارالافتاء اس کے مطابق فتویٰ دیتا ہے؟ اور کیوں ہزاروں مسائل اور فتاویٰ میں قرآن وحدیث کے ساتھ قال علمائنا سے تقویت حاصل کی جاتی ہے؟ اگر یہ ان کے ہاں خلافِ دلیل اور خلافِ کتاب وسنت نہیں تو پھر احناف وشوافع کے لیے ہی یہ نصیحت وموعظت اور بار بار کی تاکید کیوں؟ کیا سعودی علماء کے اس انداز میں اسی عامیانہ الزام کی جھلک نظر نہیں آتی کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین شرعی دلیل کے بجائے اندھی تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں، صرف سلفیہ اور حنابلہ کتاب وسنت کے اتباع کا اہتمام کرتے ہیں؟

ان سب اشکالات وشکایات کے باوجود ہم مملکتِ سعودی عرب اور اس کے صیغۂ امور مذہبی کی تعریف وتحسین کو ضروری سمجھتے ہیں کہ بہت دیر اور ناقابل تلافی نقصان کے بعد ہی سہی مسلکی تشدد کے ظلم کے خلاف انہوں نے آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس کی اور یہ تو بہت بڑا کارنامہ کر دیا کہ سعودی علماء بورڈ میں حنفی عالم کا بھی تقرر کر دیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور مزید وسعتِ فکر اور ہمتِ اصلاحات سے سرفراز فرمائے آمین۔

ہمارے نزدیک ان اعلانات اور فیصلوں کا حقیقی وعملی نفع اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ

مملکت اور اس کے بااثر عہدہ دار عملی طور پر بھی جالیات کے سابقہ طرزِ عمل کو تبدیل کرنے کی طرف پیش قدمی کریں۔ بالخصوص

(۱) جالیات کے ذریعہ تقسیم ہونے والی کتب میں مذاہبِ معتبرہ کی رعایت کی جائے۔ مثلاً حج کے مسائل میں دسویں تاریخ کے اعمال میں فقہِ حنفی میں ترتیب کے واجب ہونے کا اظہار اور احناف کو اس کے لحاظ کی تلقین کو شامل کیا جائے، وغیرہ۔

(۲) تبلیغ کے شعبوں میں سلفیہ اور حنابلہ کی طرح دیگر مسالک کو بھی نمائندگی دی جائے، اور بیرونی ملکوں میں بھیجی جانے والی اعانتوں میں مسلکی تفریق بند کی جائے۔

(۳) سعودی جامعات میں مذاہبِ اربعہ کو کام کرنے کے لیے یکساں مراعات دی جائیں۔

(۴) غیر قانونی طور پر مذہبی تشدد کرنے اور خارجی باشندگان کی کم علمی کا فائدہ اٹھا کر انہیں کسی مخصوص مسلک سے متنفر کرنے اور کسی مخصوص مسلک ہی کے برحق ہونے کا پرچار کرنے والوں کا مواخذہ کیا جائے اور اس کے لیے متاثرین کی شکایات سننے کا بند دروازہ کھول دیا جائے۔

(۵) حرمین شریفین میں حنفی عالم کو بھی درس وتدریس کا موقع دیا جائے۔

(۶) تعلیق وتحقیق کے نام پر مملکت سے چھپنے والی تمام قدیم وجدید کتابوں پر شیخ البانیؒ کی تصحیح وتضعیف کو مسلط کرنے کی بدعت کو ختم کر کے محدثین کرام کے اعتماد اور سابقہ طریقۂ تحقیق کو بحال کیا جائے وغیرہ۔

اور اگر ان اعلانات کے بعد عملی اقدامات نہیں کیے گئے اور ایک مخصوص اور متعصب طبقے کے تسلط کو عملاً کمزور نہ کیا گیا تو یہ فیصلے اور اعلانات وہ نتائج نہیں دے سکتے جن کا ارادہ کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

وفق اللہ ولاۃ المسلمین وایانا لما یحبہ ویرضاہ۔ وصلی اللہ علی النبی الکریم

(اداریہ جون ۲۰۰۹ء)

عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھایئے!

ملک میں بڑے پیمانے پر ''چٹ فنڈ'' کے ادارے قائم کر کے کاروباریوں اور سرمایہ داروں کو لوٹنے کا سلسلہ تو عرصہ سے قائم ہے، آئے دن ان کمپنیوں کے ''دیوالیہ'' ہوجانے کا اعلان کر کے ممبرانِ کاروبار کو تباہ و برباد کیا جاتا رہتا ہے، لیکن چھوٹے موٹے انداز سے بستیوں اور بازاروں میں جو چٹھیاں چلائی جاتی ہیں ان کا سلسلہ بھی دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے، یہ چٹھیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ مثلاً دس آدمی مل کر ہر ماہ سو سو روپئے کسی ساتھی کے پاس جمع کرنے کا عہد کر لیتے ہیں اور اتفاقِ رائے سے یا پھر قرعہ اندازی کے ذریعہ باری باری ایک ایک ہزار روپئے لے لیتے ہیں، اس صورت میں ہر ایک کی رقم اس کو مکمل واپس ہوجاتی ہے، اس کا فائدہ بس یہ ہے کہ یکبارگی معتد بہ رقم مل جانے سے اپنے کاموں اور ضرورتوں میں سہولت حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ صورت امدادِ باہمی اور اخوتِ اسلامی کے حوالہ سے کارِ خیر ہی ہے، البتہ جن لوگوں نے پیشگی رقم اٹھالی ہے وہ دوسروں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر ہر ماہ رقم ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے اور پریشان کرنے سے بچیں، کیونکہ اس میں ظلم، دھوکہ اور وعدہ خلافی جیسے گناہوں کا وبال ہے۔

(۲) دوسری صورت جو عام طور سے مارکٹوں اور فینانسروں میں رائج ہے، وہ غالباً ''ہراج کی چٹھی'' کہلاتی ہے، اس میں یہ ہوتا ہے کہ جس کو رقم کی فوری ضرورت ہے وہ اپنی چٹھی ہراج کرتا ہے، لوگ اس کی قیمت حق سے گھٹا کر لگاتے ہیں، وہ شخص اپنی مجبوری اور جلدی کی وجہ سے جتنی بھی رقم مل جائے لینے کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور فینانسر اس بچی ہوئی

رقم میں سے اپنا کمیشن نکال کر مابا قی رقم کو بقیہ ممبروں میں تقسیم کر دیتا ہے، اس طرح جو جتنی جلدی اپنی چٹھی اٹھاتا ہے اتنا ہی زیادہ اپنے مال سے محروم ہوتا ہے اور جو جس قدر دیر سے لیتا ہے اتنا ہی دوسرے کے مال سے ناحق اضافہ لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دوسری صورت سراسر سود، قمار اور حرام ہونے کے علاوہ انسانیت سوزی اور ظلم وزیادتی پر مبنی ہے، انسانیت ایک دوسرے کی مدد کرنے اور وقت پر کام آنے کا نام ہے، خودغرضی اور حق تلفی انسانیت نہیں حیوانیت اور جانور پن ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اسلامی سرمایہ کاری انسانیت نوازی کی بہترین مثال ہے، کسی کے مال کو نقصان پہونچائے بغیر ایک دوسرے کو نفع پہونچانے اور ضرورت پر کام آنے میں مدد دینا بڑے اجرو ثواب کی بات ہے، جو چٹھی کی پہلی صورت میں واضح ہے، اور اسلام کے تجارتی ومالیاتی احکام اس حقیقت کا ثبوت ہیں۔ اسلام کے برخلاف یہودی ساہوکاری کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ خودغرضی وحق تلفی پر مبنی ہوتی ہے، اس کی بنیاد ہر ایک کو محروم کر کے اپنی جھولی بھرنے پر قائم ہوتی ہے، اسی کی بدترین مثال چٹھی کے مروّجہ کاروبار اور ہمارے علاقوں میں رائج رہن سنٹرز اور ان میں ہونے والے مالی معاملات ہیں، جو سو فیصدی سودی اور جواری معاملات ہیں اور آج کل بہت زوروں پر ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ آج کل متوسط سے نیچے طبقے کے مسلمان گلی گلی قائم رہن سنٹرز میں جا کر اپنا زیور، ساز وسامان، بہو کا جہیز وغیرہ تو چند سو روپیہ قرض کے عوض رہن رکھا ہی رہے ہیں، قرض ادا کر کے انہیں چھڑانے کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی گروی ہوتے جارہے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ غریب مسلمانوں کی اکثریت کا مال اور ان کی آمدنیاں اپنی دوکانوں سے بھی بڑا منہ کھول کر بیٹھے ہوئے ظالم مارواڑیوں کے پیٹ میں روزانہ لاکھوں کے حساب سے جارہی ہیں۔

ادھر بیوپاریوں اور کاروباریوں کا حال یہ ہے کہ وہ موجودہ کاروبار اور اس کی بقدر

ضرورت آمدنی پر قناعت نہ کر کے تانا شاہی منصوبوں کی خاطر سودی قرض یا قماری چیٹ کے دھندوں میں پھنس کر اپنی تھوڑی سی کمائی سے بجائے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے فینانسروں کی دوزخ بھر رہے ہیں۔ پھر اگر سود در سود کی ادائیگی سے عاجز ہو جارہے ہیں تو چیخنے چلانے اور قرضے دینے والے خونخوار درندوں کے ظلم و بربریت کا شکار ہورہے ہیں، ان کے مار کھا رہے ہیں، گالی گلوج سن رہے ہیں، ذلیل ہو رہے ہیں، حتی کہ ان کے ظلم سے بچنے کے لئے اپنی بہو بیٹیوں کا منہ کالا کرنے کا انہیں موقعہ دے رہے ہیں، یا خودکشی کر کے دنیا و آخرت برباد کر رہے ہیں۔

کسی بھی قوم کی اگر یہ صورتحال ہوتی تو ہو سکتی تھی، کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسا دین نہیں ہے جو اُن کی مدد کر سکے اور حرص و حماقت کے اندھیروں سے نکال کر خودداری اور قناعت کی روشنی میں پہونچا سکے، غلامی کی ذلت سے نکال کر آزادی کی عزت دلا سکے، انہیں بتلا سکے کہ آبرو بیچ کر عیش و عشرت کرنے سے بہتر عزتِ نفس کے ساتھ فقر و فاقہ کر لینا ہے۔ مگر مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ اسلام کا مبارک سایہ سروں پر ہونے اور نبی پاک ا کی ہمت افزا اور عزت رسا تعلیمات سینے میں رکھنے کے باوجود ان گندگیوں بلکہ حماقتوں میں مبتلا ہو کر دنیا و آخرت برباد کر رہے ہیں؟ ان حرکات و واقعات کا سبب صرف غربت ہی نہیں ہے کیونکہ پچھلے زمانوں میں بھی محتاج لوگ سماج میں پائے جاتے تھے، غریبوں اور ضرورتمندوں کا طبقہ معاشرہ میں شامل رہتا تھا، مگر اس قسم کی حرکتوں سے محفوظ اور عفت و استغناء سے موصوف ہوتا تھا، اس کی اصل وجہ دین اور دینی تعلیمات سے واقفیت اور والدین کی جانب سے اولاد کی اسلامی تربیت تھی، آج جہالت عام ہے، کہنے کو تو اس کو روشنی کا دور کہا جاتا ہے، کیونکہ تعلیم کو عام کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ اندھیرے کا زمانہ ہے، کیونکہ مذہب کو مٹانے اور اپنے راستہ سے ہٹانے کی جدوجہد بھی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾

''اللہ تعالیٰ نے جس کو روشنی عطا نہیں فرمائی تو اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہو سکتی''۔(سورۃ النور:) پھر محض چار ٹکے کمانے کے لائق بنانے والی یہ عصری تعلیم اخلاق و کردار کی ضمانت کیسے دے سکتی ہے؟ آج اخبارات میں جرائم و حادثات کے عنوان سے جتنے واقعات چھپ رہے ہیں —— اور ان سے کئی گنا زائد حادثات ظالموں کے اثر و رسوخ میں چھپ رہے ہیں —— کیا ان کے مرتکبین سب جاہل ہیں؟ ہرگز نہیں، غریبوں اور جاہلوں کے علاوہ اچھے خاندانوں اور بڑی بڑی ڈگریوں والے بھی ان حادثات میں شامل ہیں!، معلوم یہ ہوا کہ اصل سبب مسلمانوں کا دینی علم اور اسلامی اخلاق سے محروم ہو جانا ہے۔

مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اسلام نے انسدادِ جرائم کے لیے صرف قانون سازی کو کافی نہیں سمجھا، اس کے ساتھ بندوں کے قلوب میں خوفِ خدا اور جوابدہی کا احساس پیدا کرنے کو بھی ضروری سمجھا ہے''۔

پچھلے دنوں حیدرآباد کے اخبارات نے قرض خواہوں کے مظالم میں ہلاک ہونے والی عورتوں کی تصاویر اور واقعات شائع کئے، بیشک یہ واقعی دل دہلا دینے اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات تھے، ان کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن اس کے اسباب و وجوہ بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ماں کے ہوتے ہوئے بھی جوان کنواری لڑکی قرض خواہ کے گھر کیوں گئی؟ اس کے پھسلانے سے اس کے ساتھ تفریح کرنے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئی؟ ماں کو اس کی عزت متاثر ہونے کا کھٹکا کیوں نہیں ہوا؟ اس کا خاندان اور اس کے بڑے کہاں ہیں؟ وغیرہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب مزید جرائم اور فواحش سے پردہ اٹھاتے ہیں، بات دراصل یہی ہے کہ مسئلہ صرف غربت و فلاکت کا نہیں، اسلام سے دوری اور دینی تعلیم سے جہالت کا ہے۔ بیشک ان میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہیں ان کی معاشی تنگی اور سخت مجبوری ساہوکار کی چوکھٹ تک لے گئی ہوگی جو سماج کے اہلِ حیثیت افراد کے لئے واقعی ڈوب مرنے کی بات ہے، لیکن تجربہ یہی ہے کہ غریب و ناخواندہ

طبقہ کی اکثریت رہن سنٹرز اور لون سنٹرز پر ضرورت کی وجہ سے کم، خواہشات ولوازمات کی وجہ سے زیادہ وابستہ ہے، ایک عادت اور لت سی پڑ گئی ہے کہ ذرا کوئی بات پیش آئی اس طبقے کی عورتیں خود بھی قرض لے آتی ہیں اور دوسروں کو بھی دلاتی پھرتی ہیں، ان عورتوں سے نمازیں پڑھی جاتی ہیں نہ روزے رکھے جاتے ہیں، ہم محلہ عورتوں کی اسی لیڈر شپ میں صبح وشام کرتی پھرتی ہیں۔

اس لیے ان مصیبتوں کے خاتمے اور ان حادثات کی روک تھام کے لیے سب سے مؤثر اور اہم تدبیر سماج کے ہر طبقے بالخصوص بچھڑے ہوئے اور متوسط حیثیت سے بھی گرے ہوئے طبقہ میں دینی تعلیم اور اسلامی دعوت کی صورتیں نکالنا ہے، اگر فواحش ومنکرات اور بدکاری وحرام خوری کی وعیدیں کتاب وسنت کی روشنی میں ان تک پہونچائی جائیں گی اور ان میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کو بجالانے کی جدوجہد کی جائے گی تو انشاء اللہ فائدہ ہوگا اور ضرور ہوگا، انسانوں کے خالق ومالک کا ارشاد ہے: وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝۵۵ ''نصیحت کیجئے، کیونکہ نصیحت کرنا اہلِ ایمان کو نفع دیتا ہے۔'' (سورۃ الذاریات)

اب جہاں تک ان کی محتاجی ومفلسی کا معاملہ ہے تو یقیناً ہر باشعور مسلمان کو غرباءِ امت کے ان مسائل کی طرف توجہ دینا چاہئے، اللہ پاک نے کسی مصلحت سے بندوں کے درمیان رزق کی تقسیم میں کمی بیشی کو مناسب سمجھا: اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ "اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے روزی بڑھاتا ہے جس کیلئے چاہتا ہے گھٹاتا ہے"۔ (سورۃ الرعد: ۲۶) اور غور کرنے سے اس تفریق میں انسانوں ہی کی ہزارہا حکمتیں اور مصلحتیں سمجھ میں بھی آتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ سماج میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لئے یہ بھی انتظام فرمادیا ہے کہ جن کی روزی بڑھائی ہے ان کی روزیوں میں کم نصیبوں کا حصہ ''حق'' کے نام سے رکھ دیا ہے: وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ۝۱۹ ''اور مالداروں کے مال میں اس

کا بھی حق ہے جو ضرورت سے مجبور ہو کر سوال کرتا ہے اور اس کا بھی حق ہے جو ضرورت کو چھپا کر صبر کرتا ہے۔'' (سورۃ الذاریات)

اس طریقہ کار کا فائدہ یہ ہوا کہ انسان کے اندر مخفی انسانی صفات و خصوصیات سرگرم عمل ہو کر منصۂ شہود پر آئیں، صحابہ کرامؓ کا سماج جس کی روشن مثال ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے احوال میں آتا ہے کہ ان کے پڑوسی نے اپنے قرض کے بوجھ اور قرض خواہ کی سختی کا ذکر کر کے ان سے مدد کی خواہش ظاہر کی، انہوں نے اسی وقت ان کے گھر میں جو کچھ میسر تھا، عطا کر کے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا، پھر جب گھر میں واپس آئے تو روتے ہوئے آئے، اہلیہ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: میں اس لیے نہیں رو رہا ہوں کہ گھر کا سب کچھ اٹھا کے دے آیا بلکہ اس لیے رونا آ رہا ہے کہ ''اپنے ایک پڑوسی کی حاجت سے میں اس کے اظہار سے قبل ہی کیوں نہ واقف ہو سکا، اسے میرے سامنے سوال کر کے ذلیل ہونے کی نوبت کیوں آئی، اگر اللہ پاک مجھ سے اس کی بابت سوال کریں تو میں کیا جواب دے سکوں گا؟ یہ سوچ کر مجھے رونا آ رہا ہے''۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے، صبح کا وقت تھا، قبیلہ بنو مضر کے کچھ لوگ ملاقات کے لئے اس حال میں حاضر ہوئے کہ گلے میں تلواریں لٹکی ہوئی تھیں، پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اور چہرہ بشرہ سے فقر و فاقہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، انہیں دیکھتے ہی غایتِ شفقت و ترحم سے آپ کا دل بھر آیا اور چہرۂ مبارک متاثر و متغیر ہو گیا، آپ فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور گھر میں ـــــ کچھ لانے کے لیے یا وضو بنانے کے لیے ـــــ تشریف لے گئے، تھوڑی دیر کے بعد باہر آئے تو موذن کو اذان دینے کا حکم فرمایا ـــــ غالباً ظہر یا جمعہ کی ـــــ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے لوگوں کو خطبہ دیا، اس میں سورۂ نساء کی آیت یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ الآیۃ۔ (سورۃ النساء:۱) سورۂ حشر کی آیت: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ الآیۃ (سورۃ الحشر:۱۸) کی تلاوت فرما کر ایک دوسرے کی قرابت داری کا خیال رکھنے، صلہ رحمی کی اہمیت کو سمجھنے اور انفاق وخیرات کے ذریعہ آخرت میں ذخیرہ اندوزی کرنے کی ترغیب دی، اور حکم دیا کہ ان لوگوں کے لئے ہر شخص کچھ نہ کچھ اکٹھا کرے، دینار، درہم، کپڑے، اناج جو ہو سکے لاؤ، حتی کہ کچھ نہ ہو سکے تو کھجور کی ایک پھانک ہی سہی مگر کوئی محروم نہ رہے، لوگ گھر گئے اور جس سے جو بن پڑا لا لا کر جمع کرتے رہے، ایک شخص نے تو دیناروں سے بھری اتنی بڑی تھیلی لائی کہ اس سے سنبھل بھی نہیں پا رہی تھی، دیکھتے دیکھتے مسجدِ نبوی کے صحن میں غلے اور کپڑے کے دو ڈھیر اکٹھے ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان بدحال وفاقہ کش مسلمانوں کی مدد کے لیے کی گئی اپیل پر مسلمانوں کی اس بھائی چارگی اور اثر پذیری کا نقشہ دیکھا تو انتہائی مسرور ہوئے اور خوشی سے چہرۂ مبارک اس طرح دمکنے لگا جیسے پگھلا ہوا سونا چمکتا ہے، پھر آپ نے یہ مال ان لوگوں کے حوالہ فرمایا، اور مسلمانوں کو شاباشی دیتے ہوئے اور ہمت افزائی کرتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی کہ

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئ ومن سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئ۔ (مسلم:۲/۵۵۷)	جس نے اسلام میں کسی اچھے کام کی ابتداء کی تو اس کو اس کے اجر کے علاوہ آگے اس پر عمل کرنے والوں کے اجر سے بھی حصہ ملے گا، اگرچہ اُن کے ثوابوں میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جس نے اسلام میں کسی بُرے کام کو رواج دیا تو وہ اپنی سزا کے علاوہ آگے اُس پر عمل کرنے والوں کی سزا میں بھی برابر کا شریک رہیگا، اگرچہ اُن کی سزاؤں میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

یہ اور اس قسم کی بیشمار احادیث اور معتبر واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جہاں نماز روزہ جیسی عبادتوں کی ترغیب اور فضیلت بیان کی ہے، وہیں غرباء پروری واقرباء نوازی کی بھی تعلیم دی ہے، قولاً بھی عملاً بھی، یہ تو انسانیت ہے اور انسانیت نبی سے بڑھ کر کس کے اندر کامل ہو سکتی ہے؟ اس کے برخلاف آج ہمارے اندر اعزہ واقرباء نیز غرباء کے دکھ درد کا احساس ہی نہیں رہا، ان کے عبادت ہونے کا اعتقاد تک ختم ہوتا جا رہا ہے، بڑی بڑی تسبیحیں پڑھنے، لمبے لمبے ذکر کرنے اور زہد وتقویٰ کی باتیں کرنے والے بھی صلہ رحمی، اور اقرباء نوازی کے فریضے سے غافل ہیں، چہ جائیکہ غرباء پروری کا خیال رکھیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایک جگہ ایمان کے بعد پہلے اسی عمل کا ذکر کر کے پھر نماز روزہ کا ذکر فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ)	نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم اپنا چہرہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور سب پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں ، یتیموں ، محتاجوں ، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے ، اور گردن چھڑانے میں بھی خرچ کرے، اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے، اور جو اپنے عہد کو نباہے اور جو تنگدستی ، بیماری اور قتال کے وقت صبر سے کام لے، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

قطب عالم حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاگڑھی رحمہ اللہ کا یہ شعر پیغام بن کر ہر مسلمان کے دل میں اتر جانے کا قابل ہے ؎

رحمت کا ابر بن کر سارے جہاں پہ چھایئے
عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھایئے

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں دین کے تمام شعبوں کو زندہ رکھنے میں جدوجہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی غفلت سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین

(اداریہ جولائی ۲۰۰۹ء)

اس گھر کو آگ لگی گھر کے چراغ سے

قوموں پر جب بُرے دن آتے ہیں تو وہ سب سے پہلے عقل وخرد کی نعمت سے محروم کردی جاتی ہیں، پھر بھلی چیزیں اُنہیں بُری لگنے لگتی ہیں اور بُری چیزیں بھلی! یہاں تک کہ ان کی عقلی درماندگی اور فکری افلاس کے سامنے انسانیت وشرافت سر پیٹ کے رہ جاتی ہے، جانوروں کو تک ان کی اخلاقی گراوٹ پر حیا آنے لگتی ہے، اور وہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط کے مصداق ہوجاتے ہیں۔

ہمارے ملک پر انگریزوں کے دوسو سالہ اقتدار کے دوران تھوپے گئے یورپین کلچر کے نتیجہ میں ہماری اخلاقی قدریں اور تہذیبی علامتیں تو بہت پہلے ہی مٹ گئی تھیں، ان کے نظامِ تعلیم کی نحوست سے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ افراد کی عقلیں بھی ماری جارہی ہیں۔ اربابِ حکومت کا کام ملک کی زمینی سرحدوں کے تحفظ کے ساتھ آئینی وتہذیبی قدروں کی حفاظت بھی ہے، مگر بدقسمتی سے اب حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہے جن کے افکار مغربی تہذیب کے دلدادہ اور دماغ امریکن کلچر سے شکست خوردہ ہیں، اُنہیں ملکی تہذیب و تمدن کو زندہ کرنے سے زیادہ بیرونی طور طریقوں کو درآمد کرنے کی فکر رہتی ہے، مغربی اقوام کی کاسہ لیسی ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہے، یہ لوگ گن تو حب الوطنی اور قوم پرستی کے گاتے ہیں مگر کام ملک دشمنی اور قوم فروشی کے کرتے ہیں۔

کچھ زیادہ پرانی بات نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے وزیر تعلیم نے ایڈز جیسی مہلک

بیماریوں پر قابو پانے کے لیے بچوں کے نصابِ تعلیم میں جنسیات کو شامل کرنے کی نامعقول سفارش کی تھی، اور اب دہلی ہائی کورٹ کے فاضل جج نے باشندگانِ ملک کے بنیادی حقوق کو بحال کرنے کے لئے ہم جنس پرستی کے گھناؤنے جرم اور گندی حرکت کو قانونی موقف دیے جانے کی بات کہی ہے۔ اگرچہ اس کے ردِعمل میں ملک کی تمام اقوام اور مذاہب کے پیشواؤں نے ناپسندیدگی اور خفگی کا اظہار کیا ہے مگر حکومت کے ذمہ داروں نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے رعایا کی تشویش اور اندیشے دور ہو سکیں، وزیر قانون نے بس اس قدر اطمینان دلایا ہے کہ اس مسئلہ میں جلد بازی اور عجلت نہیں برتی جائے گی، ظاہر ہے کہ اس کو طفل تسلی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے امریکہ نواز اور مغرب مآب مسائل کو قصداً اٹھایا جاتا ہے، اور کچھ وقفہ کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے، دوسرے معنی میں یوں سمجھئے کہ ان مسائل کا شوشہ چھوڑ کر عوامی ردِعمل کی قوت کا اندازہ کیا جاتا ہے، پھر اسے یا تو نافذ کر دیا جاتا ہے یا پھر مناسب وقت تک کیلئے موقوف کر دیا جاتا ہے۔

یوں بھی اب حکومتوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ عوام کسی بھی معاملہ کی زیادہ دیر تک مخالفت نہیں کر پاتے، دھیرے دھیرے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اس لیے ایسے مسائل میں یہی ہو رہا ہے کہ عوام زیادہ ناراض ہوتی ہے تو ان مسائل کو چند دن کے لیے برفدان میں ڈال دیا جاتا ہے اور اگر ان کی ناراضگی کم ہوتی ہے یا کچھ جوش دکھا کے ختم ہو جاتی ہے تو حکم دانوں کی بلی تھیلے کے باہر آتی اور سر چڑھ کر بولتی بلکہ سینے پر لوٹتی ہے، اس وقت قوم کی بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم!

اب اللہ تعالیٰ ہی ہمارے اس ملک اور اس کی تہذیبی قدروں کی حفاظت فرمائے، اور کشتیٔ ملک کے ناخداؤں کو اتنی فہم و بصیرت عطا فرمائے کہ بیرونی آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر، ملک و قوم اور اس کی تہذیبی شناخت کو گروی رکھ دینے کی حماقت سے محفوظ رہیں۔

اَللّٰهُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَخَافُكَ وَلَا يَرْحَمُنَا۔ آمین

جہاں تک ہم جنس پرستی کی شرعی حیثیت اور مذہبی نوعیت کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں مستقل کچھ لکھنے کے بجائے حال ہی میں مرتب شدہ اس عاجز کے مجموعۂ مضامین ''شادی کا اسلامی تصور اور ہمارا طرزِ عمل'' سے چند سطریں نقل کر دینے کو کافی سمجھتا ہوں۔

ہم جنس پرستی ایک غیر انسانی حرکت ہے:

سفاح یعنی زنا ہی کی ایک اور قسم لواطت ہے، بلکہ یہ اس سے بھی گئی گذری اور انتہائی غیر فطری حرکت ہے کہ آدمی صنف مخالف کے بجائے اپنی ہی جنس کے ساتھ شہوت رانی و بدکاری کرے۔ العیاذ باللہ۔ یہ حرکت گذشتہ اقوام میں بھی کسی قوم میں نہیں تھی، صرف ایک قوم ـــــ یعنی اہل سدوم جن کی طرف حضرت لوط علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے تھے ـــــ میں پائی جاتی تھی، یہ قوم اس بری حرکت میں مبتلا تھی، ان کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام نے ان سے اس بری عادت کو چھڑانے کی بہت مخلصانہ کوشش کی تھی، مگر انہیں اس کی ایسی پختہ عادت پڑ گئی اور ایسی لت لگ گئی تھی کہ وہ کسی طرح اس حرکت کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا ایسا سخت عذاب نازل فرمایا کہ فرشتے نے ان کی بستی کو آسمان پر اٹھا کر پہلے انہیں گرایا پھر بستی کو ان پر الٹ دیا، اور ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش کی گئی، سوائے حضرت لوط علیہ السلام کے فرمانبرداروں کے اور کوئی شخص اس عذابِ الٰہی سے بچ نہ سکا۔ اس خبیث مرض کی خطرناکی اور ملعونیت کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو اس سے بچنے کی تاکید کی اور اس کے بُرے نتائج سے ڈرایا۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اس حرکت کے فاعل ومفعول دونوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا۔ (ابوداؤد: ۴/ ۱۵۸) اگرچہ کہ آپ کے دور میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا، محض ذکر آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سخت حکم ارشاد فرمایا جس سے اس کی شناعت اور واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے ہی دوسری روایت میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے قومِ لوط کی حرکت کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (نسائی: ۴/۳۲۲) لعنت رحمتِ خداوندی سے دوری کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے کس قدر سخت وعید ہے!

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اپنی امت سے سب سے زیادہ جس چیز کا خوف کرتا ہوں وہ قومِ لوط کا عمل (یعنی لواطت) ہے کہ کہیں وہ اس میں مبتلا نہ ہو جائے۔ (ترمذی: ۱۴۵۷)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ایسی حرکت کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ اس کی صبح وشام اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی میں ہوتی ہے۔

(شعب الایمان: ۲/۷۵۶)

امام ابنِ سیرینؒ فرماتے ہیں کہ یہ گندی حرکت جانوروں میں بھی سوائے گدھوں اور خنزیروں کے کسی اور جانور میں نہیں پائی جاتی، یعنی جانور تک اس سے نفرت کرتے ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ ایسی حرکت کرنے والوں کو قتل کردینے یا اونچے مکان سے گرا کر اوپر سے سنگ باری کرنے کا حکم دیتے تھے، حماد بن ابراہیمؒ فرماتے تھے کہ اگر کسی کو دو بار سنگسار کیا جاسکتا تھا تو یہ خبیث اس قابل تھے کہ انھیں دو بار سنگسار کردیا جائے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ لواطت کرنے والا آسمان وزمین کے تمام پانیوں سے غسل کرلے تو بھی پاک نہ ہوگا، نجس کا نجس ہی رہے گا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: لواطت کرنے والا اگر بغیر توبہ کے مرجائے تو قبر میں خنزیر بنادیا جائے گا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: جو مرد یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے ساتھ بدفعلی کی یہ حرکت کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر نسوانی شہوت پیدا کر کے اس کو شیطانِ مردود بنادیتا ہے۔ (شعب الایمان/ الزواجر وغیرہ)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے انہیں اطلاع دی کہ بعض دیہاتوں میں ایسے شخصوں کی اطلاع ملی ہے جو مردوں کو اپنے ساتھ اُن حرکتوں کا

موقعہ دیتے ہیں جو عورتوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ ایسے لوگوں کو کیا سزا دینی چاہئے، حضرت علیؓ نے فرمایا: آپ لوگ جانتے ہیں کہ یہ وہ گندی اور خبیث حرکت ہے کہ پچھلی امتوں میں بھی سوائے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے کسی اور قوم میں بھی نہیں ملتی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ بھی آپ لوگوں کو معلوم ہے، میری رائے تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو آگ میں ڈال دیا جائے، حضرت علیؓ کی اس رائے سے تمام صحابہ کرامؓ نے اتفاق فرمایا اور حضرت ابوبکرؓ نے اسی کا فیصلہ فرما دیا۔ (شعب الایمان: ۲/ ۷۵۶)

مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ کسی راستہ سے گذرتے ہوئے ایک شخص کو آگ میں جلتا ہوا دیکھا، آپ نے ازراہِ شفقت پانی منگا کر اس کو بجھانے کی کوشش کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آگ ایک لڑکا بن گئی اور آدمی آگ بن کر اس لڑکے کو جلانے لگا، بہت حیران ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان لوگوں کو زندگی دی جائے تا کہ حقیقتِ حال معلوم کر سکوں، اللہ پاک نے انہیں زندہ کر دیا تو اس شخص نے بتلایا کہ میں زندگی میں اس لڑکے کی محبت میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ بدفعلی کیا کرتا تھا، جب میں مر گیا اور یہ بھی اپنے وقت پر مر گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ کبھی میں آگ بن کر اس کو جلاتا رہوں اور کبھی یہ آگ بن کر مجھ کو جلاتا رہے۔ أَعَاذَنَا اللهُ مِنْهُ (الزواجر: ۱/ ۷۸۹)

مذکورہ بالا اخبار و آثار مسئلہ کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہے کہ اسلام کی تعلیمات اس سلسلہ میں بہت سخت ہیں، خود انسانی مزاج بھی ـــــ اگر وہ مسخ نہ ہو گیا ہو ـــــ اس سے متنفر ہے، اس لئے یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ کس طرح اس خبیث حرکت کو جسے نہ کوئی مذہب قبول کرتا ہے اور نہ فطرتِ سلیمہ تسلیم کرتی ہے، انسانی حق قرار دے کر جواز فراہم کرنے کی سفارش کی جارہی ہے؟

(اداریہ اگست ۲۰۰۹ء)

چوں کفر از کعبہ برخیزد

اسلام چونکہ ایک ابدی اور آفاقی مذہب ہے اس لئے اس کے احکام میں بھی ابدیت وآفاقیت ملحوظ ہے، یعنی اس میں ہر زمانے اور ہر علاقے کے لوگوں کے لئے قابلِ قبول اور لائقِ عمل ہونے کی شان پائی جاتی ہے، ردّ و بدل، حک و فک کی ضرورت اُن دستوروں میں ہوتی ہے جو انسانی تجربات اور ناقص علم کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، اس کے برخلاف جو دستور حق تعالیٰ کی حکمتِ بسیط اور علمِ محیط سے نکلتا ہے وہ تجربہ اور تبدیل کے نقص سے پاک ہوتا ہے، اسلامی احکام جب ـــــ ہمارے عقیدہ کے مطابق ـــــ حق تعالیٰ شانہٗ کے نازل ونافذ کردہ ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ـــــ جن کے ذریعہ یہ احکام بھیجے گئے ـــــ آخری اور بالکل آخری نبی ہیں، آپ کے بعد اب قیامت تک کوئی آسمانی ہدایت ہم بندوں کے لیے آنے والی نہیں ہے، (نہ کلی نہ جزوی، نہ ظلی نہ بروزی) تو آپ کے پردہ فرمانے کے وقت "دینِ اسلام" جس شکل و ہیئت میں قائم تھا اس پر تکمیل واتمام کی مہر لگادی گئی، اور اس کے جو احکام جس طرح نافذ تھے وہ اسی طرح قیامت تک کے لیے استقرار پاگئے۔ امت کا کام اب ان احکام کی حفاظت، تعمیل اور تبلیغ ہے۔ علماءِ اسلام انہی احکام کی تشریح و تفہیم کے ذمہ دار ہیں تو حکامِ مسلمین انہی احکام کی تنفیذ اور اس کے مطابق امتِ مسلمہ کی تنظیم کیلئے جوابدہ ہیں۔

جہاں تک احکامِ اسلامی میں "اجتہاد" کی بات ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام

میں اجتہاد کی اُس وقت تک گنجائش ہے جس وقت تک زمانہ تغیر پذیر ہے اور اس کو اجتہاد کی ضرورت ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مجتہد اس کی اہلیت رکھتا ہو اور اجتہاد اپنے دائرۂ حدود میں ہو، یہ نہیں کہ اسلامی مزاج کی شناخت ومعرفت اور اس کے احکام سے تفصیلی واقفیت کے بغیر کوئی شخص مجتہد بن بیٹھے اور بنیادی احکام کو کھودنے اور اسلام کے ڈھانچے ہی کو ڈھانے لگے، جیسا کہ آج کل کے بنا کسی استاذ کے تعلیم یافتہ نام نہاد مجتہدین محض شخصی مطالعہ کے ذریعہ چند سطحی معلومات کو لے کر بنیادی احکام اور اصول وقواعد سے بے خبر ہونے کے باوجود اجتہاد کے نام پر بنیادی احکام اور تعلیماتِ اسلامیہ کی مٹی پلید کررہے ہیں، بلکہ فی الحقیقت دشمنانِ اسلام کی جانب سے لائے جانے والے مصنوعی اسلام کے دست وبازو بن کر ملتِ اسلامیہ کو اسلامِ حقیقی سے دور بلکہ نفور کررہے ہیں۔

مجتہد میں اجتہاد کی اہلیت اور مجتہد فیہ مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش کا ہونا یہ دونوں ایسی لازمی شرائط ہیں کہ اگر ان میں تساہل اور مداہنت برتی جاتی ہے تو دینِ اسلام کا حلیہ بگڑ کر ایک متوازی دین وجود میں آجاتا ہے اور اگر ان شرائط کی پختگی ودیانت کے ساتھ رعایت کی جاتی ہے تو اس اجتہاد کے ذریعہ دین اسلام کی ہمہ گیری اور اس کی آفاقیت وابدیت کا وصف نمایاں ہوتا ہے، نیز اس کی وسعت ورحمت سے اہل زمانہ کو نفع پہونچتا ہے۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی احکام دو طرح کے ہیں، ایک وہ جن میں ردّ وبدل اور کمی زیادتی کا کسی کو کوئی حق نہیں، وہ اٹل ہیں اور گویا دین اسلام کا ڈھانچہ اور اس کی بنیاد ہیں، دوسرے وہ احکام ومسائل جن میں لچک اور حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اوّل الذکر میں کسی قسم کی کوئی مداخلت کرنے کا بندوں کو حق حاصل نہیں ہے، وہ بعینہٖ قائم ہیں اور قائم رہیں گے، ان میں تبدیلی دین ہی کی تحریف ہے، ان میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ﴿۱۱۶﴾ (سورۃ النحل)

جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے اُن کے بارے میں یوں مت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے (جس کا حاصل یہ ہوگا) کہ تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگادو گے، بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے امت کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

جس نے جان بوجھ کر میری طرف غلط بات منسوب کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنالے۔ (مقدمہ مسلم موسوعہ ص: ۶۷۴)

احکام کی دوسری قسم سے متعلق واضح رہنمائی اس روایت میں ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک محبوب اور چہیتے صحابی حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن روانہ کرتے ہوئے پوچھا تھا:

كَيْفَ تَقْضِيْ ؟ فَقَالَ اَقْضِيْ بِمَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ قَالَ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَالَ اَجْتَهِدُ رَأْيِيْ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔

تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ انہوں نے کہا کتاب اللہ سے، آپ ﷺ نے پوچھا اگر وہ صورت کتاب اللہ میں نہ ہو تو؟ انہوں نے عرض کیا ایسی صورت میں اللہ کے رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا، آپ ﷺ نے پوچھا اگر وہ سنت رسول اللہ میں بھی نہ ہو تو؟ انہوں نے عرض کیا: ایسی

(ترمذی: باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی)

صورت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام تعریفیں اُس اللہ کیلئے ہیں جس نے اپنے رسول کے قاصد کو (صحیح بات کی) رہنمائی کی۔

معلوم ہوا کہ دینِ اسلام کے احکام کچھ تو بنیادی ہیں اور کچھ فروعی، پہلے میں ردو بدل کی کوئی گنجائش نہیں، دوسرے میں بوقتِ ضرورت اجتہاد و قیاس سے مدد لینے کی گنجائش موجود ہے۔

اجنبی عورتوں اور مردوں میں اختلاط سے اجتناب اور حجاب کا بنیادی مسئلہ احکام کی پہلی نوعیت سے تعلق رکھتا ہے، اس سلسلہ کے قرآنی احکامات، نبوی ہدایات اور صحابہ کرامؓ ـــــ جو کتاب وسنت کے اولین جاننے اور عمل کرنے والے ہیں ـــــ کے واقعات اور مزاج اسلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں اجنبی عورتوں اور مردوں کا اختلاط اور باہم میل جول ـــــ خواہ وہ کسی غرض سے ہو ـــــ مقاصدِ عبودیت کے لیے مضر ہونے کے علاوہ معاشرۂ اسلامی کی طہارت و پاکبازی کے لیے بھی سخت نقصان دہ عمل اور شیطانی کھیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سوائے حج کے ـــــ جس کی ادائیگی کے ایام و اماکن مختص ہیں ـــــ کسی بھی عمل میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط نہیں رکھا گیا بلکہ حج میں بھی اگرچہ عورت کا احرام چہرہ کھلا رکھنا ہے، اس کے باوجود اس کو بے حجابی و بے پردگی کی اجازت نہیں دی گئی ہے، بنا محرم سفر کی اجازت نہیں، نظروں کی حفاظت کی تاکید ہے، اسی طرح ''نماز باجماعت'' جو اسلام کا بنیادی عمل ہے اس میں بھی عورتوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ پورے ذخیرۂ احادیث میں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جس میں عورتوں کو باجماعت نماز پڑھنے یا اس کے لیے کم از کم مسجد کی جماعت میں شرکت کرنے کی ترغیب اور فضیلت دی گئی ہو، جب کہ مردوں کو نہ صرف اس کی ترغیب دی گئی ہے بلکہ عدمِ شرکت اور لاپرواہی پر انہیں سخت سے سخت وعیدیں

سنائی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم کی چند آیات پیش خدمت ہیں، امت کے سب سے باا عتماد و باحیا طبقہ خواتین یعنی ازواجِ مطہرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاهِلِیَّةِ الۡاُوۡلٰی (الاحزاب:۳۳)	اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔

اس کی تفسیر میں مشہور تابعی مجاہدؒ وقتادہؒ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ کی عورتیں بن ٹھن کر مردوں میں گھوما پھرا کرتی تھیں، آیت کے ذریعہ اہل اسلام کی عورتوں کو اس سے منع کیا گیا ہے۔

دوسری طرف تقویٰ و پرہیز گاری کے معیارِ اعلیٰ حضراتِ صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِکُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِکُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ ؕ (الاحزاب:۵۳)	اور جب تم اُن (ازواجِ مطہرات) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگا کرو، یہ بات تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخِ انسانیت کے سب سے پاکیزہ سماج سے متعلق ہدایت دی گئی:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ ؕ (سورۃ الاحزاب:۵۹)	اے پیغمبر! اپنی بیبیوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیبیوں سے بھی کہہ دیجئے کہ اپنی چادریں سر کے اوپر سے کچھ نیچے (بھی) کرلیا کریں یعنی چہروں پر گھونگھٹ ڈال لیں۔

ایک اور موقعہ پر ہدایت دی گئی:

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (سورۃ النور:۳۱)

اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔

دل کی دنیا صالح وطاہر رکھنے کے لیے نگاہوں کی حفاظت کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ الآية (النور:۳۰،۳۱)

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے، بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ دیجئے (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع کو آگے بیان کردہ چند رشتوں کے علاوہ کسی کے سامنے) ظاہر نہ کریں۔

حضرت مریم علیہا السلام کی خلوت میں فرشتہ کے بصورت آدمی پہونچنے پر ان کی گھبراہٹ اور عاجزی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

قَالَتْ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝۱۸ (سورۃ مریم)

کہنے لگیں کہ میں تجھ سے (اپنے خدائے) رحمن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو (کچھ) خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جا)

مذکورہ بالا ارشاداتِ ربانیہ کے بعد اس سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی چند ہدایات بھی ملاحظہ فرمالیجئے، آپ نے فرمایا:

ایاکم والدخول علی النساء۔ (بخاری: ۵۲۳۲) — تم مرد لوگ اجنبی عورتوں کے پاس آمد و رفت سے بچو۔

اس پر ایک انصاری صحابیؓ نے عرض کیا ''الحمو'' — شوہر کے قریب ترین عزیزوں مثلاً دیور — کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا:

الحمو الموت (متفق علیہ) — وہ تو احتیاط و حجاب میں مثل موت کے ہیں۔

ایک اور موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لان یطعن رأس احدکم بمخیط من حدید خیر له من ان یمس امرءة لاتحل له۔ (طبرانی و بیهقی) — تم میں سے کسی کے سر میں لوہے کی سلاخ ٹھونس دی جائے اس سے بہتر ہے کہ وہ نامحرم عورت کے جسم کو چھوئے۔

اسی طرح ارشادِ گرامی ہے:

لا یخلون رجل بامرة الا مع ذی محرم (بخاری: ۵۲۳۳) — کوئی عورت بغیر محرم کے کسی مرد سے تنہائی میں نہ ملے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں اور حضرت میمونہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک نابینا صحابیؓ آپ سے ملاقات کے لیے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے فرمایا:

احتجبا — تم لوگ پردہ میں ہو جاؤ

ہم نے عرض کیا وہ تو نابینا ہیں (ہمیں دیکھ نہیں پاتے) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

افعمیاو ان انتما — تم لوگ تو اندھی نہیں ہو، تمہاری نظر تو پڑے گی!

ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی طرف نظر کرنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا بھی منع ہے۔

جہاں تک ان تعلیمات وارشادات کے بعد خود صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل کا معاملہ ہے تو درج ذیل چند واقعات سے اس کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ ابوالقُعیس ـــــ جن کی زوجہ نے حضرت عائشہؓ کو دودھ پلایا تھا ـــــ کے بھائی حضرت عائشہؓ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے تھے، حضرت عائشہؓ نے انہیں گھر میں داخل ہونے سے اس لیے منع فرما دیا کہ ان کے محرم ہونے میں ان کو تردّد تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے مسئلہ دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر میں ہوتے تھے، جب دوسرے سوار ہمارے قریب سے گذرتے تو ہم لوگ اپنی چادر سے چہرہ ڈھانک لیتے تھے، جب وہ آگے نکل جاتے تب ہم چہرے کھول لیتے۔

حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ ہم نے حضرت عائشہؓ کے سامنے مہاجر عورتوں کے فضائل کا ذکر کیا، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: یہ تو صحیح ہے کہ مہاجر خواتین کے بڑے فضائل ہیں، لیکن میں نے بخدا انصار کی عورتوں سے زیادہ کتاب اللہ کی تصدیق کرنے والی اور قرآن کریم پر پختہ یقین رکھنے والی عورتیں نہیں دیکھیں، جب آیت وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ نازل ہوئی تو ان کے مردوں نے گھر جا کر اپنی عورتوں کو یہ حکم سنایا، اور ان عورتوں نے ـــــ اللہ ان پر رحم فرمائے ـــــ صبح ہی سے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا کہ بڑی بڑی چادروں میں اپنے کو لپیٹ کر اس میں مخفی ہو کر رہنے لگیں۔

یہ چند مثالیں ہیں اسلام میں حجاب کے لزوم اور مردوں وعورتوں کے درمیان اختلاط کے ممنوع ہونے کے سلسلہ میں کتاب وسنت اور اسلاف کی تعلیمات اور صحابیات کے عمل کی۔ اس وقت چونکہ اس موضوع کی تفصیل مدِ نظر نہیں ہے، اس لیے انہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اسلام کے برخلاف دیگر ادیان واقوام نے مسئلہ حجاب اور اختلاط کو زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ یورپ کے جدید کلچر نے تو اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے اسے عورتوں کے طبقہ پر ظلم اور ان کے ساتھ ناانصافی قرار دیا، اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑایا، اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم اور نیم برہنگی کے ذریعہ کالج کلچر کو عام کیا، مزید ظلم یہ کہ اپنی عورتوں کو بے حجاب کرنے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے تمام اقوام کی عورتوں بالخصوص مسلمان عورتوں کا مسلسل تعاقب کیا۔ اِدھر مسلم حکمرانوں اور عامۂ مسلمین کی اکثریت کی مغرب پرستی اور عشرت پسندی نے اپنی بے دینی پر پردہ ڈالنے کے لئے طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لیا اور بے سندو من گھڑت دلائل سے مسلمان عورتوں کی عفت وعصمت پر ڈاکہ ڈالنا شروع کردیا، نتیجتاً عالمِ اسلام میں بھی بے حجابی وبے باکی عورتوں کی شان اور کمال بننے لگی۔ ایک سعودی عرب ـــــ جو بہ دعوائے خویش مملکتِ اسلامیہ کہلایا جاتا ہے اور بہت حد تک صحیح بھی ہے ـــــ بے حجابی کی اس صورتحال سے کم از کم بیرون خانہ محفوظ تھا اور فی الحال ہے بھی، لیکن یورپ کے بڑھتے ہوئے دباؤ، گلوبلائزیشن کے صہیونی پریشر اور امریکی فراعنہ کے جارحانہ مطالبات کا مقابلہ نہ کرسکنے والے موجودہ حکمران شاہ عبداللہ نے گذشتہ دنوں سعودی عرب میں سائنسی علوم پر مشتمل ایک یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا، جو اگرچہ تعلیمی ترقی کے اعتبار سے ایک خوش آئند اقدام ہے، مگر اسی کے ساتھ اس یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کی بیخ لگا کر آزادی حجاب سے محفوظ واحد مملکت کو بھی بے پردگی وآزادئ ثقافت کا سگنل دے دیا۔ یہ دنیا بھر کے غیور مسلمانوں کے لیے ایک حیرتناک المیہ ہے، اور ناطقہ سر بگریباں ہے کہ۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی؟

دوسری جانب نام نہاد تجدد پسندوں اور غیر اسلامی ترقی کے متوالوں کی طرف سے داد وتحسین کی صدائیں ہر چہار سمت سے بلند ہو رہی ہیں، اور خود مکار وعیار یورپ خوشی کے شادیانے بجا رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ علماءِ اسلام حکامِ اسلام کی توجہ ان امور کی اہمیت کی طرف مبذول کرانے کا اپنا فرض ادا کریں۔ بالخصوص سعودی عرب کے والی مملکت خادم الحرمین الشریفین کی خوبیوں اور خدمتوں کے اعتراف کے ساتھ اس فیصلے کی سنگینی اور نقصانات کی مذمت کریں، یہ نہ سمجھیں کہ ہماری چیخ وپکار سے کیا ہونے والا ہے؟ اس لیے کہ بقول حضرت مفتی شفیع صاحبؒ "بیماری عام ہو جائے تو بھی اس کو بیماری کہا جاتا ہے صحت نہیں کہا جاتا" اور بقول شیخ الاسلام تقی عثانی دامت برکاتہم "چاہے کوئی سنے نہ سنے فریضۂ امر ونہی تو ادا ہو ہی جاتا ہے"۔

الحمدللہ مجلس علمیہ آندھرا پردیش کے ذمہ داروں نے مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّکُمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ کے بموجب اس مسئلہ پر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ایک مناسب ومعتدل احتجاجی نوٹ ریاست کے تمام علماءِ کرام کی طرف سے خادم الحرمین الشریفین کی خدمت میں روانہ کر دیا ہے، اور تمام علماءِ کرام سے خواہش کی ہے کہ وہ بھی اپنی طرف سے اس کی کاپیاں مملکت کو روانہ کریں۔

اللہ تعالیٰ حکامِ اسلام میں کھوئی ہوئی ہمت وجرأت اور اسلامی غیرت دوبارہ پیدا فرما کر انہیں سارے عالم کے مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل اور مذہبِ اسلام کے لیے الحاد وزندقہ کا ڈھال بنا دے۔ نیز علماءِ اہل اسلام کو سلفِ صالحین کی روش اختیار کر لینے، مصلحت کے نام پر مداہنت میں اور حکمت کے حوالہ سے دین کی ذلت میں مبتلا ہو جانے سے محفوظ فرمائے۔ آمین (اداریہ جنوری ۲۰۱۰ء)

(الف)

دارالعلوم دیوبند ہی کا پیچھا کیوں؟

ادھر کچھ عرصہ سے میڈیا میں دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے کچھ نہ کچھ خبریں شائع ہورہی ہیں، بالخصوص ''فتاویٰ'' کے سلسلہ میں دانستہ طور پر اس عظیم اسلامی یونیورسٹی کی شبیہ بگاڑنے کی مسلسل سعی کی جارہی ہے، پچھلے دنوں کسی مفتی کو رشوت لیتا ہوا دکھا کر الکٹرانک میڈیا میں دارالعلوم دیوبند کے نام کو ناحق بدنام کیا گیا، اس کے بعد سے برابر کوئی نہ کوئی فتویٰ بلاضرورت اور بے موقع اخبارات میں شائع ہوتا ہی رہتا ہے، ساتھ ہی اخبار والوں کی طرف سے ''یادرہے کہ'' اور ''اس جگہ یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ'' جیسے جملوں کے ساتھ پچھلے فتاویٰ جن کی وضاحتیں بھی ہوچکی ہوتی ہیں دہرائے جاتے ہیں، اور اس کے معاً بعد سیاسی وسماجی حلقوں کے تبصرے شروع ہوجاتے ہیں۔ میڈیا کے اس طرز عمل پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش اور بنی بنائی پلاننگ کے تحت ہے۔

مثال کے طور پر جاریہ مہینے کے دوران اخبارات کی سرخیاں بنے چند فتاویٰ اور ان پر سماجی وسیاسی شخصیات کے تبصرے روزنامہ منصف حیدرآباد کے شکریہ کے ساتھ بعینہٖ ذیل میں درج ہیں، ان خبروں میں آپ کو نیوز میکرز یعنی خبر سازوں کا بین السطور یا تحت اللفظ بھی اچھی طرح سمجھنے کو ملے گا:

ماڈلنگ اور فلموں میں اداکاری غیر اسلامی: دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

مظفر نگر۔ 2 رمئی (پی ٹی آئی) برِ صغیر کی ممتاز دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے فتویٰ

جاری کیا گیا جس میں مسلم خواتین کی ماڈلنگ اور اداکاری کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ شریعت کی رو سے یہ ایک سنگین جرم اور بدترین گناہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نائب ناظم اعلیٰ مولانا عبدالخالق مدراسی نے کہا کہ پردہ مذہب کا اہم ترین اصول ہے، بے پردگی حرام ہے۔ جہاں تک ماڈلنگ اور فلموں میں اداکاری کا تعلق ہے خواتین اس میں نہ صرف اپنا پردہ اتار دیتی ہیں بلکہ جسم کی نمائش بھی کرتی ہیں۔ لہٰذا شریعت کی رو سے یہ ایک سنگین جرم ہے۔ مولانا نے مزید بتایا کہ اسلامی قوانین کی روشنی میں ماڈلنگ کے خلاف فتویٰ جاری کرنے کا مفتیانِ کرام کو جواز حاصل ہے۔ اس استفسار پر کہ سابقہ فتویٰ میں ہندوستان کی ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مختصر لباس کا استعمال ترک کرے جس سے جسم نمایاں ہوتا ہو، بالخصوص ٹینس اسکرٹس کے استعمال سے گریز کا مشورہ دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالخالق مدراسی نے کہا کہ مفتیان کرام کو فتویٰ جاری کرنے کا مکمل اختیار حاصل ضرور ہے لیکن اگر عوام فتویٰ پر عمل نہیں کرتے تو اس کے لیے وہ (عوام) ہی گنہگار یا ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مولانا نے وضاحت کی کہ فتویٰ پر عمل آوری لازمی حیثیت نہیں رکھتی، یہ ایک عمومی مشورہ ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے جاری کیے جانے والے فتوے ملک کے قوانین کے مغائر نہیں ہو سکتے۔ ان کی نوعیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ہندوستان بھر میں پنچایتوں کے احکامات یا افغانستان و پاکستان کے بعض علاقوں میں جرگہ کے فیصلے ہوتے ہیں۔ فتویٰ کوئی حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک رہنمایانہ اصول ہوتا ہے۔ جو شخص رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے کسی مفتی سے رجوع ہوتا ہے اور فتویٰ حاصل کرتا ہے تو اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا اس کا اختیارِ تمیزی ہوتا ہے۔ ملک میں پہلی مرتبہ ممتاز دینی درسگاہ کے کسی سینئر عالم دین نے فتویٰ کی حقیقت اور اس کی حیثیت پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا عبدالخالق مدراسی نے وضاحت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ فتویٰ پر عمل کیا جا سکتا ہے اور اس کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس شخص کی خلوصِ نیت پر منحصر ہے جو فتویٰ حاصل کرتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے اس فتوے سے اختلاف کرتے ہوئے ممبئی کی فلمی شخصیتوں (سلیبرٹیز) نے ذہنی تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ ممتاز نغمہ نگار جاوید اختر نے کہا کہ ماڈلنگ و اداکاری ہرگز غیر اسلامی نہیں ہو سکتی۔ یہ مسئلہ کیوں اٹھایا جا رہا ہے نا قابل فہم ہے۔ اداکار اور ماڈل ذلفی سید نے اپنے ردعمل میں کہا کہ اسلام ایک عصری مذہب ہے جس میں اداکاری اور ماڈلنگ ممنوع نہیں ہے۔ جو لوگ مذہب کا گہرا علم نہیں رکھتے وہ اس طرح کی چیخ و پکار کرتے ہیں۔ اس میں کوئی معقولیت کی بات نہیں ہے۔ شہور علی نامی اداکار نے بھی کہا کہ کسی بھی مذہب میں ماڈلنگ اور اداکاری ممنوع نہیں ہے۔ دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح ماڈلنگ

اور اداکاری کے شعبہ میں بھی سخت ترین محنت اور جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس مسئلہ پر فتویٰ جاری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (روزنامہ منصف ۱۳ مئی ۲۰۱۰ء)

انشورنس پالیسی کو اپنانا شریعت کے مغائر: دار العلوم دیوبند کا فتویٰ

لکھنؤ۔14 مئی (پی ٹی آئی) دار الافتاء دار العلوم دیوبند نے بنکوں میں ملازمت کو غیر اسلامی قرار دینے کے بعد اب انشورنس پالیسی کے اختیار کرنے کو بھی اسلامی اصولوں کے خلاف قرار دیا ہے۔ ملک کی اس سب سے بڑی دینی جامعہ سے جاری کردہ فتویٰ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ "انشورنس پالیسی غیر شرعی ہے کیونکہ وہ سود اور جوئے پر مبنی ہے" فتویٰ اس استفسار کے جواب میں جاری کیا گیا ہے کہ "شریعت کی روشنی میں انشورنس پالیسی حاصل کرنا جائز ہے؟" یہاں یہ تذکرہ بے جانہ ہوگا کہ ہندوستان میں لاکھوں مسلمان انشورنس پالیسیاں لیتے ہیں جو ایک معاہدہ ہے جس کے ذریعہ طمانیت دی جاتی ہے کہ نقصانات یا جوکھم کی صورت میں بیمہ شدہ شخص یا اس کے نامزد کردہ کسی شخص کو متعینہ رقم دی جائے گی۔ اسی دوران دہلی کے ایک عالم دین مولانا افروز قجبی نے کہا ہے کہ فتاویٰ جاری کرنے والے علماء (مفتیان) کو چاہیے کہ وہ اس پس منظر کی بھی وضاحت کردیں جس میں فتویٰ جاری کیا جارہا ہے تاکہ کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ دریں اثناء جمعیۃ العلماء ہند کے ترجمان مولانا عبدالحمید نعمانی نے کہا ہے کہ فتاویٰ کو عمومیت نہیں دی جانی چاہیے اور یہ دیکھا جانا چاہیے کہ ایک فتویٰ کس پس منظر میں جاری کیا گیا ہے۔ "لوگوں کو چاہیے کہ وہ بین السطور مفہوم اخذ کریں اور فتاویٰ کو عمومیت (حکم عام) کا موقف نہ دیں۔ قبل ازیں دار العلوم دیوبند نے بنکوں میں سود پر مبنی تحریروں اور حساب کتاب کے کام کو غیر شرعی قرار دیا تھا۔ یہ فتویٰ اس استفسار کے جواب میں تھا کہ آیا مسلمان کسی بنک یا انشورنس کمپنیوں میں کام کرسکتے ہیں؟۔ (روزنامہ منصف ۱۵ مئی ۲۰۱۰ء)

دار العلوم دیوبند کے فتویٰ کی مذمت پر خود ساختہ دانشور کی ملامت

نئی دہلی۔15 مئی (پی ٹی آئی) بالی ووڈ کے ممتاز نغمہ نگار جاوید اختر کو ای میل پر موت کی دھمکی دی گئی ہے۔ انہوں نے ایک ٹی وی چیانل پر بحث کے دوران برسرروزگار مسلم خواتین کے خلاف دار العلوم دیوبند کے فتویٰ کو پاگل پن قرار دیا تھا۔ جاوید اختر نے بتایا کہ انہیں ای میل پر ایک پیغام موصول ہوا جس میں کہا گیا کہ "اب آپ کی الٹی گنتی شروع ہوچکی ہے"۔ پی ٹی آئی سے بات چیت کرتے ہوئے جاوید نے بتایا کہ فتویٰ کے خلاف ان کے بیان کے بعد ہاٹ میل پر بے شمار ای میل

موصول ہوئے جس میں ان کی لعن طعن کی گئی۔انہیں اسلام اور مسلم دشمن قرار دیا گیا۔جاوید اختر نے فوری پولیس کو اطلاع دی تا کہ انہیں معقول سکیورٹی فراہم ہو سکے، چنانچہ ان کی رہائش گاہ پر سکیورٹی اہلکار تعینات کردئے گئے ہیں۔اختر نے کہا فتوؤں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، معاشرے میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔اس بات پر بعض مسلمان مشتعل ہو گئے اور انہوں نے نفرت انگیز ای میل پیغامات روانہ کیے۔ بعض ای میلس دھمکی آمیز تھے۔ایک میں انہیں جان سے ماردینے کی بھی دھمکی دی ہے۔دارالعلوم دیو بند کی جانب سے حال ہی میں فتویٰ جاری کیا گیا تھا کہ مسلم خواتین کے لیے دفاتر میں مردوں کے ساتھ میل جول بڑھانا ناجائز ہے بلکہ ایسی اجرت شریعت میں حرام قرار پاتی ہے۔مسلم خواتین کو چاہیے کہ وہ ایسے مقامات پر روزگار یا ملازمت کرنے سے گریز کریں جہاں ان کا مردوں کے ساتھ میل جول ہوتا ہو۔دارالعلوم دیو بند کے شعبۂ افتاء کے سربراہ مفتی حبیب الرحمن کی زیر صدارت علماء کی کمیٹی نے یہ فتویٰ جاری کیا تھا۔ٹی وی چینل پر اس فتویٰ کے سلسلہ میں بحث کا اہتمام کیا گیا تھا۔جاوید اختر نے دوران مباحثہ فتویٰ کی مذمت کی تھی۔جاوید اختر کو دھمکی دیتے ہوئے ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ فوری مسلمانوں سے معذرت خواہی کریں، بصورت دیگر سنگین عواقب کے لیے تیار ہو جائیں۔(روزنامہ منصف ۱۶ رمئی ۲۰۱۰ء)

دیو بند کے فتاویٰ سے مسلمانوں کی ترقی غیر متاثر: سلمان خورشید

نئی دہلی۔15 رمئی (یو این آئی) مرکزی وزیر اقلیتی امور سلمان خورشید نے دارالعلوم دیو بند کے حالیہ فتاویٰ کا حوالہ دیتے ہوئے آج کہا کہ بحیثیت مسلمان وہ ان سے متاثر نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے ردِ عمل سے ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے۔واضح رہے کہ دارالعلوم نے اپنے فتوؤں میں خواتین کی ملازمت کی مخالفت کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ انشورنس پالیسی اختیار کرنا شریعت اور اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔سلمان خورشید نے یہاں ایک پریس کانفرنس کے دوران اس مسئلہ پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مزید بینکوں اور اسکولوں کے قیام کے لیے مسلمانوں کے مطالبات میں اضافہ ہو رہا ہے۔اس استفسار پر کہ آیا علماء کی جانب سے ایسے فتوؤں سے مسلمانوں کی ترقی متاثر نہیں ہو رہی ہے اور کیا ان کی وزارت کو اس کا نوٹ نہیں لینا چاہیے؟ سلمان خورشید نے کہا کہ اقلیتوں کی ترقی کے لیے ان کی وزارت کی اسکیمات پر ایسے فتوؤں کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔انہوں نے کہا کہ ہم اپنے کام کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔کوئی ہمیں روکنے نہیں آرہا ہے۔ہم ان (فتوؤں) سے قطعی متاثر نہیں ہوئے ہیں۔اور اگر کوئی مجھے اپنے کام سے روک دے تو پھر میں اس کا نوٹ لوں گا۔انہوں نے بتایا کہ ان کی

وزارت مزید بینکوں کا قیام عمل میں لائے گی اور قائدانہ رول ادا کرنے خواتین کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ ان اسکیموں اور پروگراموں پر مسلمانوں کا ردِ عمل کافی حوصلہ افزا رہا ہے اور یہ بے حد کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک مسلمان ہوں اور اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس انشورنس پالیسی ہے اور میں بینکنگ نظام کے فوائد سے بھی استفادہ کرتا ہوں۔ یہاں یہ تذکرہ مناسب ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند نے جو برصغیر کی ایک ممتاز دینی درسگاہ ہے، انشورنس پالیسی اختیار کرنے کے خلاف فتویٰ جاری کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ یہ سود اور جوئے پر مبنی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ دارالافتاء نے اس استفسار پر کہ آیا شریعت کی روشنی میں انشورنس پالیسی لینا جائز ہے، یہ فتویٰ جاری کیا۔ دارلعلوم دیوبند اسلامی بینکنگ متعارف کرنے کی وکالت کرتا رہا ہے جس کے تحت صارفین قرضہ جات پر سود ادا نہیں کرتے اور اس میں رقومات جمع کرنے والوں کو سود ادا نہیں کیا جاتا۔ (روزنامہ منصف ۱۶ر مئی ۲۰۱۰ء)

علماء کو مسلمانوں کی پسماندگی کا جائزہ لینے کا مشورہ

دیوبند کے فتویٰ پر شدید ردِ عمل، دہلی کی خواتین سے آئی اے این ایس کا انٹرویو

نئی دہلی۔ 17ر دہلی (آئی اے این ایس) کئی نوجوان مسلم خواتین نے خواتین اور مردوں کے دفاتر میں گھل مل کر کام کرنے پر دیوبند کی دینی درسگاہ کے جاری کردہ فتویٰ پر شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وقت آچکا ہے کہ علماء مسلمانوں کے لیے پریشان کن حقیقی مسائل کا جائزہ لیں جن میں معاشی پسماندگی بھی شامل ہے۔ ایک کال سینٹر میں ملازم 20 سالہ جینس میں ملبوس لڑکی فرزانہ تسنیم نے آئی اے این ایس کو بتایا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ کس بناء پر یہ باور کرتے ہیں کہ خواتین کو کام کرنے سے روکنا ممکن ہے۔ تسنیم نے بتایا کہ وہ ایک درخواست علماء کے گوش گذار کرتی ہیں۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں بتایا کہ آیا علماء نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی و معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوئی کام انجام دیا ہے؟ تسنیم نے بتایا کہ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے تو انہیں اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ مغربی اترپردیش کے ضلع سہارنپور میں واقع دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے علماء نے 14ر اپریل کو ایک آن لائن استفسار پر ایک فتویٰ جاری کیا تھا۔ تاہم مسلم اسکالرس کے بشمول دیگر متعدد گوشوں کی جانب سے فتویٰ کو نشانہ بنایا گیا۔ بہت سے لوگ اس اقدام کو دینی درسگاہ کی غیر ضروری مداخلت سے تعبیر کر رہے ہیں۔ دارالعلوم ویب سائٹ کے دارالافتاء پیج پر ایک گمنام سوال کنندہ نے یہ دریافت کیا تھا کہ آیا ہندوستان میں مسلم خواتین سرکاری یا خانگی ملازمتیں کرسکتی ہیں؟ آیا انہیں جو تنخواہ

کام کے معاوضہ میں حاصل ہوگی وہ حلال ہوگی یا حرام؟ اس کے جواب میں دینی درسگاہ نے بتایا تھا کہ ایسے خانگی یا سرکاری اداروں میں جہاں مردوزن مل جل کر کام کرتے ہیں اور خواتین کو نقاب کے بغیر بے باکی کے ساتھ مردوں سے بات چیت کرنی پڑتی ہے وہاں کام کرنا مسلم خواتین کے لیے جائز نہیں ہے۔ دینی درسگاہ کے علماء نے اگرچہ یہ بتایا کہ اگر خواتین کام کے دوران مناسب لباس زیب تن کریں تو فتویٰ کی ممانعت کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا، جب کہ بہت سے مسلم خواتین نے اس پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ تسنیم نے برہمی کی حالت میں بتایا کہ اگر فتویٰ کا تعلق لباس سے ہے تب بھی وہ اس پر عمل کرنے کی پابند نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ علماء مبلغین ہوتے ہیں اور جج نہیں ہوتے۔ ان کا کام تبلیغ کرنا ہے جب کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں گی کہ انہیں کس بات پر چلنا ہے اور کس پر نہیں چلنا ہے۔ دہلی کی ایک سماجی کارکن فقرہ صدیقی نے تسنیم کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بتایا کہ انہیں (علماء کو) بنیادی حقیقت کو سمجھنا چاہیے۔ کیا ہندوستان میں دفاتر جانے والی ہزاروں خواتین کو کام سے روکنا ممکن ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ اس قسم کے متنازعہ آراء کے اظہار سے کس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک ایسے وقت جب کہ ہندوستانی مسلمان غربت، ناخواندگی اور پسماندگی جیسے ناسازگار حالات کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں ایسے میں مماثل فتووں سے ہم نے جو ترقی کی ہے وہ معکوس ہو جاتی ہے۔ اس بات کا اظہار صدیقی نے آئی اے این ایس سے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ حجاب کا استعمال ایک سطحی بات ہے اس بات کا انحصار آپ کے عزائم پر ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک حدیث کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ بلاشبہ تمہارے اعمال کا دارومدار تمہاری نیتوں پر ہے۔ صدیقی نے سوالیہ انداز میں کہا کہ برقعہ پہننے کے باوجود اگر آپ غیر اسلامی سرگرمیوں کا ارتکاب کرتے ہیں تو آپ ایک متقی مسلمان نہیں کہلا سکتے ہیں۔ (روزنامہ منصف ۱۸رمئی ۲۰۱۰ء)

دارالعلوم فرنگی محل کا فتویٰ

لکھنؤ۔ 18رمئی (پی ٹی آئی) دارالعلوم دیوبند کی جانب سے یہ فتویٰ جاری کئے جانے کے بعد کہ خواتین کا دفاتر میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا اوران کے خاندانوں کے لیے ان کی آمدنی قبول کرنا غیر اسلامی ہے۔ شہر کے ایک دینی مدرسہ نے کہا ہے کہ مسلم لڑکیوں کی تعلیم نہ صرف اہم بلکہ لازمی بھی ہے۔ دارالعلوم فرنگی محل کے مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے قرآن وحدیث کے حوالے سے بتایا کہ ہر مسلمان کے لیے تعلیم حاصل کرنا فرض ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ یہ فتویٰ ایک خاتون ہما خواجہ کے استفسار پر جاری کیا گیا جنہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں وضاحت طلب کی تھی۔ دارالعلوم

کے ناظم نعیم الرحمن نے یہ بات بتائی۔اس فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ انسان سماج میں علم کا نور پھیلانے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔شریعت میں حصول تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔کوئی بھی شخص جو اپنی بیٹیوں یا بہنوں کو تعلیم دلاتا ہے اور انہیں زیور ادب سے آراستہ کرتا ہے، ان کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے اور ان کی شادی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، جنت میں جائے گا۔اس فتویٰ میں کہا گیا کہ اسلام میں نہ صرف اپنے بچوں کو تعلیم دلانے بلکہ اپنے ملازمین کے بچوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور دیا ہے۔فتویٰ میں کہا گیا کہ ہر قیمت پر اپنی بیٹی کی مناسب تعلیم کو یقینی بنانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔دارالعلوم نے کہا کہ ناخواندگی ہی مسلمانوں کی پستی وزوال کی اہم وجہ ہے۔دینی ودنیوی تعلیم میں تخصیص کرتے ہوئے عصری علوم کو ثانوی اہمیت دینے والے علماء کرام کی جانب سے مسلم لڑکیوں کی اہمیت پر زور دیا جانا انتہائی اہمیت کا حامل رجحان ہے، جبکہ بالعموم ان پر رجعت پسندی وقدامت پسندی اور بنیاد پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔(روزنامہ منصف ۱۹ر مئی ۲۰۱۰ء)

دارالعلوم دیوبند جیسے دینی واسلامی ادارہ نے ـــــ جس کے قیام کا مقصد ہی ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے دین وایمان کا تحفظ ہے، اور جس کے غیرت مند وجفاکش علماء ومشائخ نے ایک طرف اپنی سو سالہ جدوجہد، ایثار وقربانی کے بعد ملک کو آزادی کے شرف سے مشرف کیا، اور دوسری جانب ڈیڑھ سو سال سے مسلسل ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے دین وعقیدہ اور اخلاق کے تحفظ کے لیے تحقیق، تصنیف اور تبلیغ کے کام میں مشغول ومصروف ہیں ـــــ اگر مسلمانوں کو حرام خوری، بے پردگی، بے حیائی وبرہنگی اور مرد وزن کے آزادانہ اختلاط (جس کی بدترین شکل کال سنٹرز ہیں) سے روکنے کے واسطے مسئلہ بتلا کر اپنا شرعی فریضہ ادا کیا تو کیا بُرا کیا؟ سماج کے تمام انسانیت نواز طبقوں کو اس کی حمایت وتائید میں ہم آواز ہو جانا چاہیے تھا یا موضوعِ بحث بنا کر فتویٰ کی تنقیص اور جگ ہنسائی کا سامان فراہم کرنا؟

سلمان خورشید جیسے مذہب بیزار منسٹر، جاوید اختر جیسے بے دین نغمہ نگار، زلفی سید جیسی ماڈلسٹ، فرزانہ تسنیم اور فقرہ صدیقی جیسی فیشن ایبل مہیلائیں جن کی ساری زندگی دین سے دور اور آزاد ماحول میں گذری ہو وہ اسلامی احکام پر تبصرہ کا کیا حق رکھتے ہیں؟ یہ میڈیا کی

اپنی سوچ ہے کہ ایک خالص شرعی و اسلامی مسئلہ کو فلم اسٹاروں، سرکاری وزیروں اور خود اس غلطی میں مبتلا لوگوں سے رجوع کر کے ان کے ردِ عمل کو بمقابلۂ مفتیان کرام اس طرح پیش کر رہے ہیں جیسے دونوں مساوی آراء ہوں۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

ان نیوز میں خط کشیدہ عبارات دوبارہ ملاحظہ کیجئے اور سوچئے کہ کیا چند برس پہلے کسی کلمہ گو کو اسلامی احکامات کے بارے میں اس قدر رکیک تبصرے کرنے کی جرأت ہو سکتی تھی؟ اور اگر کوئی بدنصیب کرتا بھی تو کیا مسلمان انہیں گوارا کرنے کی ہمت کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں! لیکن ان خبروں میں اسلام کو ''عصری مذہب'' کہا گیا، علماء کو ''مذہب کے گہرے علم سے کورا'' قرار دیا گیا، شرعی راہنمائی کو ''پاگل پن اور غیر ضروری مداخلت'' سے تعبیر کیا گیا، حجاب کے استعمال کو ''سطحی بات'' بتلایا گیا نیز ''فتووں پر عمل کرنے نہ کرنے کے فیصلے کو جاہلوں کا اپنا حق'' باور کرایا گیا۔ جب کہ قرآن مجید میں عوام الناس کو صاف طور پر پابند کیا گیا ہے کہ وہ علماء سے پوچھ پوچھ کر دین پر چلتے رہیں۔ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ تمہیں اگر نہیں معلوم ہے تو اہلِ علم سے معلوم کر لو۔ (سورۃ الانبیاء:۷) فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ اگر تمہیں کسی چیز میں اشتباہ و اختلاف ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول (یعنی کتاب و سنت کے ماہرین) کی طرف رجوع کرو۔ (سورۃ النساء:۵۹) چہ جائیکہ فلم اسٹاروں اور بے دینوں کی طرف!

انگلش میڈیا سے تو ہم کوئی اچھی توقع نہیں کر سکتے مگر افسوس اس پر ہوتا ہے کہ اردو اخبارات حتیٰ کہ مسلم اخبارات بھی اسی لَے میں لَے ملا لیتے ہیں اور ایک اسلامی و تاریخی عظیم درسگاہ کی ساکھ متاثر ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کسی بھی ادارہ کے دارالافتاء کا کام سائل کے سوال کا جواب دینا اور مبتلیٰ بہ کی تشویش کو اسلامی نقطۂ نظر اور شرعی قانون کی روشنی میں دور کر کے اس کو اپنے دین کی صحیح راہ دکھلانا ہے، تاکہ وہ

مذہبی احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب اور عنداللہ مجرم نہ ہو، سارے عالم میں مسلمان اسی ضرورت کے لئے دارالافتاء سے رجوع کرتے ہیں اور صدیوں سے مفتیانِ کرام اپنے اس فریضے کو بڑی ذمہ داری اور نہایت احتیاط سے ادا کرتے آرہے ہیں، لیکن جب سے سیاست وصحافت پر عالمی قوتوں کا قبضہ ہوگیا ہے تب سے صحافت کی آزادی برائے نام رہ گئی ہے اور ایک مخصوص رنگ اس پر غالب آگیا ہے، ادھر حکومتیں بھی ـــــ ناگفتہ بہ مصالح کے تحت ـــــ بہت حد تک عالمی قوتوں کے دباؤ میں آچکی ہیں جو کسی صاحبِ نظر وخبر سے مخفی نہیں ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی ہندوستان ہی میں نہیں پورے عالمِ اسلام میں ایک شاندار و تابناک تاریخ ہے، وہ ملتِ اسلامیہ کے دل کی دھڑکن اور متصلب وپختگی پسند ـــــ یا متبعِ سنت ـــــ مسلمانوں کی آواز وآبرو ہے، ہم مسلمان اس کی اہمیت کو خواہ نہ سمجھیں عالمی قوتوں کو اس بات کا خوب اندازہ اور اچھی طرح احساس ہے کہ برصغیر کی تسخیر علماءِ دیوبند اور مدارسِ اسلامیہ کو بے اثر کئے بغیر ممکن نہیں ہے، اور انہیں بے اثر کرنے کے لیے اُن پر عوام کا جو اٹوٹ اعتماد اور احترام تاہنوز باقی ہے اس کو ختم کرنا ضروری ہے، اس لیے یہ کام ان دشمنانِ اسلام ـــــ نام نہاد عالمی طاقتوں ـــــ کی اوّلین ترجیح ہے، جبکہ عالمِ اسلام میں ان کا یہ حربہ نہایت کارگر اور مفیدِ مطلب ثابت ہوچکا ہے۔

میرے سامنے اس وقت پڑوسی ملک میں تین صدورِ مملکت کے پی اے اور اس ملک کے سیاسی آقاؤں کو قریب سے دیکھنے اور جاننے والی معروف شخصیت جناب قدرت اللہ شہاب کی تصنیف ''شہاب نامہ'' موجود نہیں ہے، مگر حافظہ کی مدد سے اس میں مذکور ایک واقعہ نقل کرتا ہوں جس سے ہمارے دارالعلوموں کی پیداوار یعنی علماء کرام سے حکومتی ایوانوں میں پائے جانے والی ہیبت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس ملک کے کسی صدرِ مملکت نے حکومت کو ہدایت کی کہ مؤقر اور ذمہ دار شخصیات پر مشتمل ایک وفد ان ممالک کو روانہ کیا جائے جہاں اسلامی

ذہنیت کا خاتمہ کر کے دہریت ولامذہبیت کو غالب کرنے میں کامیابی حاصل کرلی گئی ہے، تا کہ وہ ان اسباب کو دریافت کرسکیں جو اس مقصد کے لئے استعمال کئے گئے، چنانچہ ایک وفد نے حکومت کی جانب سے دہریت زدہ عرب ملکوں کا دورہ کیا اور جائزہ لیا کہ ان ممالک کے باشندگان میں قدامت پسندی یعنی دینداری کا خاتمہ کر کے تجدد پسندی یعنی آزادی و بے دینی کا رجحان کس طرح پیدا کیا گیا؟ یہ لوگ دورہ کردہ ممالک میں ہر جگہ ایک ہی ''گر'' پا سکے، وہ یہ کہ ''محراب و مسند کی آزادی اور علماء و مشائخ کی بے باکی پر کسی نہ کسی طرح کنٹرول کر کے ان کا اثر سماج پر سے ختم کر دیا جائے''، چنانچہ واپسی کے بعد انہوں نے صدرِ مملکت کو رپورٹ پیش کی تو صدر نے مملکتی انتظامیہ کو ملک میں اس کا تجربہ کرنے کی باقاعدہ ہدایت جاری کردی، مگر سکریٹریٹ نے یہ حکمنامہ اس نوٹ کے ساتھ قصرِ صدارت کو واپس کردیا کہ ''جب تک ملک میں یوسف بنوری ــــــ سلام ہو ان کی روحِ مبارک کو ــــــ جیسے علماء موجود ہیں اس حکمنامہ کی تعمیل ممکن نہیں ہے۔'' سبحان اللہ! ایک عالمِ دیوبند کی غیرتِ ملّی و مذہبی کا یہ عالم ہے کہ پوری مملکت اس کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی ہے۔[1]

قصہ مختصر یہ کہ خواہ کل کی تاریخ ہو یا آج کا تجربہ! مسلمانوں پر سب سے زیادہ اثر ورسوخ اگر کسی کا ہوسکتا ہے تو وہ علماء و مشائخ کی جماعت ہے، یورپ نے گلوبلائزیشن کے جدید وحسین اور پُرفریب نام سے جہانگیری اور کشورکشائی کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اور اس میں ''تسخیرِ اسلام و مسلمین'' کے لیے انتہائی تدبر اور غایتِ تحقیق سے جو حربے اپنائے ہیں ان میں علماء اور علمی اداروں کے اعتماد کو مجروح کر کے ان کے اور عوام کے درمیان فاصلے

[1] میں نے جس وقت یہ کتاب پڑھی تھی امام الحرمین نیشاپوری یاد آرہے تھے کہ انہوں نے عید کا چاند نظر نہ آنے کا اعلان کیا تھا اور بادشاہِ وقت نے چاند کی توثیق کر کے نمازِ عید کا اعلان کر دیا تھا، مگر جب بادشاہ صبح کو عیدگاہ پہونچا تو سوائے اس کے اور اس کے چند درباریوں کے عیدگاہ میں کوئی مسلمان موجود نہ تھا، سب امام الحرمین کے اعلان کے مطابق روزہ رکھے ہوئے گھروں میں مقیم تھے، تب اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ میری کیا خاک حکومت ہے، حکومت تو اسی بوریہ نشین فقیر کی چل رہی ہے۔

پیدا کرنے کا حربہ سرفہرست ہے، اسی حربے کے ذریعہ یورپ نے پہلے عالم عرب کے مسلمانوں کی شبیہ بگاڑ دی اور اب برِ صغیر کے مسلمانوں کی لُٹیا ڈبونے کے لیے میدان میں اُتر آیا ہے، خیر! وہ تو جو بھی کریں کم ہے کہ آخر ہمارے دشمن ہیں مگر انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ گذشتہ صدی میں برِ صغیر میں جتنی تحریکیں شخصی مطالعہ اور سیلف اسٹیڈی کے ذریعہ سلفِ صالحین کی روش سے ہٹ کر وجود میں آئیں اُن سب نے بھی ـــــ خواہ کسی غرض ونیت سے ہو ـــــ یورپ کے اس حربے کی بھرپور عملی تائید اور مدد کی ہے، دنیا جانتی ہے کہ جمہور علماءِ کرام بالخصوص علماءِ دیوبند مسلمانوں کے لیے سلف کی فکری وتحقیقی اتباع سے آزاد ہوجانے سے زیادہ خطرہ کسی اور گمراہی میں نہیں سمجھتے۔ اسی لیے کسی بھی تحریک ـــــ اور دعوت کو اس شاہ راہِ مستقیم سے ذرا منحرف پاتے ہیں تو فوراً اس کا تعاقب کر کے ملتِ اسلامیہ کو اس کجی کے انجامِ بد سے باخبر کردیتے ہیں، اس لیے ان جدید تحریکوں، جدید تعلیمافتوں، جدت پسندوں اور یورپ کے اعتراضات سے خواہ مخواہ مرعوب ہونے والوں نے اپنی عافیت اور اپنی بقاء اسی میں سمجھی کہ ان علماء ہی کو سب سے پہلے نشانے پر لے کر عوام الناس کے سامنے ان کی ایسی شبیہ وتصویر پیش کی جائے جس سے وہ ناعاقبت اندیش، قوم کے بدخواہ، حالاتِ زمانہ سے بے خبر، ترقی کی راہ میں رکاوٹ، زمانہ کی رفتار سے پسماندہ، عہدِ قدیم کی بھول بھلیوں میں محبوس نظر آئیں۔ یا پھر قرآن وحدیث جیسے آسان دین پر شریعت کی ملمع سازی، فقہ کی زیادتی اور تہذیبی روایات کی پاسداری کے مجرم دکھائی دیں، اس طرح یعنی دانا دشمنوں کے ساتھ نادان دوستوں کی شرکت ونصرت نے یورپ کے اس حربے کو دودھاری کردیا ہے۔ فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِہٖ۔

(ب)
تصویر کا دوسرا رُخ!

آمدم برسرِ مطلب! حکایتِ اغیار کے بعد اب شکایتِ احباب کے لیے بھی دل بے چین

اور قلم بے تاب ہے، یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ ہمارے اکابر و اسلافِ کرام دینِ حقیقی اور تہذیبِ محمدی کے تحفظ کے لیے اپنے آپ کو ہر دور کے وسائل سے آراستہ اور ہر مؤثر اسلحہ سے مسلح رکھتے تھے، بہت سے علوم، متعدد فنون اور مختلف زبانیں انہوں نے ذاتی اور داخلی معاملات میں قطعاً ضرورت نہ ہونے کے باوجود محض خارجی حملوں اور ارتدادی فتنوں سے نمٹنے کے واسطے سیکھیں، اور بڑی عرق ریزی و جانفشانی سے سیکھیں، ان علوم و فنون کے بغیر بھی ان کا عقیدہ مستحکم اور عمل مضبوط تھا، مگر دشمنانِ اسلام کی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی نگرانی و سرکوبی ان کے حصول کے بغیر ممکن نہ تھی، بعض علماء کو اس پر اعتراض اور ان علوم سے اختلاف بھی تھا، مثلاً یونانی علوم کے عالمِ اسلام میں درآمد کرنے پر امام ابن تیمیہؒ اس قدر نالاں تھے کہ پورے وثوق کے ساتھ قیامت کے دن خلیفہ کی گرفت کا خطرہ ظاہر فرماتے تھے، مگر تاریخ گواہ ہے کہ ضمنی نقصانات سے صرفِ نظر راسخین فی العلم نے ان علوم کو یونانیوں کے عالمِ اسلام میں برآمد کردہ اعتراضات و اشکالات کو رفع کرنے اور انہی کے ہتھیار ان کی جانب پھینک کر انہیں دفع کرنے کے لیے استعمال فرمائے اور اسلام کی حقانیت پر سے شکوک و شبہات کے گھنے بادل ختم کر دئے۔

آج کے دور میں مسلمانوں کی معلومات کا ذریعہ بھی دیگر اقوام کی طرح ''میڈیا'' اور ''انٹرنیٹ'' ہو گیا ہے، جب کہ انہی آلات کو یورپ فکری الحاد، ذہنی ارتداد اور عملی و اخلاقی فساد برپا کرنے کا مضبوط ہتھیار بنایا ہوا ہے۔ اس میں اس قدر ابتلائے عام ہو گیا ہے کہ اب عوام الناس کو ان سے باز رہنے کی تلقین بے سود و بے اثر نہ سہی کم اثر ضرور ہو گئی ہے، کیونکہ عوام تو عوام خواص کی دلچسپیاں بھی ـــــ الا ماشاء اللہ ـــــ ان آلاتِ جدیدہ و عجیبہ ہی میں کھوئی ہوئی ہیں، فضلائے مدارس تک ان میں الجھے ہوئے ہیں اور بعض دعاۃِ باطل سے دبے ہوئے بھی ہیں، جو لوگ ان سے بچے ہوئے ہیں وہ یا تو اعلیٰ درجہ کے متقی حضرات ہیں جن کو واقعی شرحِ صدر نہیں ہے، یا پھر وہ لوگ ہیں جن کا انہیں بُرا قرار دینے کا مدار ان کے

مستفید نہ ہوسکنے کی مجبوری پر ہے نہ کہ تحقیق وتقویٰ پر اور کچھ ان کے مابین ہیں جو ایک طرف تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں اور ان کے منفی اثرات کو دیکھ رہے ہیں دوسری طرف اکابر کی جانب ٹکٹکی باندھے متوجہ ہیں کہ وہ اس مسئلہ کا کیا حل نکال کے دیتے ہیں اور کب دیتے ہیں؟

ایسے حالات میں ہمارے اکابر علماء اپنے رسوخ علمی اور نورِ باطنی سے تبلیغ اسلام اور دعوتِ دین کی خاطر ان ذرائع کے استعمال پر کافی غور وخوض اور مسلسل تحقیق کے بعد کوئی اجماعی فیصلہ فرمائیں کہ آیا احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے ان ذرائع کا استعمال بڑا نقصان ہے یا ان سے علاحدہ رہ کر قوم کو اہل باطل کے حوالے ہوجانے دینا بڑا نقصان ہے؟ کیونکہ اگر خطرہ سے کوئی راستہ محفوظ نہ ہو تو اہون البلیتین کی تعیین کی صورت ہی رہ جاتی ہے ۔اس وقت ادھیڑ اور نوجوان دو نسلیں ایسی ہیں جن کی اکثریت نہ علماء کے پاس جاتی ہے اور نہ ہی کتابیں پڑھتی ہے، ان کا ذریعۂ معلومات گھر بیٹھے کے یہی اسباب ہیں، اگر چہ ماضی میں اس سلسلہ میں بیٹھک ہوچکی ہے اس کے بعد پھر کوئی اجلاس نہیں ہوا، ہواؤں کی رفتار سے بدلتے ہوئے حالات اور بگڑتے ہوئے افکار واعتقادات کے تناظر میں ہماری یہ سست رفتار غور وفکر کہیں ہم کو خرابیٔ بسیار کے بعد بیدار ہونے کا مجرم نہ بنادے۔اس جگہ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ راقم عاجز ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنہیں اپنے اکابر کے حزم واحتیاط میں ایقان نہیں ہے، الحمد للہ تعالیٰ اکابر علماءِ دیوبند کے مسلکِ معتدل، ان کے تفقہ، تدین اور بلاخوفِ ملامت احقاقِ حق کا معترف بلکہ اس پر مفتخر ہے، یہ گذارش امت کے ناگفتہ بہ احوال اور دن بہ دن باطل کے حوالہ ہوتے جانے کی صورتحال کو سامنے رکھ کر اپنے اکابر کی خدمت میں بصد عز واحترام پیش ہے، اور پھر جو بھی اجماعی فیصلہ ہو عمل تو اسی پر کرنا ہے۔

دوسری ضروری بات ان حالات کے مقابلے کے لئے جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ علماءِ کرام کو انگریزی زبان سیکھنے کی طرف توجہ دینی چاہیے، کسی زمانہ میں غاصبانِ ملک اور

دشمنانِ دین کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اسلافِ کرام کو اس سے بُعد واجنبیت بلکہ نفرت بھی تھی تو یہ نفرت بے شک وقت کا تقاضہ تھی لیکن آج انگریزی ایک عالمی رابطہ کی اور تمام عصری علوم وفنون کی زبان ہوجانے کی وجہ سے مستحقِ توجہ ہوگئی ہے، بالخصوص ہمارے ملک میں شہروں سے لے کر دیہاتوں تک انگلش میڈیم اسکولوں کا رواج عام ہوتا جارہا ہے، جس کی وجہ سے موجودہ نسل یا تو مادری زبانوں میں کمزور ہوگئی ہے، یا پھر انگریزی آمیز زبان استعمال کرنے لگی ہے، اردو تو اب مدارس دینیہ کی چہاردیواری میں محصور ومحدود ہوکر رہ گئی ہے، خود ملک کا تعلیمیافتہ مسلم طبقہ بھی اردو ندانی انگریزی دانی کی وجہ سے علماء کے مواعظ اور تصنیفات کے استفادہ سے یکسر محروم ہوچکا ہے، جب کہ اسلامی علوم کا بیشتر حصہ اردو زبان میں ہے، جس کا پانچ فی صد بھی ابھی انگریزی میں منتقل نہیں ہوا ہے اور جو ہوا اس میں بھی اہل حق کا حصہ اقل قلیل ہے۔ ادھر اسلامی علوم کے انگریزی مصنّفین بھی نادر ہیں والنادر کالمعدوم!

گذشتہ سالوں میں جب انگریزی میڈیا کی مہربانی سے آندھراپردیش پولیس مدارسِ دینیہ میں خواہ مخواہ اور بے جا طور پر مداخلت کررہی اور اہل مدرسہ کو پریشان کررہی تھی تو اکابر علماءِ ریاست نے ایک متحدہ قوت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ''ریاستی دینی مدارس بورڈ'' کا قیام عمل میں لایا تھا، اس کے بعد مدارس کے داخلی وخارجی سلامتی کے سلسلہ میں بورڈ نے بہت سی مشاورتی نشستیں مختلف لائن ــــــ پولیس افسروں، قانون دانوں، انکم ٹیکس کے ماہروں اور میڈیا کے ذمہ داروں ــــــ کے ہمدرد آفیسرس کے ساتھ منعقد کی تھیں، مجھے یاد ہے کہ ایک نشست انگریزی اخبارات کے مسلم رپورٹرس کے ساتھ بھی ہوئی تھی، ان رپورٹرس سے ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ باوجود دینی ماحول سے علاحدہ نظر آنے کے بھی دل میں غیرتِ قومی وحمیتِ مذہبی کے جذبات رکھتے ہیں، انہوں نے دورانِ گفتگو بتلایا کہ مسلمان انگریزی میڈیا میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں، اس لیے وہ ہر طرح

مغلوب و بے بس ہوتے ہیں، جس مسئلہ کے لیے آپ لوگ اب فکر مند ہوئے ہیں ہم لوگوں نے اس کی فکر اسی وقت کی تھی جب انگلش پریس مدارس کے خلاف مخصوص رنگ اختیار کر رہا تھا، یہ بھی کہا کہ جب ہم لوگوں نے دیکھا کہ انگلش پریس میں ہر دن کوئی نہ کوئی نیوز یا کسی نہ کسی کا مراسلہ مدارس مخالف ضرور چھپ رہا ہے تو اگر چہ کہ ہم مدارس سے بالکل واقف نہیں لیکن بہ حیثیتِ مجموعی ہمیں اچھا نہ لگا، اس لیے ہم تین چار رپورٹرس نے آپس میں مشورہ کر کے ایک آفس بنایا اور ایک آدمی کو تنخواہ دے کر مستقل اس کام پر رکھا کہ وہ اخبارات کا مطالعہ کرے اور مدرسہ مخالف خبروں اور مراسلوں کو جمع کرے، ایک سال میں ایک سو سے زائد مراسلے مدارس مخالف جمع ہوئے، گویا ہر تیسرے دن ایک مرتبہ مدارس کی غلط شبیہ پیش کی گئی، ہم لوگ خود تو جواب نہیں دے سکتے تھے، اس لیے ہم نے فرضی ناموں اور پتوں سے ایسے ہر مراسلے کا جواب جس طرح بھی ہم سے بن پڑا اسلامی ہمدردی کے جذبے سے ان اخبارات کو بھیجا، اُن میں سے تین یا چند (بہر حال دس سے بھی کم) جوابات چھاپے گئے، اور باقی ردّی کی ٹوکری میں ڈال دئے گئے۔ جب ہم نے ان رپورٹرس سے معلوم کیا کہ کیا ان اخبارات سے آزادیِ صحافت اور آزادیٔ اظہار کے حوالہ سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا؟ تو انہوں نے بتلایا کہ بس یہی جواب ملتا ہے کہ اخبار اپنی پالیسی کے خطوط پر چلتا ہے، اسے کسی شخصی مراسلے کی اشاعت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کا تجربہ تو خود مسلم اخبارات سے بھی ہمیں خوب ہے کہ فضول و بے ضرورت مضامین چھاپتے رہتے ہیں لیکن بہت مرتبہ ضروری اور اہم مضامین بھی صرف اس لیے نہیں چھاپتے کہ ان کی اپنی پالیسی کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس واقعہ سے راقم صرف اس قدر بتلانا چاہتا ہے کہ ہم جو میڈیا پر کُڑھ رہے ہیں تو وہ صرف اردو اخبارات سے حاصل شدہ مواد کی بنیاد پر ہے، باقی انگریزی میڈیا کیا کچھ کر رہا ہے وہ علماءِ امت کے سامنے اکثر نہیں ہوتا۔

ایسے حالات میں پڑھے لکھے مسلمانوں کی اکثریت کے لیے انگریزی لٹریچر اور

انگریزی اخبارات یا نٹ پر موجود نام نہاد اسلامی سائٹس کے علاوہ کوئی ذریعۂ معلومات نہیں ہے۔ نتیجتاً عوام اور علماء ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں، بلکہ بہت حد تک ہو چکے ہیں، ادھر انگریزی پریس مدارس دینیہ اور علماءِ کرام کے خلاف جو طوفان بدگمانی برپا کررہا ہے وہ زخموں پر نمک کا کام کررہا ہے۔ مزید برآں تمام باطل تحریکیں ـــــ قادیانیت، عیسائیت، فتنۂ انکارِ حدیث، جماعت المسلمین اور جانے کیا کیا؟ ـــــ اپنی اپنی دعوتوں کی زبان و بیان انگریزی بنا کر عوام مسلمین کو صراط مستقیم سے منحرف کررہی ہیں، یہ لوگ الحاد تو الحاد ارتداد کے شکار بھی ہوتے جارہے ہیں، حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جو ابھی تک ہمارے مدارس کے معاون اور ہمارے اکابر علماء کے خیر خواہ تھے۔ یہ اچھا سلوک ـــــ ہے کہ وہ تو بے چارے اپنی محنت کی کمائی ہماری محنتوں کی کامیابی پر دل کھول کر لٹاتے رہے اور ہم ان کی زبان وفہم کے مطابق دین نہ پہونچا سکنے کی وجہ سے ان کے دین بلکہ ایمان کے خطرات کی نشاندہی بھی نہ کرسکے، بے شک ہم قوم کے لاکھوں بچوں کو حافظِ قرآن اور عالمِ دین بنانے کا فریضہ ادا کررہے ہیں، مگر عالم اگر قوم کی زبان ہی سے بے خبر ہو تو قوم کے حق میں کس کام کا ثابت ہوسکے گا؟ آخر لِیُبَیِّنَ لَهُمْ ہی کی خاطر تو بندوں کا مالک اپنے رسولوں کو بِلِسَانِ قَوْمِهٖ بھیجتا رہا، اور اسی احسان و اہتمام کو ان پر اتمامِ حجت قرار دیا، آج مدارسِ دینیہ میں نہ علاقائی زبانوں پر توجہ ہے اور نہ ہی عالمی زبان کی جانب کوئی اعتناء ہے، نتیجتاً ہمارے فضلاء اچھے مدرس، اچھے مقرر اور اچھے عالم ہونے کے باوجود مسجد و مدرسہ کے باہر کی دنیا میں اپنا پیغامِ حق اور اکابر کے مسلکِ معتدل کو کما حقہ پہونچا نہیں پارہے ہیں، آج بڑے بڑے علماء اور شیوخ کے بیان میں مجمع تو نظر آتا ہے مگر یہ مجمع ان کے تلامذہ کا اور پہلے ہی سے دین پسند طبقے کا ہوتا ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اَب اچھا خاصہ ہے وہ علماء کی بھاری اصطلاحات اور کتابی اردو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اُن نام نہاد اسلامک اسکالرز کے حلقوں اور جلسوں میں بہ صد ذوق وشوق نظر آتا ہے جو کل تک ضروریاتِ دین سے بھی نابلد تھے

مگراب میڈیا کی کرم فرمائی کی بدولت مجتہدِ مطلق اور بڑے بڑے علماء کے ناقد بنے بیٹھے ہیں۔یہ بے چارے دین کے پیاسے محض زبان وبیان کے بھروسے ان جاہلوں کی خودساختہ تشریحاتِ دین سے متأثر اور ملحد ہوتے جارہے ہیں۔ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار شخصیت کااعتراف ہے کہ ”میں دنیا بھر کی کانفرنسوں اور طرح طرح کے سمیناروں میں شرکت کیا ہوں، ہر طبقہ کے علماء کو دیکھا سنا ہوں، علم کی جو گہرائی وپختگی علماءِ دیو بند میں پائی وہ کہیں نہیں دکھائی دی، بس ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ قوم کی زبان میں بات نہیں پہونچا سکتے“ اور جونام نہاد علماء پہنچارہے ہیں ان کا علم مستند و معتبر نہیں ہے۔

اس لیے ضرورت ہے کہ تمام مدارسِ دینیہ میں ابتداء ہی سے علاقائی زبان اور انگریزی کو شاملِ نصاب کیا جائے ، اور ایسے ادارے بھی ہر ریاست میں قائم کئے جائیں جن میں علماء کی ایک منتخبہ تعداد کو داخل کر کے ان کے اندر ان زبانوں میں مہارت اور تقریری وتحریری صلاحیت پیدا کی جاسکے، اس ادارہ کی نوعیت غیر سرکاری اور خالص مذہبی ہو، تا کہ ان خدشات وخطرات سے بھی حفاظت ہوجائے جو سرکاری اداروں میں پڑھنے اور قابلِ ملازمت ڈگریوں کے حاصل کر لینے والوں کے دینی میدانوں سے انحراف، دعوت وتبلیغ سے گریز اور غیر اسلامی فکر وتہذیب کے شکار ہوجانے کی صورت میں ظاہر ہوکر ہمارے لیے وجہِ تشویش و موجبِ تاسف ہوجاتے ہیں۔اور اکثر اکابر کا یہی تلخ تجربہ طلبۂ کرام کو اس طرف راغب کرنے سے بچنے کا سبب ہوتا ہے، یعنی غیور وحمیت مند اکابر اپنی محنت اور قوم کے سرمایہ سے تیار اس دینی کھیتی کو غرض مند دنیا کے ہاتھ لگ جانے اور اپنے اور پرایوں کے بگاڑ کا سبب بن جانے کو قطعاً گوارا نہیں فرماتے ، لیکن غالب امید ہے کہ اگر اس قسم کے انسٹیٹیوٹ خود اکابر علماءِ کرام کی نگرانی وسرپرستی میں زبان برائے زبان کے منصوبے کے تحت چلائے جائیں اور ساتھ ہی ان کی دینی وفکری تربیت بھی کی جاتی رہے تو انشاء اللہ یہاں کے فارغین خدمتِ دین و مسلمین ہی کا کام سرانجام دیں گے اور حطامِ دنیا ان کی نظر میں خدمتِ

دین و مسلمین کے مقابلہ میں چنداں وقعت کی چیز نہ ہوں گے۔

تیسری بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ ہر ریاست کے کسی اہم مدرسہ سے اس ریاست کی مقامی زبان میں ایک کم از کم پندرہ روزہ مجلہ نکلنا چاہیے جو منتخب ملکی و عالمی خبروں کے علاوہ اہلِ حق کی نمائندگی کرنے والے دینی ضروری مسائل پر مشتمل ہو، اس میں اہل حق کے مراکز و مدارس اور علماءِ کرام کے سلسلہ میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا بھی سخت نوٹ لیا جائے۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند سے جہاں اردو اور عربی کے مجلّات صادر ہوتے ہیں وہیں انگریزی کا ایک پندرہ روزہ جریدہ نکالا جائے، جس کا ادبی معیار بھی عمدہ ہو، ہمارے ایک بزرگ پروفیسر ڈاکٹر عبدالمجید نظامی صاحب بتلارہے تھے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تقریباً ہر پروفیسر کے نام لندن سے قادیانیوں کا انگریزی مجلہ پہونچتا ہے، اور وہ لوگ اس کو اہتمام سے پڑھتے ہیں، بعض مسلمانوں کو توجہ دلانے پر انھوں نے جواب دیا کہ ''ان کے مذہب سے ہمیں کوئی تعلق نہیں صرف زبان کے معیار سے استفادہ کرنے کے لیے پڑھتے ہیں'' اس سے معلوم ہوا کہ مضامین اور زبان کا معیار بھی قبولیت میں مؤثر ہوتا ہے۔ ان ہر دو رسالوں کے لیے تمام اہلِ مدارس متفقہ طور پر حلقۂ اشاعت کو وسیع تر بنانے اور ہر طبقہ تک پہونچانے کی مخلصانہ سعی کریں۔ اگر دارالعلوم یہ اقدام کرتا ہے تو انشاء اللہ ریاست آندھرا پردیش میں اس کی ممبر سازی اور استفادہ کنندگان کے حلقہ کو وسیع کرنے کی اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر میں ذمہ داری لیتا ہوں، بشرطیکہ یہ کام بہتر معیار پر سرانجام پائے۔

یہ چند تجاویز ہیں جوامتِ مسلمہ بالخصوص جدید تعلیمافتہ طبقے کی فکری الحاد اور ملکی میڈیا کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر ذہن میں آئیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو ہمارے اکابر کی تائید اور اہل خیر کا تعاون ان حضرات کو نصیب ہوجائے جو ان کاموں کی اہلیت رکھتے ہوں اور اگر اس میں خیر نہ ہو تو ان سطور کے راقم کو معاف فرمائے، قارئین کو متاثر ہونے سے بچائے۔ آمین

(اداریہ جون ۲۰۱۰ء)

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یورپ کے لوگ انسانوں کو ڈارون کے عقیدہ کے مطابق ''بندر'' کی نسل سمجھتے ہیں، اتفاق سے ان کے کیلنڈر کی ابتداء بھی اردو تلفظ اور انگریزی لہجے کے مطابق ''جانوری'' ہی سے ہوتی ہے، وہ اگر اپنی تہذیب وثقافت اور کلچر میں اوّل تا آخر حیوانیت کا مظاہرہ کریں اور اسی کو نمایاں مقام دیں، عورتوں مردوں کے محل وعمل میں تفریق نہ کریں، تنگ لباسی، نیم لباسی بلکہ بے لباسی پر فخر کریں، بے حیائی وبے حجابی کو باعثِ افتخار سمجھیں، ہم جنسی وہوس پرستی کو حقِ انسانی وآزادی شمار کریں، سڑکوں بازاروں اور پارکوں میں بے محابا بوس وکنار بلکہ شہوت رانی کرتے پھریں، عریاں تصاویر، عریاں مناظر اور عریاں مجسموں کو اپنے کلچر کا جز بنالیں بلکہ از راہِ خیر خواہی ـــــ یا بدخواہی ـــــ دیگر اقوام کو بھی اسی کلچر اور اسی بہیمانہ تہذیب کا خوگر دیکھنا چاہیں اور ذرائع ابلاغ کا بے جا استعمال کر کے اس کی طرف مائل کرنے لگیں اور اس کے نتیجے میں بعض مشرقی اقوام بھی اس جانورپن پر رال ٹپکانے اور ان کا تھوکا ہوا چاٹنے لگیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟

تعجب تو جب ہوتا ہے اور حیرت وغیرت سے زمین میں گڑھ جانے کو جی تب چاہتا ہے جب کہ اپنے کو خلاقِ اکبر کے مبارک ہاتھوں سے پیدا کئے جانے والے ''آدم (علیہ السلام) کی نسل اور اولوالعزم پیغمبر آدمِ ثانی سیدنا نوح (علیہ السلام) کی اولاد تسلیم کرنے والے ہم مسلمان بھی اسی حیوانیت کے رسیا اور اسی جانورپن کے دلدادہ بن کر جینے کی ہوس کرنے لگتے ہیں، آج اکثر مسلم نوجوان جنس پینٹوں میں اگلے پچھلے قابلِ شرم اعضاء کو مٹکاتے اور جانوروں کی

طرح سب کو دکھاتے پھر رہے ہیں، تنگ اتنے کہ جیسے ٹانگوں پر کور چڑھا دیا گیا ہو، سرینوں پر پھول بوٹے گاڑھے جارہے ہیں اور اب تو ایسے جینس آگئے ہیں کہ کمر تک بھی نہیں جاتے آدھی سرین پر ختم ہو جاتے ہیں، جرکنوں پر فلمی ڈیلاگس یا یہودی کمپنیوں کے ایڈ ورٹائز ہوتے ہیں، یا پھر خوفناک جانوروں کی تصویریں چھپی ہوتی ہیں، لوگ اسی لباس میں کالجوں تھیٹروں میں جارہے ہیں اسی میں بارگاہِ خداوندی میں حاضری دے رہے ہیں، سر سے لے کر پیر تک یورپین کلچر میں ڈوبے ہوئے اور صبح سے شام تک ـــــ اداکاروں کے ادا وانداز کی نقلوں میں لگے ہوئے ہیں، کسی پہلو اور کسی ادا سے مسلمان نہیں معلوم ہوتے، نہ تعلیم کا شوق نہ کسی کمال و ہنر کے حاصل کرنے کی فکر، بس موبائیل فون، ہیرو ہونڈا اور کسی سڑک چھاپ لیلیٰ کی محبت کو سرمایۂ زندگی بنائے ہوئے ہیں ـــــ سوائے ان کے جو کسی نہ کسی درجہ میں دین اور دین والوں سے وابستگی رکھے ہوئے ہیں ـــــ یہی حال مسلم لڑکیوں کا ہے، بلکہ ان کا حال تو دن بہ دن مردوں سے ناگفتہ بہ ہوتا جارہا ہے، ان کے سر سے ڈوپٹہ تو کبھی کے اتر گیا تھا، اب آستینیں بھی چھوٹی ہوتی ہوتی بالکل ختم ہو گئی ہیں، گریباں بڑے ہوتے ہوتے آدھے سینے اور آدھی پیٹھ تک پہونچ گئے ہیں، کپڑے نفیس ورقیق ہوتے ہوتے جسم کو جھلکانے لگے ہیں، یہ غربا و متوسطین کا حال ہے، متمول طبقے کی بہو بیٹیاں تو جینس اور ٹاپس اور اس کے علاوہ بھی ناقابلِ بیان قسم کے ملبوسات میں کچھ ملبوس کچھ برہنہ بازارِ عشق میں دعوتِ نظارہ دیتے اور دادِ حسن و جمال وصول کرتی پھر رہی ہیں، غیروں کی طرف بلا تکلف مائل ہوتی اور انہیں پوری بے حیائی سے اپنی طرف مائل کرتی ہوئی حدیث کے مطابق جنت کی خوشبو سے محروم اور جہنم کے گڑھوں میں ذلت ورسوائی سے پڑے رہنے کی تیاریاں کر رہی ہیں، یہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے نام پر گھروں سے نکالی گئی ہیں اور ستم یہ ہے کہ ماں باپ کی خوشی و مرضی سے نکالی گئی ہیں، حد یہ ہے کہ غیر لڑکوں کے ساتھ بلا تکلف موٹر سیکلوں پر بیٹھی پارکوں اور ہوٹلوں کی تفریح کا لطف لے رہی ہیں، اور اب تو جگہ جگہ سے یہ اطلاعات ہیں کہ غیر مسلم لڑکوں کا فرش بن کر ان کی نارِ شہوت بجھانے کا سامان

فراہم کررہی ہیں، ہندوستان تو ہندوستان ہے تقریباً تمام مسلم ملکوں کا یہی حال ہوتا جارہا ہے کہ اسلامک کلچر اور دینی تہذیب کا جنازہ تو پہلے ہی نکل چکا تھا قومی امتیاز اور وطنی پہچان کی بندشیں بھی ڈھیلی پڑتی جارہی ہیں، گویا تہذیبی وحدت کا اسرائیلی خواب پورا اور گلوبلائزیشن کی صہیونی تمنا پایۂ تکمیل کو پہونچانے میں مسلمان جانے یا انجانے شریک ہیں بلکہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ایسے حالات میں دردمند دلوں اور غیر تمند سینوں کی نگہِ امید مشرقی تہذیب کے احیاء اور مغربی کلچر کے انسداد کے لیے اگر کسی پر اٹھ سکتی تھیں تو وہ مذہب کے متوالوں اور قانون کے رکھوالوں پر اٹھ سکتی تھیں، مگر افسوس! کہ ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے'' کے مصداق اس وقت دینی رہنماؤں کی صورتحال یہ ہے کہ جو مخلص اور سچی وساچی راہِ اسلام دکھلانے والے علماء ہیں وہ اگرچہ بدتہذیبوں کی اس یلغار پر فریضۂ امر و نہی برابر ادا کررہے ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کا مغرب زدہ اور جدید تعلیمیافتہ طبقے پر کوئی خاص اثر نہیں ہے اور جو ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے،[1] ان کے برخلاف جن نام نہاد اسلامک اسکالروں اور خودساختہ علماؤں کا اس طبقے پر اثر چلتا بلکہ میڈیائی قوت سے چلایا جاتا ہے وہ قوم کو خالص اسلامی ماحول سے وابستہ کرنے اور مذہبی قدروں کے ساتھ سختی سے جوڑے رکھنے میں سنجیدہ نہیں ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو وہ مذہبِ اسلام میں کسی خاص تہذیب کی پابندی یا ثقافتی امتیاز کے ضروری ہونے ہی کے منکر و مخالف ہیں۔ چنانچہ اپنے سے متأثر طبقۂ مسلمین کو متوارث کلچر کی طرف کبھی توجہ نہیں دلاتے، الٹا اپنے قول و عمل سے تہذیبی رعایتوں اور ثقافتی امتیازوں کے مسئلہ کو خاطر میں نہ لانے، اسے گذرے ہوئے زمانہ کی عصبیتِ جاہلہ سمجھنے اور دقیانوس علماء کی مجذوبانہ بڑ قرار دینے کی ترغیب دیتے اور وقتاً فوقتاً تحریر و تقریر کے دوران بڑے خوبصورت انداز میں ان کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

---

[1] ایسا ہوجانے میں کچھ داخلی خامیوں اور بہت کچھ خارجی سازشوں کا دخل ہے جس کی تفصیل مستقل مضمون کی متقاضی ہے۔

مثال کے طور پر ملک میں جدید تعلیم یافتہ طبقے بالخصوص نوجوانوں میں مقبول اور کثیر الاشاعت ماہنامہ **YMD** بنگلور کا سوال وجواب والا حصہ پیش کیا جاسکتا ہے، یہ کالم جن صاحب کے ذمہ ہے ان کے تفقہ، اجتہاد اور استنباطِ احکام کی نظیر ملنی مشکل ہے، ان کے جوابات سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ تہذیبِ اسلامی کی اہمیت کو ختم کرنے اور سلفِ صالحین کے محتاط طرزِ عمل کو مٹانے اور ایک آزاد اسلامی معاشرہ (لبرل اسلام) بنانے کی گویا مہم لے کر کھڑے ہوئے ہیں، فقہاءِ اسلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ازلی بیر ہے، اس کے برخلاف قرآن وحدیث کے مطالعہ سے جو اُن کے ذہن میں بات آجائے ان کے نزدیک وہی حجتِ شرعیہ ہے۔ چند فتاویٰ ملاحظہ ہوں:

☆ عورت کے جینس اور ٹاپس استعمال کرنے کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

"برقعہ کے اندر، گھر کے اندر اور محرموں کے درمیان استعمال کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔" (ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ)

موصوف نے اس لباس ـــــ جس کو "لباسِ بے لباسی" یا "لباس کے نام پر داغ" کہنا زیادہ مناسب ہے ـــــ کے مذکورہ بالا مواقع میں استعمال کے ممنوع اور بُرا نہ ہونے بلکہ بالکل جائز ہونے کی مفصل وکالت کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے:

"زیادہ سے زیادہ اس کے استعمال کو ناپسندیدہ کہا جاسکتا ہے"

جواز کی حمایت ووکالت کے بعد اس نصیحتِ صوفیانہ کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ موصوف دنیا کے حالات سے ناواقف تو نہیں ہونگے، سائل کے ماحول سے بھی بے خبر نہیں ہونگے، اس وقت جینس اور ٹاپس جو عورتیں پہن رہی ہیں، چاہے برقعے کے اندر چھپا کر ہو یا محرموں کے سامنے دکھا کر وہ عورتیں کس قدر فحش اور شہوت انگیز ماحول بنائی ہوتی ہیں، لباس کے لیے "شرٹ شلوار" کی تخصیص نہ کی جائے تب بھی اسلامی تہذیب اور مطالبۂ ستر پوشی کی کوئی خصوصیت تو ہونی چاہیے، یہ اسکالر صاحب جنس اور ٹاپس جیسے بے ہودہ لباس

کی ـــــ جس سے لڑکیاں مختلف رنگوں کی جانور نظر آ رہی ہیں ـــــ حمایت کرنے کے بجائے شرعی مطالبات کے مطابق ڈھیلے ڈھالے اور شہوتِ ہوس کو نہ بھڑکانے والے لباس کی طرف کوئی اشارہ تو کرتے! کیا انہیں نہیں معلوم کہ جس لباس کی سائل بات کر رہا ہے اس میں عورتیں سرینیں مٹکاتی، چھاتیاں اور پیٹ اور نیچے تک کا جسم نمایاں کرتی ہوئی ہر طرف گھوم پھر رہی ہیں، اس لباس کی غیر ضروری تحدیدات وتشریحات کے ساتھ حمایت اسلام تو کجا شرافتِ انسانی بھی نہیں کرسکتی۔ مگر آہ! کیا کیا جائے اس خود سری کو کہ علماء ومفتیوں کو بے وقوف سمجھنے والے یہ اسلامک اسکالرز نہ اسلام کے مزاج سے واقف ہیں نہ تہذیب کی حد بندیوں سے آشنا اور نہ ہی سلفِ صالحین کی حزم واحتیاط کے قدرداں! اس لباس کی جو جھلک میں نے دکھائی ہے موصوف بھی غالباً اس کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ اخیر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے صرف اس قدر تنبیہ کی ہے کہ

"ایسے لباس کے ساتھ نامحرموں کے سامنے نہ آنا چاہیے"۔

☆ ٹوپی پہننے اور پتلون ٹخنوں سے اونچا رکھنے کے سلسلہ میں کسی سائل کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

"پتلون کو ٹخنے سے اوپر رکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ تکبر کی وجہ سے (پتلون کو) نیچے کرنا یا اوپر کرنا ممنوع ہے"

اسی سلسلہ میں تکبر کی مذمت بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

"کتنے لوگ ایسے ہیں جو شلوار تو نصف پنڈلی تک رکھتے ہیں مگر ان کی چال متکبرانہ ہوتی ہے" (مئی ۲۰۰۸ء ص: ۸)

غور کیجئے کہ سوال نبی کریم ﷺ کے ایک دائمی عمل کی اہمیت اور گناہِ کبیرہ ـــــ جس کے بلا تکبر بھی گناہ ہونے پر محقق علماء کا اتفاق ہے ـــــ کی بابت ہے، اور جواب تکبر اور اس سنت پر عمل کرنے والے بعض متکبرین کی مذمت کا دیا جا رہا ہے۔ آخر ان کو پابندِ سنت طبقہ سے کیا عداوت ہے؟ اور انہیں کیسے پتہ چلا کہ اس سنت پر عمل کرنے والے متکبر ہوتے

ہیں، اور فرض کرو کچھ لوگ ایسے ہوں گے بھی تو ان کی وجہ سے سنت کی سنیت وعظمت ختم تو نہیں ہو جائے گی؟

☆ گانے گانے، موسیقی سننے، ڈیانس کرنے، تیرنے، مخلوط طور پر تعلیم حاصل کرنے اور ڈیٹنگ (متعہ یعنی موقتی نکاح جیسا ایک بیہودہ فیشن) کے بارے میں سائل کے استفسار پر موصوف نے پہلے یہ مختصر جواب دیا ہے:

"سوال میں مذکورہ اعمال میں سے ایک کے علاوہ سب جائز ہیں"

پھر اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

"● گانا انسانی ضرورت اور اظہارِ خوشی کا ایک ذریعہ ہے، ہر شخص صبح کے وقت کچھ نہ کچھ گا ہی لیتا ہے، صحابہ بھی جنگ کے موقعہ پر سفر کے دوران گانے گاتے تھے، ● گانے چونکہ میوزک کے ساتھ ہوتے ہیں، اس لیے میوزک بھی جائز ہے، میوزک کی دو قسمیں ہیں، ایک میں لذت ہے دوسری میں نشہ کی سی کیفیت ہوتی ہے، پہلی جائز دوسری ناجائز ہے۔ ● تیرنا اسلام میں پسندیدہ ہے، ہمارے نبی ﷺ نے کمسنی ہی میں سیکھ لیا تھا۔ عورتیں بھی عورتوں کے ہمراہ تیر سکتی ہیں۔ ● جہاں عورتوں کے لیے علاحدہ کالج کا انتظام نہ ہو وہاں مخلوط تعلیم کی اجازت ہونی چاہیے، البتہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے پارٹیشن کا انتظام ہونا چاہیے، ایسی مخلوط کلاس کو معمر مرد وخواتین مخاطب بھی کر سکتے ہیں۔ ● ڈیٹنگ کبیرہ گناہ ہے۔ ● ناچنا جو مخلوط طور پر ہو اور جو وائر یا پائپ والے آلات کی دھن پر ہو ممنوع ہے، اس کے بغیر درست ہے، جیسا کہ صوفیاء کے ہاں ہوتا ہے۔" (اکتوبر ۲۰۰۸ء ص:۷، ۸)

اس سوال وجواب میں بھی ذرا غور کیجئے کہ سائل نے اپنی اور اپنے ہم عمر نوجوانوں کی طرف سے اپنے ماحول میں رائج ان برائیوں کا شرعی حکم معلوم کیا ہے، موصوف اس کے جواب میں کوشش کر رہے ہیں کہ ان تمام سماجی برائیوں کے لیے گنجائش فراہم کریں۔ جواب دینے والے "اسلامک اسکالر" کسی صحرا میں یا آسمانوں میں تو نہیں رہتے ہونگے، انہیں نوجوانوں اور کالج میں زیر تعلیم بچوں کے سوال میں گانوں، میوزک، ڈیانس، سوئمنگ اور کوایجوکیشن سے کیا مراد ہے خوب معلوم ہوگا۔ مگر وہ کس چالاکی سے غازیانہ نظموں،

سپاہیانہ ترانوں اور فلمی گانوں کو ایک بنا رہے ہیں، موسیقی کے آلات واثرات کی تفصیل میں بہک رہے ہیں، ڈیانس کو صوفیاء کے وجد پر قیاس کر کے اس کی ہمت افزائی کر رہے ہیں، صحت اور ورزش کے لیے تیراکی خیر اچھی چیز ہے لیکن پوچھنے والے جس قسم کی سوئمنگ کرتے ہیں جواب میں اس کے منکرات سے خبردار کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں، ہاں! شارٹ پہن کر تیرنے کے بارے میں اتناذکر ضرور کیا ہے کہ ''اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی''۔

مختصر یہ کہ یہ ساری حرکتیں جو سوال میں درج ہیں نوجوانوں میں انتہائی بے ہودگی اور بداخلاقی کے اسباب بنے ہوئے ہیں لیکن موصوف کے جواب میں کچھ زیادہ قباحت کی بات نہیں ہے، ان کے نزدیک عرفی اور لغوی مصداقوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ سائل کوئی محقق نہیں ہے جو آپ سے تحقیقی کلام کر رہا ہے، وہ سماج کے آزادی پسند نوجوان ہیں جوان خرافات کا اسلامی واخلاقی موقف معلوم کر رہے ہیں، یہ اسلامک اسکالر جب فتویٰ نویسی کے احکام وآداب سے تک واقف نہیں ہیں، مزید برآں علماء کو کوتاہ اندیش سمجھتے ہیں تو ان سے ایسے لغو وعامیانہ جواب کے علاوہ توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے؟

☆ ایک انجینئرنگ کا طالبِ علم کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوجانے کے بعد پشیمانی محسوس کرتے ہوئے —— کہ ایک مسلمان کو ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے —— موصوف سے رجوع کر کے پوچھتا ہے کہ کیا ایسی محبت کی گنجائش ہے؟ جواب میں ایک لمبی لن ترانی کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

> "(۱) اگر آپ نے اس سے باقاعدہ ملاقات نہیں کی، اتفاقاً نظر آگئی اور آپ اس کی محبت میں مبتلا ہوگئے تو اسلامی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے (۲) اور اگر آپ نے کسی لڑکی کو نشانہ بنا کر باقاعدہ ارادہ کر کے اس سے تعلقات ومراسم بڑھانے شروع کئے، اس سے تنہائی میں ملاقات کی پھر اس کی محبت میں مبتلا ہوگئے تو یہ اسلام کے خلاف ہے، (کیونکہ) یہ ناجائز تعلق آگے چل کر آپ کے لیے مصیبت بن سکتا ہے (۳) اگر کسی لڑکی سے آپ کی ملاقات ہوئی، اور وہ متعدد پہلوؤں سے آپ کو بھلی لگی اور آپ نے اسی سے شادی کرلینے کا

ارادہ کرلیا تو ایسے تعلق کو محبت میں مبتلا ہونا ہی نہیں کہتے۔" (دسمبر ۲۰۰۸ء ص:۸)

تصور کیجئے! آج کے دور کا ماحول ہے، کالج لائف میں ایک ۲۰ رسالہ نوجوان کو ایک ۱۸ رسالہ لڑکی سے محبت ہوگئی ہے تو یہ کس قسم کی محبت ہوگی؟ پھر اس کا ضمیر کہہ رہا ہے کہ تو مسلمان ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے، اس لیے یہ حرکت تیرے لیے مناسب نہیں ہے، اُدھر نفس کہہ رہا ہے کہ نہیں اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ پاکیزہ محبت ہے، بے چارہ طالبِ علم دین کے علم اور حدودِ شرع سے ناواقف آپ سے اپنے اس عمل کے بارے میں شرعی راہنمائی کا متمنی ہے۔ آپ جواب میں محبت کا فلسفہ بیان کررہے ہیں اور اس بداخلاقی کو اس طرح پیش کررہے ہیں کہ کم ہمتوں کو بھی ان حرکتوں کی ہمت ہوجائے۔

☆ عمامہ سے متعلق سوال پر کہ آیا نماز میں اس کا اہتمام باعثِ ثواب ہے؟ جواب دیتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں:

"بہت سی روایات سے عبادت کے وقت عمامہ کے استعمال کا مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ تمام روایات ناقدین کے نزدیک درجۂ صحت سے فروتر ہیں"

اس کے بعد حسبِ معمول اپنا عقلی فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جس زمانہ میں سب مسلمان جبہ اور شلوار پہنا کرتے تھے اس زمانہ میں علماء عمامہ کو بہ طور امتیاز کے زیب سر کیا کرتے تھے، لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ عمامے ختم ہوگئے اور جو عماموں کے نیچے تھا وہی باقی رہ گیا (یعنی سر) اس لیے نہ ٹوپی کو کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہے اور نہ ہی عمامے کو" (ستمبر ۲۰۰۶ء ص:۸)

عمامہ باندھنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت ہے، اس کا سنت ہونا اہل کو چھوڑیئے عوام الناس میں بھی معروف ہے، بے شک علماء کرام نے اس کا اہتمام کیا مگر موصوف کی یہ تحقیق کہ عوام سے اپنے کو ممتاز رکھنے کے لئے کیا بالکل واقع کے خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ علماء کا یہ اہتمام سنت کی اتباع میں تھا، موصوف نے بڑی چالاکی سے اس سنت کو علماء کی طرف منسوب کرکے وہ بھی کسی عارضی مصلحت کا من گھڑت حوالہ دے کے اس کی سنیت کا تصور ختم

کرنے کی کوشش کی ہے، اس طرح یورپ سے درآید برہنہ سری کی حوصلہ افزائی کا راستہ ہموار کرلیا۔

☆ داڑھی اور اس کی مقدار کے متعلق متعدد سوالوں کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے:

"ایک طرف یہودی فلسطینیوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں، انہیں فاقوں پر مجبور کر رہے ہیں، افغانیوں پر بے رحمانہ اقتدار جما رہے ہیں، دوسری طرف داڑھی کی مقدار پر بحث ہو رہی ہے" (مارچ ۲۰۰۸ء ص: ۱۱)

دوسری جگہ:

"داڑھی کے حکم سے متعلق اضطراب پایا جاتا ہے کہ آیا داڑھی کا منڈانا حرام ہے یا مطلقاً حلال ہے" (اکتوبر ۲۰۰۶ء ص: ۱۰)

تیسری جگہ ہے:

"داڑھی کی یہ مقدار (کہ ایک مشت ہو) واجب نہیں ہے، البتہ اس قدر رکھنی چاہیے کہ مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز ہو جائے" (اکتوبر ۲۰۰۶ء ص: ۱۰)

چوتھی جگہ:

"آپ ﷺ نے مجوسیوں کی مخالفت کے لیے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے، جب کہ نہ بڑھانے پر کوئی وعید بھی نہیں سنائی، اس لیے (یہ حکم آپ کا عارضی تھا یا دائمی؟ اس سلسلہ میں) کوئی دائمی حکم موجود نہیں ہے، آئندہ بھی اس کے حل کی کوئی سبیل نہیں" (مارچ ۲۰۰۸ء ص: ۱۱)

ایک اور جگہ:

"ہمیشہ درمیانی راہ اچھی راہ ہوا کرتی ہے، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے مٹھی سے داڑھی کو پکڑ کر زائد کو نکال دیا تھا، اس لیے اگر کوئی شخص پوری ہی نکال دے حتیٰ کہ نظر بھی نہ آئے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہونی چاہیے اور نہ اس پر ہونی چاہیے جو ناف تک لمبی کرے۔" (ایضاً)

ان جوابات میں غور کریں کہ موصوف اسلامی اسکالر نے داڑھی رکھنے کی کسی بھی طرح

ترغیب نہیں دی بلکہ مکمل صاف کردینے والے کی تغلیط سے بھی منع کردیا، جبکہ بیسیوں احادیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں گھٹانے کی بار بار تاکید فرمائی ہے، اور اسی وجہ سے اس کے سنت یا واجب ہونے پر علماء کے اتفاق ہے، لیکن جب وہ علماء کو اپنی تحقیقات کے مقابلے میں کچھ سمجھیں تب نا ان کی تحقیق پر غور کریں گے، مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کی بات خدا جانے انہوں نے کہاں سے نکالی، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مثلاً پنجاب کے سکھوں کے درمیان رہنے والے مسلمان لازماً مونڈھ دیا کریں تا کہ مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز ہوجائے۔ **والعیاذ باللہ من الجھل**

☆ ایک خاتون نے معلوم کیا کہ مجھے دور کے رشتہ کے ماموں زاد بھائی سے محبت ہے، ان کا بھی اعتراف ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت ہے، یہ محبت شادی کرنے کے لیے نہیں ہے، ہم بس ایسے ہی دوست بن کر رہنا چاہتے ہیں، ہم لوگ ایک دوسرے سے دور ہیں، تو چیاٹنگ کے ذریعہ دوستی نبھائے رکھنا شرعاً مناسب ہے یا نہیں؟ جواب ارقام ہے:

> "مرد و عورت کا چیاٹنگ کے ذریعہ رابطہ ناپسندیدہ ہے، اگرچیکہ ناجائز بھی نہیں، فون یا چیاٹنگ (صوت و تحریر) کے ذریعہ جو تعلقات ہوتے ہیں وہ ناپسندیدہ روابط نہیں کہلاتے، بشرطیکہ یہ صرف سائنسی، تکنیکی یا دینی و دعوتی گفتگو پر مشتمل ہو، اور اگر فضول باتوں یا پرسنل مسائل سے متعلق ہو تو مطلق اجازت دینا مشکل ہے۔" (اکٹوبر ۲۰۰۸ء ص:۷)

یعنی پہلی صورت میں تو کوئی قباحت ہی نہیں، دوسری میں قدرے تردد ہے، جب کہ نامحرم سے اس قسم کے رابطہ کا مخربِ اخلاق اور گناہِ کبیرہ ہونا اس قدر واضح ہے کہ ایک غیر مسلم شریف آدمی بھی اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ بالخصوص پوچھنے والی خود وضاحت کر رہی ہے کہ اس تعلق کی بنیاد طرفین سے ایک دوسرے کی محبت پر ہے، کوئی دینی دعوتی تحریک نہیں۔

☆ ایک فیشن ایبل ماحول کے نوجوان نے اپنے ماحول سے متعلق —— یہ بتلا کر کہ ہاتھوں میں "کڑے" کانوں میں "رنگس" پہننے کا اور سر میں ہیروؤں کی طرح "لمبے بال" اور ٹانگوں میں پینٹ پاجامے کے بجائے "شارٹ" استعمال کرنے کا عام رواج ہے —— شرعی

صورتحال دریافت کی۔ جواب میں موصوف نے لکھا:

"نوجوانوں کا پچھلے لوگوں (یعنی اپنے بڑوں) سے الگ راستہ اختیار کرنا فطری امر ہے، لیکن رِنگس اور براس لیٹ کا استعمال فطری نہیں ہے، کیونکہ وہ عورتوں کے لیے ہیں، اس سلسلہ میں معیار نبی کریم ﷺ کے زمانہ کا کلچر ہے جو تکلفات و مصنوعات سے پاک کلچر تھا، شارٹ کا استعمال مردوں کے لیے حرام اور ممنوع نہیں ہے، البتہ وہ اتنی لمبی ہو کہ گھٹنوں تک پہونچ سکے تا کہ تشہد میں وہ کھلے نہ رہیں، البتہ اندر کے کپڑے ضرور پہنے ہوئے ہونا چاہیے، لمبے بالوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اگر داڑھی کے ساتھ ہوں تو ممنوع نہیں ہے، داڑھی منڈانے والے لمبے بال بھی نہ رکھیں۔" (اکتوبر ۲۰۰۶ء ص:۷)

بات وہی ہے کہ موصوف کے نزدیک "دین" اور "اسلام" کی تعریف میں تہذیب کا کوئی دخل نہیں ہے، وہ صرف حلال وحرام کی بات کرتے ہیں کہ یہ کام قطعاً حلال ہے، یہ کام قطعاً حرام نہیں ہے، حالانکہ حضور ﷺ نے وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فرما کر حلال وحرام کے درمیانی اعمال اور ان کا حکم بھی بتلا دیا کہ "ان کا ترک کر دینا ہی حرام میں گرنے سے بچنے کا ضامن ہے" مگر ان کی فہم تہذیبِ اسلامی، غیرتِ قومی اور امتیازِ ملی کے پہلو سے غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے، اس لیے کہ صحتِ فہم کی نعمت آدمی کو معتبر اساتذہ سے ملتی ہے شخصی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ سائل خود بتلا رہا ہے کہ میں فیشن ایبل محلہ میں رہتا ہوں، اور میرے ماحول کا یہ کلچر ہے، پھر بھی وہ حرام اور ممنوع نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں، شارٹ کے بارے میں کیا اتنا کافی ہے کہ وہ گھٹنے سے نیچا ہو اور اندر نیکر پہنا ہوا ہو؟ کیا یہ اتنے ڈھیلے نہیں ہوتے کہ موٹر سائیکلوں پر بیٹھے جا رہے ہوتے ہیں تو آدھی ران تک ہوا سے جسم کھلا رہتا ہے؟ کیا آج بھی یہ صرف غیر مسلموں اور فیشن زدہ مسلمانوں ہی کا لباس نہیں ہے؟ پھر بھی موصوف کو تشبہ بالفساق میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ آہ! ایسے ہی اسلامک اسکالرز کی بدولت یورپ کے "لبرل اسلام" کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے، سلفِ صالحین کی روش اور تہذیبِ اسلامی مٹتی جا رہی ہے، فیا للاسف۔ کاش کہ وہ اپنے ہی قول "ان امور کے سلسلہ

میں آپ ﷺ کے زمانہ کا کلچر جو تکلف وتصنع سے پاک کلچر تھا معیار ہے‘‘ اور اپنے جاری کردہ فتاویٰ کے تضاد وتناقص پر غور کر لیتے۔

یہ چند مثالیں ہیں اور وہ بھی ایک اسلامک میگزین کی ہیں، اس میگزین کی سابقہ بہت سی اشاعتوں میں ایسی بہت سی باتیں ہمارے سامنے آئیں، جن میں غور کرنے سے ـــــ کسی کی نیت پر حملہ کئے بغیر کہ وہ علیم وخبیر کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم ـــــ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ مہم ہے جس کا مقصد اس اسلامی تہذیب کا جس کا علماءِ امت صدیوں سے تحفظ کرتے آرہے ہیں قلع قمع کر کے ایک ایسا آزادانہ تصورِ اسلام پیش کیا جائے جو جدید نسل اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی پسند کے موافق ہو اور جو اسلام کے امتیازی تشخص سے گھبرانے والوں کی گھبراہٹ کو کم کر سکے۔ بے شک اس سلسلۂ جوابات میں بعض جوابات صحیح بھی ہوتے ہیں، لیکن اکثر مبہم اور مذکورہ بالا انداز کے ہی ہوتے ہیں، اور سب کے سب ’’مستند ہے میرا فرمایا ہوا‘‘ کی بدترین مثال ہیں۔

بہر حال یہ ایک مثال اس زمانے کی ناقص دینی راہنمائی کی ہے، ایسی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ میڈیا نے انہیں عوام الناس میں اسلامک اسکالر کی حیثیت سے متعارف کرادیا ہے، یہ لوگ کتاب وسنت کا نام تو لیتے ہیں کہ اس کے بغیر چارۂ کار نہیں مگر ان کو سمجھنے کے لئے سلف صالحین اور علماء امت کی ضرورت قطعاً تسلیم نہیں کرتے، اس لئے کہ ایسا کریں تو جدیدیانے کا ان کا منصوبہ ناکام ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب عوام الناس کے مقبول راہنما خائن اور تجدد پسند ہوں، اور وہ باقاعدہ طور پر تہذیبِ اسلامی کو مٹانے کیلئے کمربستہ ہوں تو معاشرہ کو بے تہذیبی ولادینی کے سیلاب سے کیوں کر بچایا جاسکتا ہے؟

جہاں تک حکمرانوں اور قانون کے رکھوالوں کا تعلق ہے تو اولاً تو وہ عصری تعلیم اور مغربی تہذیب ہی کے پروردہ ہونے کی وجہ سے مذہب کو اقوام عالم کے درمیان صرف ـــــ تفریق وشناخت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور تہذیب کو محض علاقائی وجغرافیائی حالات واثرات کا

نتیجہ قرار دیتے ہیں ـــــ جب کہ مذہبِ اسلام کے حق میں یہ خیال صحیح نہیں ہے، دیگر مذاہب میں ایسا ہوتو ہو، اسلام میں تہذیب مذہب کا جزوِ لاینفک ہے جسے کسی قیمت پر مذہب سے جدا کر کے دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ـــــ ثانیاً امریکہ اسرائیل گٹھ جوڑ کا مشترکہ دباؤ بعض مجبوریوں اور کمزریوں کی وجہ سے دیگر ممالک کی طرح ہمارے ملک پر بھی اس قدر بڑھ گیا اور بڑھتا ہی جارہا ہے کہ وہ اپنے داخلی نظام میں بھی ان خودساختہ آقاؤں کے مطالبات ومقتضیات سے انحراف کی جرأت نہیں کرسکتے، چنانچہ رہ رہ کر مقننہ اور عدلیہ میں ایسے مسائل اٹھتے رہتے یا اٹھائے جاتے رہتے ہیں جن کی غرض غور کرنے سے بس یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ملک میں نہ مذہب کی اہمیت باقی رہے نہ تہذیب کی خصوصیت قائم رہے۔ مثال کے طور پر:

☆ گذشتہ سال ملک کے وزیر تعلیم نے ''ایڈز'' کے مضر اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے پرائمری اسکول ہی سے جنسیات کی تعلیم کو شامل نصاب کرنے کی سفارش کی تھی۔

☆ ابھی چند دن ہوئے دارالحکومت دہلی کی ہائی کورٹ نے پارلیمنٹ سے سفارش کی تھی کہ ''ہم جنس پرستی'' کو قابلِ تعزیر جرائم سے خارج کردیا جانا چاہیے، جس کے بعد ملک میں دو لڑکوں کے باقاعدہ نکاح کا واقعہ بھی اخبارات کی سرخی بنا۔

☆ ابھی ابھی ملک کی سپریم کورٹ نے رادھا کرشنا باہمی تعلقات سے استشہاد کرتے ہوئے شادی سے قبل مرد وزن کے باہمی تعلقات میں کوئی قباحت نہ ہونے کا اعلان کیا تھا، جس کے بعد چیف منسٹر تامل ناڈو نے بھی اس اعلان کا علی الاعلان خیر مقدم کیا، وغیرہ۔

اب جب کہ اسلامی دعوت اور ایمانی انقلاب کے نام نہاد ٹھیکہ داروں کا حال یہ ہے اور ملک اور ملک کی روایات واقدار کے محافظین کا عالم یہ! تو ہم کس سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ

مشرقی تہذیب وثقافت پر ہونے والے مغربی کلچر کے اِن تابڑ توڑ حملوں کو روکنے میں قدامت پسند وروایت پرست ـــــ یعنی حقیقت پسند و دیانت پرست ـــــ علماء وعوام کی مدد کر کے تہذیب کی کشتی کو بد تہذیبی کے اس بھنور سے نجات دلائینگے؟

اس موقع پر شیخ سعدی رحمہ اللہ کی بیان فرمودہ ایک حکایت یاد آتی ہے کہ کسی بادشاہ کی صحت خراب ہوئی اور اس قدر بگڑ گئی کہ شفاء کی امید ختم ہوگئی، اطباء اور معالجین نے ہاتھ اٹھالئے، کسی نجومی یا عامل نے یہ واحد شکل اس کے سامنے رکھی کہ بادشاہ کی طرف سے ایک صحت مند، خوبصورت اور نوجوان آدمی کی قربانی دی جائے، اس قربانی سے شفا مل سکتی ہے۔ ایک ایسی صفات کے نوجوان کو تلاش کر کے لڑکا ڈھونڈا گیا اور اس کے ماں باپ کو اس کے عوض خطیر رقم کی پیشکش کی گئی، ان غریب لوگوں نے مال کی حرص سے مغلوب اور حکومت کے خوف سے مرعوب ہو کر اپنے بچہ کو فروخت کر دیا۔ جب یہ بچہ دربار میں پیش کیا گیا تو بچے نے آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا، بادشاہ نے خلافِ توقع اس کیفیت کو دیکھا تو وجہ دریافت کی، لڑکے نے کہا: آدمی کو کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے ماں باپ سے رجوع کرتا ہے کہ وہی اپنے بچے کے لئے سب کچھ قربان کر کے اس کو دکھ درد سے بچایا کرتے ہیں، اگر ماں باپ اس کی مصیبت دور نہ کر سکیں تو وہ عدلیہ کی کنڈی کھٹکھٹاتا اور انصاف کی توقع کرتا ہے، یہاں سے بھی مایوس ہو جاتا ہے تو بادشاہ کے مراحمِ خسروانہ سے امیدوار رہتا ہے کہ بادشاہ اپنے اثر ورسوخ اور اختیارِ کامل سے اس کی اس مصیبت کو دور کر دے گا، مگر میری صورتحال یہ ہے کہ ماں باپ نے مال ودولت کی ہوس میں اپنے لختِ جگر کو فروخت کر دیا ہے، اِدھر قاضی نے بادشاہ کی خوشنودی کے لئے میرے خون کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے، رہ گیا بادشاہ تو وہ اپنی جان کے تحفظ کے لئے کسی کی بھی جان لینے خود تیار بیٹھا ہے، اب میرے لیے زمین پر کوئی مرکزِ امید نہیں ہے اس لئے آسمان والے سے کہہ رہا ہوں کہ بجز تیرے میرا سہارا کوئی نہیں، بس اب تو ہی رحم فرما! ـــ

وہ مایوسِ تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے
جو منزل بہ منزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

ٹھیک یہی صورتحال آج مسلم معاشرہ کی زبوں حالی و بے سہارگی کی ہوگئی ہے۔

اس موقعہ پر مجھے ــــ اپنے بشمول ــــ تمام خدامِ دین اور امت کے مصلحین سے یہ کہنے دیجئے کہ ہمارے اسلافِ کرام دینِ اسلام کی حفاظت اور امتِ مسلمہ کی صلاح وہدایت کے واسطے ایسے بے نیاز اور اس قدر صلح شعار و عافیت پسند نہیں واقع ہوئے تھے جیسے ہم لوگ ہو گئے ہیں، نہایت ادب کے ساتھ کشتیِ ملت کے ناخداؤں سے عرض ہے کہ آپ اپنے علاقے کے اطراف واکناف پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے، ارتداد والحاد کی تحریکیں کس قدر سرگرمِ عمل ہیں اور ہم ان کے مقابلے کے لئے کتنے سرگرم ہیں؟ کارکنانِ باطل کی جفاکشی، عالی ہمتی، بلند حوصلگی، تحریری، تقریری اور تفہیمی مساعی، اپنی دعوت کے فروغ کے لئے ایثار وقربانی بلکہ جانثاری، اپنے امیر ورہبر کی اطاعت وفرمانبرداری، دلائل کی تحقیق وجستجو، مطالعہ ومعلومات کا ذوق، بحث ومباحثہ کی جرأت اور سلیقہ، اور ہر دوست، رشتہ دار، ساتھی، پڑوسی کو ہم فکر بنانے کے لیے دن رات جدوجہد، اس کے لئے زبانی طور پر ذہن سازی، لٹریچر کی فراہمی، پروگراموں میں شرکت کی دعوت واصرار، اپنے اکابر سے ملانے اور متاثر کرنے کی کوشش، اسی طرح محبت وسخاوت اور خلوص ودوستی کا پریشر، اور خدا جانے کتنے جتن ہیں جو الحاد سے لے کر ارتداد تک کے تمام دعاۃ اور ان کے کہول وشباب بلکہ اطفال میں تک دیکھے جا رہے ہیں، ان کی تعریف یا شکوہ تو سب کی زبان پر ہے مگر خود ان صفات سے متصف ہونے کے لئے کوئی آمادہ نہیں، یہ صفات کبھی داعیانِ حق کا امتیاز ونشان تھے مگر اب نہ معلوم ہمیں کیا ہو گیا کہ تن کوشی، نعمت پرستی، آرام پسندی، مطالعہ وتحقیق سے محرومی، جہد وعمل سے دوری، کاہلی وسستی غرض ہر وہ کمزوری وبیماری جو کسی دعوت کے داعی اور میدان کے سپاہی کو زیب نہیں دیتیں بلکہ اس کو مسترد کردئے جانے کے قابل بنا دیتی ہیں

وہ ہمارے اندر پیدا ہوگئیں اور تیزی سے بڑھتی جارہی ہیں۔

یہ میں ایک عام صورتحال بالخصوص نوجوان حفاظ علماء وائمہ اور عام دعاۃ اسلام کی بات کررہا ہوں، ــــــ یہ مانتے ہوئے کہ مامن عام الا وخص عنه البعض ــــــ اور اس کی وجہ بظاہر یہ فکری گمراہی معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے طبقہ میں طریق کو مقصود بنالیا گیا ہے اور مقصود کو فراموش کردیا گیا ہے، مدرسوں کی یہ شکل طریق ہے مقصود علم ہے، نظام ونصاب ـــ طریق ہے مقصود تحقیق واستنباط کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، صرف ونحو بلاغت طریق ہیں مقصود کتاب وسنت تک پہونچ سکنا ہے، منطق وفلسفہ طریق ہیں مقصود عقل پرستوں کے ذہنوں سے فکری آلودگی کو ختم کرنا ہے، فقہ طریق ہے مقصود عمل میں مقبولیت کی شان پیدا کرنا ہے، اسی طرح خروج فی سبیل اللہ یعنی جماعتوں میں وقت لگانا طریق ہے مقصود بنیادی دین سیکھ لینا اور مکمل دین سیکھنے کی فکر پیدا کرلینا ہے، گشتیں طریق ہیں مقصود اللہ کے بندوں کی محبت میں ان کی ہدایت وکامیابی کی جدوجہد کرنا ہے، بیعت اور پیری مریدی طریق ہیں مقصود حضوریٔ قلب اور انابت ورجوع الی اللہ کی کیفیت کا حاصل کرنا ہے، ذکر کا مخصوص انداز طریق ہے اور مقصود تعلق مع اللہ اور معیت کی شان پیدا کرنا ہے وغیرہ، مگر آج ان اعمال واشغال میں مشغول طبقہ کی اکثریت انہی کو مقصود سمجھنے اور ان کے مقصودِ حقیقی سے چشم پوشی کرلینے کی فکری گمراہی میں مبتلا ہوتی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص طریق کو مقصود سمجھتا ہے تو طریق باقی رہ جاتا ہے مگر مقصود ہاتھ نہیں لگتا۔

چاہے کوئی کتنا ہی برا مانے آج ہم اہلِ حق کہلائے جانے والوں کی اکثریت کا دین کے تینوں شعبوں ــــ تعلیم، تبلیغ اور سلوک ــــ میں یہی حال ہوگیا ہے کہ بس ہر جگہ ضابطہ کی کاروائی اور خانہ پُری کی فکر ہے، شخصی مفادات ومصالح پر آنچ نہ آنا چاہیے، قوم کا کچھ بھی بنے۔ یہ صحیح ہے کہ طاقت سے زیادہ کے ہم مکلف نہیں لیکن کیا یہ بھی صحیح ہے کہ ہماری طاقت واستطاعت مکمل لگ رہی ہے اور اس میں کوئی چوری یا کوتاہی نہیں ہورہی ہے؟۔ کسی بندے

کے سامنے نہیں کہ اس کو چکمہ دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، اللہ علیم وخبیر کے سامنے ہم اپنے ضمیروں سے اس سوال کا جواب طلب کرلیں۔ کاش! کوئی ایسی صورت ہوجاتی کہ ہمارے اندر امت کے فکروغم اور ذمہ داریوں کے احساس کی ایسی روح پھونک دی جاتی جس سے غفلت و بے حسی کا یہ جمود ٹوٹتا اور اس کی جگہ جہد وعمل کا بازار گرم ہوجاتا، اگر ایسا ہوجائے تو باطل پھر ایک دفعہ اپنی بلوں میں گھس جانے پر مجبور ہوگا اور حق کے مقابلہ سے عاجز ہوکر پناہ گاہیں ڈھونڈتا پھرے گا۔ آج جہاں جاؤ ہر خادمِ دین اور ہر دیندار کو باطل کی سرگرمیوں کا شکوہ کرتے ہوئے سنا جاتا ہے مگر ہم یہ کیوں نہیں سوچ رہے ہیں کہ باطل کا زہوق حق کے اتیان پر موقوف ہے جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ارشادِ ربانی ہے اور سراسر حق ہے۔ اگر باطل جم رہا ہے پل رہا ہے بڑھ رہا ہے سر چڑھ کے بول رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حق کو اس کے مقابلہ میں جس طرح لانا چاہیے اس طرح لایا نہیں جارہا ہے، اور یہ صرف اور صرف ہمارا قصور ہے، اس قصور کی تلافی کیے بغیر کامیابی کا خواب دیکھنا یا ناکامی کی شکایتیں کرتے رہنا دونوں عبث ہیں۔ آیئے! ہم سب اہلِ حق کہلائے جانے والے ارادہ کریں کہ (۱) سب سے پہلے باہمی ونفسانی رنجشوں کا خاتمہ کرکے اتحادِ مسلک ومشرب کی بنیاد پر مضبوط قوت بن جائینگے۔ (۲) جمود وتعطل یا رسمی حرکت وجہد کو حقیقی محنتوں اور قوم سے واقعی ہمدردیوں میں تبدیل کردینگے (۳) قوم کی زبان اور ان کی فہم کے مطابق بات کرنے کی صلاحیت پیدا کرکے ان کے قلوب تک حق کا پیغام پہونچانے کا حق ادا کرینگے اور سب سے بڑھ کر (۴) رجوع الی اللہ والی اھل اللہ کے ذریعہ درونِ سینہ کو مجلّٰی اور اخلاق کو اعلیٰ کرکے وہ روحانی قوت پیدا کرینگے جو طاغوت کی ہر قوت اور باطل کے ہر طلسم کو نابود کرکے رکھ دے۔

ہمارے حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ علماءِ کرام کے سامنے بڑے درد سے حضرت خواجہ صاحبؒ کے یہ اشعار سنایا کرتے تھے:

دل میں لگا کے ان کی لو، کردے جہاں میں نشرِ ضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سَو، بزم مگر میں روشنی نہیں

اور ؎

رستمِ خفتہ ہے تو، کس بل نہیں کچھ کم ترا
جاگنے کی دیر ہے، پھر وہی ہے دم خم ترا
یہ اگر ہوجائے زائل نیند کا عالم ترا
چارسو دنیا میں لہرانے لگے پرچم ترا

اللہ پاک اپنے کرم سے ہمیں احساسِ زیاں اور فکرِ تلافی نصیب فرمائے۔ آمِینْ
وَصَلَّی اللہُ عَلَی النَّبِیِّ الْکَرِیْمْ۔

(اداریہ جولائی ۲۰۱۰ء)

مسلم بھائی بہنوں سے ایک اہم گذارش

قرآن کریم کی تعظیم

برادرانِ اسلام! ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب اور اس کا عظیم الشان کلام ہے۔ کلام کی عظمت متکلم کی عظمت کے مطابق ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ سب سے اعلیٰ، ارفع اور اکبر ہے اس کا کلام اور اس کی کتاب بھی دنیا کی تمام کتابوں سے زیادہ عظمت واحترام کی مستحق ہے۔ اسی وجہ سے علماءِ امت نے کلام اللہ شریف کے بہت سے حقوق بتلائے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کے انجامِ بد سے ڈرایا ہے۔ امام بیہقیؒ نے ''شعب الایمان'' میں قرآن مجید کے پچاس حقوق بیان کئے ہیں، اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ میں اس کے علاوہ اور بھی حقوق ہونے کا انکار نہیں کرتا جو حقوق سرسری طور پر میرے ذہن میں آ گئے وہ لکھ دیا، پھر اس کے بعد ہر حق کے سلسلہ میں اپنی سند سے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہؓ نقل فرمائے ہیں، اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتنی عظیم کتاب ہے اور اس کا کس قدر احترام ہم پر لازم ہے۔

انہی حقوق میں ایک اہم حق اس کے ظاہر کا احترام ہے، یعنی کلام اللہ شریف جن اوراق پر لکھا جائے یا چھاپا جائے اُن اوراق اور اس کتاب کی تعظیم اور تنظیف، اسی طرح ہر اس چیز کا احترام جس کی کوئی نسبت اس کتابِ مقدس کے ساتھ ہو۔ مثلاً اس کے رکھنے کے لیے صاف ستھرے کپڑے، باکس یا جزدان کا ہونا، اونچی اور قابلِ عزت جگہ پر رکھنا، گرد

وغبار سے محفوظ رکھنا، بناطہارت اسے نہ چھونا، بے شعور اور نادان بچوں کے ہاتھوں میں نہ دینا، استعمال کرتے وقت خود پاک صاف ہونا اور جس جگہ پڑھا جائے اس کا بھی پاک صاف ہونا، اس کے پڑھنے سے قبل خوشبو کا استعمال کرنا، اس کے مستعملہ اور پھٹے ہوئے پرزوں کو بھی باعزت اور محفوظ جگہ پر رکھنا، اس کو ایسی جگہوں اور تحریروں میں نہ لکھنا جس کی حفاظت نہ ہونے یا ضائع ہوجانے کا قوی امکان ہو وغیرہ۔

ذیل میں اس سلسلہ کی چند ہدایات نقل کی جارہی ہیں جن کو پڑھ کر قرآن کریم کی عظمت واحترام کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

❁ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے ''قرآن مجید محفوظ کتاب میں ہے اسے پاک لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں چھوتا'' جب قرآن مجید آسمانوں کے اوپر بھی محفوظ کتاب میں رکھا گیا ہے اور پاک لوگوں یعنی فرشتوں کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا جب کہ وہاں رہتے ہی سب فرشتے ہیں، تو پھر اس دنیا میں بھی اس کو پاکیزہ مقام پر رکھنے اور پاکیزہ طریقے پر استعمال کرنے کی بدرجۂ اولیٰ ضرورت ہے، اس لیے کہ یہاں کے حالات اور یہاں کے افراد پاک بھی ہوتے ہیں اور ناپاک بھی۔ یہ آیتِ شریفہ بتلارہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب اپنے کلام کی حفاظت اور استعمال کرنے والوں کی طہارت کا اس قدر اہتمام فرمایا ہے تو اس کے بندوں کو بھی اپنے رب کے کلام کی عظمت واحترام کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔

❁ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''دشمنوں کے علاقہ میں قرآن لے کر مت جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کے ہاتھ لگ جائے'' یعنی کہیں وہ اس کی بے ادبی نہ کر بیٹھیں اور تم اس کا سبب بن جاؤ۔ سوچنا چاہئے کہ جب بے ایمانوں کی توہین سے کلام اللہ شریف کو محفوظ رکھنے کا حکم دیا جارہا ہے تو خود مسلمانوں کو اس کے احترام کرنے اور ہر طرح کی توہین واستخفاف سے بچنے کی کس قدر تاکید ہوگی، اور اس کی خلاف ورزی کتنا بڑا جرم ہوگا؟

❁ نبی کریم ﷺ کو ایک شخص نے پیشاب کرتے وقت سلام کیا، آپ نے جواب نہیں

دیا۔ بعد میں اس شخص سے فرمایا ''ایسی حالت میں سلام مت کیا کرو، اور اگر تم کرو گے تو میں جواب نہیں دوں گا''، غور کرنا چاہئے کہ سلام میں اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک ہونے کی وجہ سے اس کا اس قدر احترام کر کے دکھلایا گیا ہے تو قرآن مجید جو مکمل کلامِ الٰہی ہے نبی کریم ﷺ کے نزدیک اس کی عزت و توقیر کس قدر ضروری چیز ہوگی؟

❁ نبی کریم ﷺ جب تہجد کا ارادہ فرماتے تو مسواک رگڑ کر دانت صاف فرماتے تھے۔ امامِ بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ آپ کا یہ عمل نماز اور تلاوتِ قرآن کے احترام ہی میں تھا۔

❁ حضرت علیؓ نے ایک کاتبِ قرآن سے فرمایا ''جلی اور واضح خط میں لکھو، اس کی تحریر روشن رکھو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو روشن کتاب بنایا ہے'' یعنی اس کی معنوی و حقیقی مرتبے کا تقاضہ ہے کہ ظاہری اعتبار سے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہونا چاہئے۔

❁ بشر بن حارثؒ ایک بزرگ گذرے ہیں، وہ پہلے بدقماش آدمی تھے، ان کی ہدایت کا سبب قرآن کریم کے احترام ہی کا ایک واقعہ بنا۔ انہیں ایک مرتبہ کاغذ کا ایک پرزہ زمین پر پڑا ہوا ملا جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا، انہیں کلام اللہ کی یہ توہین بہت گراں گذری، انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر حیرت سے کہا: میرے آقا! آپ اتنے بلند ہیں اور آپ کا نام نامی یہاں زمین پر پڑا ہوا ہے؟ پھر اس پرزے کو اٹھا کر صاف کیا، عطار کے پاس جا کر سب سے قیمتی عطر خریدا، اس پرزے کو اس عطر میں بسایا اور اپنے گھر کی دیوار کے دراڑ میں اونچی جگہ محفوظ کر دیا۔ کلام اللہ کے اس احترام کی برکت سے ان کے دل کی دنیا بدل دی گئی، وہاں سے سیدھے اس وقت کے ایک اللہ والے بزرگ کی مجلس میں پہونچے، ان بزرگ نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا: تم نے ان دنوں کیا خاص عمل کیا ہے مجھے بتلاؤ؟، اور اپنا خواب سنایا کہ رات میں نے خواب دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے ''بشر سے کہہ دو کہ اس نے ہمارے نام کا احترام کیا ہے ہم اس کو ذلیل ہونے نہیں دینگے، نہ دنیا میں نہ آخرت میں''

❁ حضرت تمیم داریؓ جب تہجد کے لئے کھڑے ہوتے تو احترامِ قرآن میں نہایت قیمتی چادر اوڑھتے تھے۔

❁ حضرت قتادہ ؒ فرماتے ہیں جب سے میں نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا ہے لہسن نہیں کھایا۔

❁ حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم قرآن پڑھ رہے ہو اس وقت کسی کی ریح خارج ہوگئی یا کہیں سے بدبو آنے لگے تو بدبو ختم ہونے تک تلاوت موقوف کردو۔

❁ جنبی اور حائضہ کو غسل کرنے تک قرآن مجید پڑھنے کی بھی اجازت نہیں حالانکہ اس کی وجہ سے منھ میں کوئی ظاہری گندگی اور بدبو نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب معنوی وحکمی ناپاکی کے ہوتے ہوئے یہ حکم ہے تو ظاہری گندگی کیسے برداشت ہوسکتی ہے؟ (تمام روایات ''شعب الایمان'' جلد اوّل کی فصل آداب القرآن سے لی گئی ہیں)

یہ چند باتیں اس مختصر مضمون میں بطورِ نمونہ لکھی گئی ہیں، اگر سلفِ صالحین کے قرآن مجید کے ساتھ طرزِ عمل کے واقعات اور اس کی ظاہری ومعنوی تعظیم کی مثالیں نقل کی جائیں تو ایک مستقل مضمون ہوجائے گا، جو اس وقت مقصود نہیں۔ ہمارے اسلافِ کرام کا حال تو یہ تھا کہ قرآن شریف تو بہت بڑی کتاب ہے دین کے علم کی نسبت سے ہر آلۂ علم کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

کیا یہ ظلمِ عظیم نہیں؟

اس کے برخلاف آج کل بہت افسوس اور دُکھ کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ہم مسلمانوں میں قرآن کریم کا جیسا ادب ہونا چاہئے ویسا نہ رہا، دن بہ دن اس اہم مسئلہ کی طرف سے غفلت ہوتی جارہی ہے۔ جیسا ہونا چاہئے ویسا ادب تو ہم کیا کرتے ضروری اور عقل کے نزدیک مسلم احترام بھی ہم نہیں کرپارہے ہیں، آج ہمارے گھروں میں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے گھروں (مسجدوں) میں بھی اکثر قرآن مجید کی صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کا اتنا

خیال بھی نہیں رکھا جاتا جتنا ـــــ اللہ پاک معاف فرمائے ـــــ اپنے جوتوں چپلوں کی صفائی اور پالش کا خیال رکھا جاتا ہے، کم از کم دو چار دن میں ایک مرتبہ تو ضرور جوتے کی پالش کرلی جاتی ہے، فرش جھاڑا جاتا ہے، پونچا لگایا جاتا ہے، گھر میں رکھے ہوئے پودے صاف کئے جاتے ہیں، دروازوں کھڑکیوں صوفوں کے کور بدلے جاتے ہیں، شوکیسوں اور ان میں رکھی ہوئی اشیاءِ زینت کی صفائی کی جاتی ہے، گھر میں کونسی چیز ایسی ہے جس کو وقفہ وقفہ سے صاف نہیں کیا جاتا سوائے کلام اللہ شریف کے؟ کہ وہ جہاں رکھدی جاتی ہے مہینوں بلکہ بسا اوقات برسوں پڑی رہتی ہے، گرد وغبار جم جاتی ہے، جلدیں سوکھ کر ٹوٹ جاتی ہیں، مگر ہمیں اس کی طرف کوئی دھیان اور توجہ بھی نہیں ہوتی۔ یہی حال ہماری اکثر مساجد کا ہے جن میں آج کل مصلیوں کے لیے ہر سہولت فراہم ہے، ان کی ایک سے ایک شاندار عمارات بن رہی ہیں، لیکن اکثر مساجد میں قرآن مجید کی خدمت کا انتظام نہیں ہے، طہارت خانوں سے لے کر جماعت خانے تک، جوتوں کے اسٹانڈ سے لے کر نماز کی صفوں تک ـــــ شاندار اور صاف ستھرا انتظام ہو رہا ہے، ان کی صفائی اور جھاڑ وجھٹکے کے لیے افراد مقرر ہیں، بجلی، پانی، فنائیل، آمیسڈ اور اگر بتیوں کے اخراجات منظور ہو رہے ہیں، مخملی قالین بچھ رہی ہیں، قیمتی پائیدان ہیں، بیماروں کے لیے کرسیاں ہیں۔ یہ سب بندوں کی راحت اور سہولت کے لئے ہے، لیکن اللہ کے کلام کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں، ان کے سیلفوں میں گرد جمی رہتی ہے، پاروں کے سیٹ رکھے رکھے خراب ہوتے رہتے ہیں، پرانی کلام پاک کھلی رکھی رہتی ہیں، ان کے صفحات ٹوٹ ٹوٹ کر ادھر اُدھر ہوتے جاتے ہیں، نئی کلام پاکوں کو بھی جز دان نہیں، ان کے رکھنے کے لئے رحل کا انتظام نہیں، ان کے صاف ستھرا رکھنے پر کوئی مامور نہیں۔ آپ ہی سوچئے کہ کلام اللہ شریف کے ساتھ ہمارا یہ طرزِ عمل کس قدر افسوسناک ہے۔ اب تو یہاں تک دیکھنے میں آ رہا ہے کہ کلام الٰہی کی آیات شادی کے رقعوں، نام رکھائی کے کارڈوں اور دیواری پوسٹروں پر تک چھاپے جا رہے ہیں، جن کی حفاظت اور

احترام کی کوئی صورت ہی نہیں، رقعے پڑھنے کے بعد ادھر اُدھر ڈال دیے جاتے ہیں اور پوسٹرز جھڑ کر اور پھٹ کر ہواؤں کے حوالے ہو جاتے ہیں، کیا یہ معمولی گناہ ہے؟ کیا یہ قرآن عظیم پر ظلم نہیں؟

آیئے! آج عہد کریں کہ اپنا فریضہ اور کلام الٰہی کے احترام کا حق سمجھ کر اپنے گھروں اور مسجدوں میں اس منکر کی اصلاح کی ابھی سے فکر شروع کر دینگے، اور ایک دوسرے کو حکمت سے توجہ دلاتے رہیں گے۔ اللہ پاک ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائے، آمین

(اداریہ ستمبر ۲۰۱۰ء)

بابری مسجد قضیہ کا فیصلہ

بابری مسجد سن ۱۵۲۸ء میں عہدِ بابری میں تعمیر ہوئی، چار سو اکیس سال کے بعد سن ۱۹۴۹ء کے دوران ایک سازش کے تحت مسجد کے اندرونی حصے سے مورتیاں برآمد ہوئیں، جس پر دونوں فریق ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی، ہندؤں کا کہنا تھا کہ یہ قدرتی طور پر رام کا اس جگہ اپنی موجودگی کا اظہار ہے، مسلمانوں کا ماننا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مسجد کے اندر مورتیوں کو رکھ کر قصداً یہ معمہ بنایا گیا ہے۔ بہرحال دونوں فریق عدالت سے رجوع ہوئے اور اپنے اپنے حق کے لئے دعوے دائر کردئے، ادھر صورتحال کو مزید کشیدگی سے بچانے کے لئے حکومتِ وقت نے اس مسجد کو متنازعہ جگہ قرار دے کر اس کو تالا لگادیا، ایک سال بعد ان برآمد شدہ مورتیوں کی جو مسجد ہی میں رکھ چھوڑی گئی تھیں وہیں رکھتے ہوئے ہندؤں کو پوجا کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ سن ۱۹۸۶ء میں ایک مقامی عدالت نے پوجا کرنے والوں کے لیے باب الداخلہ کھول دینے کے باقاعدہ احکامات جاری کئے، اس کے بعد سے مسلمانوں پر پابندیاں سخت سے سخت اور ہندؤں کے لئے کم اور نرم ہوتی چلی گئیں، دریں اثنا وشو ہندو پریشد اس پر قبضہ اور ہندو مراسم کی ادائیگی کے لیے کچھ نہ کچھ اقدامات کرتی رہی، سیاسی طور پر اقتدار سے مایوس بی جے پی نے بھی اس مندر کی تعمیر کے مسئلہ کو اپنے ایجنڈہ میں شامل کرکے اس کو سیاسی قوت بہم پہونچانا اور اس اِشو کے ذریعے اپنا وجود مستحکم کرنا شروع کردیا۔ بالآخر ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو شیلا نیاس کے بہانے جمع

ہونے والے لاکھوں ہندوؤں کے ساتھ وی ایچ پی کے کارسیوکوں نے پولیس اور نیم فوجی فورسیس کی موجودگی بلکہ تحفظ کے درمیان اس عظیم الشان تاریخی مسجد کی عمارت کو گھنٹوں کی کوششوں کے بعد شہید کر دیا، اس طرح شدہ شدہ اس مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ مکمل کرلیا۔ رات دیر گئے اس وقت کی مرکزی سرکار کے وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے ایک تعزیتی بیان بڑی اداکاری کے ساتھ اپنے کو معصوم و بے قصور اور قوم کے دکھ میں شریک قرار دیتے ہوئے جاری کیا، اور مسلمانوں سے صبر و تحمل سے اس غم کو گوارا کر لینے کی اپیل کی۔

اس واقعہ کو جس طرح میڈیا نے اچھالا اور ٹی وی پر وقفہ وقفہ سے دُہرا کر پیش کیا گیا، اُس سے مسلمانوں کے جذبات بجا اور فطری طور پر مشتعل ہوتے رہے اور ردِ عمل میں ملک گیر فسادات کا سلسلہ چل پڑا۔ ہر چند بزرگ قیادتوں نے مسلمانوں کے جذبات قابو میں رکھنے کی کوشش کی مگر ایک طرف اس دلخراش و دل آزار مناظر کے غضبناک اثرات دوسری طرف جذباتی اور وقتی قیادتوں کی غیر معتدل و نامناسب تقاریر نے اس سلسلہ کو اور زیادہ مہلک وخطرناک بنا دیا، اس موقعہ پر پولیس اور انتظامیہ نے بھی کوئی بہتر کردار ادا نہیں کیا، اگر وہ چاہتے تو حالات بد سے بدتر نہ ہوتے۔ بہر حال دن دھاڑے کسی عبادت خانہ کو شہید کرنے والے مجرموں اور ظالموں کا معاملہ تو عدالت کے حوالے کر کے سرد خانے میں ڈالدیا گیا مگر مظلوم اور اپنی حق تلفی پر احتجاج کرنے والے مسلم نوجوانوں کو ملک کے مختلف حصوں سے گرفتار کر کے اُس وقت کے سیاہ قانون ٹاڈا کے تحت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا، جو برسہا برس سے اسی میں سڑ مر رہے ہیں۔

بابری مسجد کی شہادت کے اس حادثے کو ۱۸ / سال گذر گئے، ہر سال ۶ / دسمبر کو جذباتی مسلمان یوم سیاہ مناتے ہیں اور متعصب ہندو یوم فتح! حقیقت میں دیکھا جائے تو عام مسلمانوں کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی رہی نہ ہندوؤں کو، قانون کی لڑائی عدالت میں لڑی جارہی تھی اور فریقین کی نام نہاد قیادتوں میں جس کے پاس اپنی قیادت کی بقا کے لئے کوئی

بنیادی اشوز نہیں تھے وہ اسے اپنا اِشو بنا رہے تھے۔ اب اٹھارہ سال بعد دو تین مہینے قبل ہی سے یہ اطلاعات منظر عام پر آنے لگیں کہ ۲۴ر ستمبر ۲۰۱۰ء کو الہ آباد ہائی کورٹ اس مقدمے میں ملکیت کا فیصلہ ـــــ جو بہت پہلے ہی کر کے محفوظ کر لیا گیا تھا ـــــ جاری کرنے والی ہے، درمیان میں اسے مؤخر کرنے کی ایک ناکام کوشش بھی کی گئی۔ بالآخر سپریم کورٹ نے ۳۰ر ستمبر ۲۰۱۰ء کو دوپہر تین بج کر تیس منٹ پر اس فیصلے کو جاری کر دینے کی ہدایت دی۔ پورے ملک میں درپیش خطرات سے نمٹنے کے لئے بڑی تعداد میں پولیس فورس اور نیم فوجی دستے تعینات کر دئے گئے، فریقین کی قیادتوں اور تنظیموں سے عدالت کے فیصلہ کو قبول کر لینے اور امن وامان قائم رکھنے کے بار بار اعلانات کروائے گئے۔ اللہ اللہ کر کے وہ گھڑی آئی اور عدالت نے تین ججوں پر مشتمل خصوصی بنچ کا ـــــ ایک کے مقابلے میں دو کی اکثریت سے کیا گیا ـــــ فیصلہ جاری کر دیا۔ تفصیل تو فوراً سامنے نہیں آ سکتی تھی جو خلاصہ سامنے آیا وہ بہرحال مسلمانوں کے اور شاید ہندؤں کے بھی توقع کے برخلاف اور مایوس کن رہا۔ متنازع فیہ جگہ جو اصل مدعا ہے اس کا حقدار غیر مسلموں کو قرار دے دیا گیا۔ بقیہ جگہ کے حصے بخرے کر کے دونوں کے درمیان تقسیم کر دئے گئے، ساتھ ہی سپریم کورٹ سے رجوع ہونے کے لئے تین ماہ کا وقت دیا گیا ہے، ذمہ دار حضرات تمام پہلوؤں سے غور کر رہے ہیں کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ ان کے قلوب میں بہتر شکل الہام فرمائے۔ آمین

گذشتہ ساٹھ سالوں سے چلتے ہوئے اس مقدمہ میں بالخصوص مسجد کی شہادت کے بعد جو تیزی اور سرگرمی آئی اس میں ہونے والے مباحث اور داخل کی جانے والی شہادتوں کی روشنی میں یہ بات تو طئے ہے کہ ہندو فریق کمزور اور مسلمان فریق مضبوط نظر آتا رہا، اسی وجہ سے فیصلے کے بارے میں دونوں فریق اسی کی روشنی میں امید یا اندیشہ رکھے ہوئے تھے، تاہم جو فیصلہ آیا وہ دونوں فریق کے تصور کے خلاف تھا، اس لیے ایک فریق کا مسرور

دوسرے کا مایوس ہونا فطری امر ہے، لیکن الحمدللہ مسلمانوں نے اس صبر آزما گھڑی میں بہت ہی صبر و تحمل اور وقار سے کام لیا، تاہنوز امن و امان ہی کی اطلاع ہے، خدا کرے کہ آئندہ بھی رہے۔

مجھے یاد ہے کہ کافی عرصہ قبل میں حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کی ملاقات کے لئے راندیر گیا ہوا تھا، اتفاق سے وہ ۶ / ڈسمبر کا دن تھا، مغرب کے بعد حضرتؒ سے ملاقات ہوئی، بہت نحیف ہو چکے تھے، ایک جھولے نما چار پائی میں لحاف کے اندر پڑے ہوئے تھے، عمر سو سے متجاوز ہو چکی تھی، ایک مفتی صاحب کو کسی فتویٰ کے سلسلہ میں ضروری ہدایات دینے کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے، خیر خیریت دریافت کی اور وطن معلوم کیا، جب میں نے حیدرآباد کا نام لیا تو فوراً کہا کہ آپ کے حیدرآباد میں آج ''بابری مسجد ریالی'' نکالی گئی ہے، اس میں گڑبڑ ہوئی اور پولیس کی گولی سے ایک نوجوان کی جان بھی چلی گئی، یہ کون لوگ ہیں؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ فائدہ کیا ہے؟ ایک مسلمان کی جان کا اللہ تعالیٰ کے پاس کون جواب دہ ہے؟ پھر خود ہی فرمایا کہ وہ تنظیم جو اس بے اثر و بے فائدہ جلوس کا اہتمام کرتی ہے عنداللہ اس جان کی وہی ذمہ دار ہے!

خیر! یہ بات تو مجھے ابھی اچانک یاد آ گئی تو نقل کر دی کہ قارئین کے علم میں رہے اور سمجھ میں آئے کہ آج کل بعض قیادتیں قرآن و حدیث کے حوالے سے نوجوانوں کے جو جذبات بنا رہی ہیں اس میں بڑوں کے تجربات، علماء کی تحقیقات اور عالمی و ملکی حالات کی کوئی رعایت نہیں کی جاتی ہے، جس کا نتیجہ بے موقع و بے مصرف جانوں، مالوں اور کاروبار کا کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں ہے، دین کا ہو یا دنیا کا کوئی کاروبار امن کے بغیر ممکن نہیں ہے، حالات بگڑتے ہیں تو جانوں کا اتلاف اور کاروبار کا ضیاع تو ہوتا ہی ہے، مسجدوں کی آبادی، مدرسوں کی سرگرمی، دعوت و تبلیغ کی جدوجہد اور سماجی و امدادی خدمات سب خطرے میں پڑ جاتے ہیں اور نتیجہ صفر! ۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بزدل و عشرت پسند

ہونا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ بہادری اور بے وقوفی کے فرق کو سمجھ کر کام کرنا چاہیے، وقت پر جان و مال کا ایثار عزیمت و بہادری ہے اور بے وقت ان کا ضیاع حماقت و بے وقوفی ہے، اللہ پاک ناعاقبت اندیش قیادت سے ملتِ اسلامیہ بالخصوص نوجوانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

آخری بات جو اس وقت عرض کرنے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ ملت کو نمازی بنانے کی جدو جہد کی جائے، کوئی مسجد ویران نہ ہو، رمضان اور ہفتہ واری نمازیوں کو پنجوقتہ نمازی بنانے کی جدو جہد اور بے نمازیوں کو نماز کی طرف لانے کی فکر ہر مسلمان اپنی ذمہ داری سمجھے، اگر ہر مسجد اذان و نماز سے آباد رہے تو یہ نوبت ہی نہ آئے۔ مثل مشہور ہے ''خانہ خالی را دیواں می گیرند''۔ اگر اذان و نماز کا سلسلہ جاری رہے تو نہ مسجدیں ویران ہوں گی نہ ان میں مورتی بٹھانے کی کسی کو جرأت ہو سکے گی۔ ہر نمازی اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کو نمازی بنا لینے کی کوشش کرلے تو دیکھتے دیکھتے نمازیوں کی تعداد کئی گنا بڑھ جائے گی، حق تعالیٰ سے تعلق بھی مضبوط ہوگا، ایمان بھی پختہ ہوگا، نصرتوں کے دروازے کھلیں گے اور انشاء اللہ نماز باجماعت کا یہ نظام معجزۂ اسلام بن کر ایک طرف باہمی اعتماد و اتحاد میں اضافہ کرے گا تو دوسری جانب دشمنانِ اسلام کی نیند خراب اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دے گا۔ نصرتِ الٰہی ایمان والوں کے لئے موعود ہے اور ایمان بغیر نماز کے ناقص و کمزور ہے، اس لیے سب مسلمان اس کوتاہی کی تلافی کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ اکابر علماءِ کرام، مسلم پرسنل لاء بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند جیسی موقر قیادتیں قومی ملی و ملکی مسائل میں ہماری جو راہنمائی کریں تو اس کی تعمیل کے لئے قوتِ متحدہ بن کر آگے آئیں اور ایثار و قربانی کی مثال بن جائیں۔

اللہ تعالیٰ تمام عالم بالخصوص مسلمانانِ ہند کی بھرپور حفاظت فرمائے اور ہم سب کو بہ حیثیت مسلمان اپنے فرائض کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (اداریہ، اکتوبر ۲۰۱۰ء)

اگر ایسا نہ کروگے تو......

آج کل مسلم معاشرہ کا حال ناگفتہ بہ ہوگیا ہے، نوجوانوں میں اخلاقی بے اعتدالی روز افزوں ہے، کالج کلچر کے بہانے سے لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط فیشن بن گیا ہے، نوجوان لڑکیوں کا غیر محرم لڑکوں کے ہمراہ ہنسی مذاق کرنا، بے تکلفی برتنا، ان کے ساتھ پکنک کے لیے جانا اور موٹر سائیکلوں پر گھومنا جیسی فحش حرکتیں عام ہوتی جارہی ہیں، ستم یہ کہ ان حرکتوں کو نہ ماں باپ بُری بات سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی کالج کے اساتذہ و منتظمین معیوب قرار دے رہے ہیں، حد یہ ہے کہ اب مردوزن کے اس اختلاط میں دین ومذہب کی رعایت بھی ختم ہوتی جارہی ہے، بلالحاظِ مذہب معاشقے جاری ہیں۔

ستم یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ملنے والی اطلاعات کے مطابق مسلم لڑکیاں زیادہ فراخ دل اور کشادہ ذہن ثابت ہورہی ہیں، بلاجھجک غیر مسلم نوجوانوں کے بہکاوے میں آکر ان کے ہمراہ راہِ فرار اختیار کرنے کے واقعات میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے، شہر تو شہر قصبوں اور دیہاتوں میں یہی صورتحال دکھائی دے رہی ہے۔ایک قصبے کے نوجوانوں نے مجھے بتلایا کہ ہم لوگ ہر دوسرے تیسرے روز کسی مسلم لڑکی کو کسی غیر مسلم کے ساتھ تعلقات میں پکڑ لیتے ہیں، ایک دیہات میں خاندان کے افراد نے باقاعدہ مندر میں لے جاکر مسلم بچی کو غیر مسلم سے بیاہ دیا اور بخوشی رخصتی کرادی، ایک علاقہ میں اطلاع ملی ہے کہ تعلیم یافتہ مسلم لڑکی نے ایک چرواہے کے ساتھ مبینہ ناجائز تعلقات قائم کرلئے ہیں، ماں باپ کے پولیس میں شکایت کرانے پر لڑکی نے خود پہونچ کر بیان دیا کہ میں اس شخص کے ساتھ اپنی

خوشی سے ہوں۔ ایک اچھے گھرانے کی طالبہ کے متعلق معلوم ہوا کہ جس آٹو سے وہ دینی مدرسہ جایا کرتی تھی اس کے غیر مسلم ڈرائیور کے ساتھ باقاعدہ جنسی تعلقات قائم ہیں، جب کہ وہ ڈرائیور ہندوؤں کی بھی نچلی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلم لڑکیوں کو جھانسہ دے کر نواحی علاقوں میں لے جا کر اجتماعی بدکاری کے بعد وہیں قتل کر کے پھینک دینے کے واقعات بھی اس مہینے کے دوران دو مرتبہ اخبار میں نظر سے گذرے، اور یہ تو اکّا دکّا واقعات ہیں جو اس وقت ذہن میں آگئے، ورنہ خدا جانے ایسے کتنے واقعات ہوں گے جو منظر عام پر نہیں آتے۔ ایک ضلع میں وہاں کے ثقہ عالمِ دین نے بتلایا کہ صرف مستقر کے پولیس اسٹیشن میں تقریباً ۶۰ شکایات اس سال کے دوران ایسی درج ہوئی ہیں جن پر کیس بک ہوسکا، ورنہ جو شکایات خارج ہوگئیں یا رفع دفع کردی گئیں ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صورتحال کی محرکات کیا ہیں؟ اور کیوں اس تیزی سے اسلامی معاشرہ روبہ زوال ہوتا جارہا ہے؟ غور کرنے سے آپ کو درج ذیل وجوہات کی نشاندہی ہوسکتی ہے۔

۱) مسلم گھرانوں میں اسلامی تعلیم وتربیت کا فقدان

ایسا نہیں ہے کہ مسلمان اپنی اولاد کی اسلامی تعلیم وتربیت میں صرف کوتاہی کے مجرم ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب مسلم گھرانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جہاں اسلام اور اس کی تہذیب وتعلیم کا کبھی ذکر مذاکرہ تک نہیں ہوتا، اس کے برخلاف ان کے ہاں ہر وقت کامن کلچر اور مشترک تہذیب کے گُن گائے جاتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بچے اسلام، اسلامی تعلیمات اور اسلامی شخصیات سے بالکل بے خبر اور نابلد ہوں گے تو انہیں اپنی کسی حرکت سے عقیدہ وعمل کی شناخت کے متاثر ہونے کا کیا غم ہوگا؟

۲) آلاتِ جدیدہ کا آزادانہ استعمال

مسلم گھرانوں میں اب تک ٹی وی کے مضر اثرات ہی کا رونا تھا، اب موبائیل فونس،

سی ڈیز اور انٹرنیٹ کا بے باکانہ اور آزادانہ استعمال عام ہوگیا ہے، موبائیل فون میں ہر طرح کے فحش مناظر دیکھنے، ہر قسم کی موسیقی سننے اور ہر کسی سے روابط بنالینے کی جو سہولت ہوگئی ہے اس نے اچھے اچھے شریف اور دین پسند گھرانوں کے ماحول میں مغربی تہذیب کے جراثیم پھیلا دئے اور غیر شریفانہ زندگی کی ہوس پیدا کردی ہے۔

۳) گھروں میں لباس کے اسلامی آداب کا ختم ہو جانا

جب تک مسلمان مذہبی وقومی شناخت کو اہمیت دیتے رہے اس وقت تک مسلمانوں کا لباس بھی ساتر اور مہذب تھا لیکن جب سے تیار ملبوسات کے استعمال کا رواج ہوگیا ہے، ہم مسلمان بھی دوسروں کے مسلط کردہ طرز کے پابند ہو گئے ہیں، اس شہوت انگیز اور حیا سوز لباس کا ایک طرف یہ نقصان ہوا کہ تہذیبی شناخت سے ہم محروم ہوگئے تو دوسری جانب خاندان کے باہمی تعلقات کے حدود اور رشتوں کا تقدس بھی پامال ہوگیا، گویا مغربی تہذیب کی ہوس نے ’’عزتِ سادات گئی‘‘ کا ہمیں مصداق بنادیا۔

۴) تعلیم گاہوں کا مخلوط ماحول

پہلے زمانہ میں اسکولوں اور کالجس کا قیام جہل وناخواندگی کا مقابلہ اور علم وہنر کے تحفظ کے واسطے ہوتا تھا، اسی واسطے تعلیم گاہوں کا ماحول ہر قسم کے انتشار سے محفوظ ماحول ہوا کرتا تھا، تدریس کو ایک مقدس پیشہ کہا جاتا تھا، اساتذہ میں خودداری، وقار اور شفقت واحسان نظر آتا تھا تو تلامذہ میں انکسار واحتیاج دکھائی دیتا تھا، لیکن جب سے تعلیم گاہیں تجارتِ محض بن کر رہ گئی ہیں ان کا ماحول کلبوں اور تھیٹروں سے بدتر ہوتا جارہا ہے، لڑکیاں اس قدر سج دھج کر کالج کے لئے نکلتی ہیں گویا وہ پڑھنے لکھنے کے لیے نہیں رقص کرنے کے لئے جارہی ہوں اور لڑکوں کے بناؤ سنگھار نے تو عورتوں کو بھی شرما دیا ہے، ہر سال ایک بڑی تعداد روحانی واخلاقی موت مرتی رہتی ہے مگر کالج انتظامیہ کو اس کا کوئی غم نہیں، اس لئے کہ انہوں نے یہ مارکیٹ کھولی ہے محض آمدنی کی خاطر! قوم کے بچے خواہ کسی گڑھے میں جاکے

گریں مگر وقت پر انہیں فیس دے دیا کریں۔

۵) شادیوں میں تاخیر کرنا

اس صورتحال کی ایک اہم بلکہ اہم ترین وجہ نکاحوں میں تاخیر ہے، نکاح کھانے پینے کی طرح انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت ہے، آدمی کو اگر بھوک ستا رہی ہو اور کھانے کی کوئی حلال چیز اس کو نہیں مل رہی ہے تو وہ حرام کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے، پیاس کی شدت ہو اور پینے کے لئے کوئی حلال شئے دستیاب نہ ہو تو وہ حرام سے اپنی پیاس بجھانے لگتا ہے، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس وقت حرام کاری پر مجبور ہو جاتا ہے جب کہ اس کی شہوت بھڑک رہی ہو اور کوئی حلال راستہ اس بھڑاس کی تسکین کا موجود نہ ہو۔ آج والدین کی حس اور حیا کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ وہ صنفِ مخالف کی ضرورت اور شہوت کے ہیجان و بحران کی کیفیت کا عملی تجربہ رکھنے کے باوجود اور یہ جاننے کے باوجود کہ ہمارے مقابلے میں ہمارے بچوں کا دور اخلاقی قدروں کے اعتبار سے بہت زیادہ ابتر ہے وقت پر بچوں کے نکاح کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور خود سے رحم و محبت کا ثبوت تو کیا دیتے بسا اوقات اولاد کی جانب سے ضرورت کے اظہار کے باوجود نہایت سختی و درشتی سے ان کے مطالبہ کو مسترد کر دیتے ہیں، جب کہ شریعت کی تعلیم اس کے بالکل برخلاف ہے اور شریعت تو خیر بلاشبہ سراپا رحمت ہے، انسانی حمیت اور ابوی شفقت کا تقاضہ بھی اس طرزِ عمل کی مخالفت کرتا ہے، ماں باپ کی جانب سے ہونے والے اس ظلم کا سبب ظالمانہ مطالبات، جاہلانہ معیارات اور ہندوانہ تصورات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

میں نے اس مسئلہ پر کتاب و سنت اور اقوالِ سلف کی روشنی میں اپنے رسالہ ''شادی کا اسلامی تصور اور ہمارا طرزِ عمل'' میں تفصیلی گفتگو کی ہے، تفصیل اس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، یہاں سرورِ عالم نبی رحمت حضرت محمد ﷺ کے ایک ارشادِ گرامی کو ــــــ جو ایک ہدایت اور اس ہدایت کی خلاف ورزی کی صورت میں زبردست نقصان کی اطلاع پر مبنی ہے ــــــ

پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے کہ آپ انے ارشاد فرمایا:

''جب تمہاری لڑکیوں کے لئے کوئی ایسا رشتہ آئے جس کا دین اور اخلاق پسندیدہ اور معتبر ہوں تو تم اس کو فوراً قبول کرلو اور لڑکیوں کو اُن سے بیاہ دو، اگر ایسا نہ کروگے تو زمین پر فتنے بھڑک جائینگے اور عالم گیر فساد پھوٹ پڑے گا۔'' (ترمذی ۲/ ۲۰۲)

ملا علی قاریؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''رشتوں کے سلسلہ میں اگر ہر کوئی مال اور جاہ والوں ہی کو ڈھونڈتا رہے گا تو پھر لازماً بہت سی لڑکیاں بے شوہر اور بہت سے جوان بے زوج رہ جائینگے اور اگر ایسا ہوگا تو وہ سب فساد اُبل پڑینگے جو معاشرہ کے سر کو شرم سے جھکا دینے والے ہونگے۔اسی کو اللہ کے نبی ﷺ نے ''فساد عریض'' سے تعبیر فرمایا ہے۔'' (مرقاۃ المفاتیح:٦/ ۱۹۲)

اللہ پاک ہمیں اپنے نبی رحمت سیدنا محمد ﷺ کے احسانات کا اعتراف کرنے اور ان کی انتہائی معقول و معتبر تعلیمات کو سینے سے لگا کر زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

(اداریہ ڈسمبر ۲۰۱۰ء)

علاقائی زبانوں میں کام کی ضرورت

ریاستِ آندھراپردیش کی علاقائی زبان ''تیلگو'' ہے۔ غیر مسلم تو عام طور سے یہی زبان بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں، خود مسلمانوں کا بھی ایک بڑا طبقہ اسی زبان میں پڑھنے لکھنے کا عادی ہے، بالخصوص آندھرا وسیما علاقوں میں عام مسلمانوں کی یہی زبان ہے، تلنگانہ کے علاقہ میں اگرچہ کہ طویل مسلم اقتدار کی وجہ سے اردو زبان کا زیادہ رواج ہے، پھر بھی دیہی علاقوں میں رہنے والے مسلمان چونکہ زیادہ تر تیلگو میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو پڑھنے لکھنے کی حد تک اردو سے نابلد ہی ہوتے ہیں، اس لیے اردو کتب ورسائل سے استفادہ ان کے لیے بھی مشکل ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جس طرح انسانی برادری کے درمیان باہمی تعلقات کا استحکام اور آپسی رابطہ کی مضبوطی زبان و بیان ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اسی طرح دعوت الی اللہ کے لیے بھی مدعو قوم کی زبان سے واقفیت اور اس پر عبور داعی کے لیے ایک لازمی ضرورت ہوتی ہے، خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ۔ (سورۂ ابراہیم: ۴) ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث کیا ہے، تا کہ وہ اپنی قوم کو اچھی طرح دعوت دے سکیں۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لم يَبْعَثِ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ نَبِيًّا اِلَّا بِلُغَةِ قَوْمِهٖ۔ (مسند احمد: ۲۱۴۱۰) اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو ان کی قوم کی زبان میں مبعوث فرمایا ہے۔ اُرْسِلَ كُلُّ نَبِيٍّ اِلٰى أُمَّتِهٖ بِلِسَانِهَا۔ (مسند الحارث: ۹۴۲) ہر نبی اپنی امت کی

طرف اسی کی زبان میں بھیجا گیا ہے۔

مفسرین اور شراحِ حدیث نے مذکورہ بالا آیت اور روایت کے سلسلہ میں وضاحت کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر عظیم احسان اور اس کی بندہ نوازی ہے کہ اس نے اپنے دین کی دعوت کے لئے کسی خاص زبان کا انتخاب کرنے کے بجائے اپنے بندوں کی علاقائی وقومی زبان ہی کا استعمال فرمایا تاکہ بندے پیغمبروں کی دعوت کو بہ آسانی سمجھ سکیں اور پیغمبر خود ان کو ان کی فہم کے مطابق دعوت دے سکے۔ اس طرح بندوں پر حجتِ دعوت پوری ہو کر وہ اپنی ہدایت وگمراہی کے خود ذمہ دار ٹھہر جاتے ہیں۔[1]

پس معلوم ہوا کہ مادری وعلاقائی زبان کے رابطہ کے بغیر کسی قوم کو دین کی دعوت بھی صحیح طریقہ پر نہیں دی جاسکتی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کو پسند فرمانے کے باوجود اپنی کتابوں اور رسولوں کے لئے اس کو لازم نہیں کیا، بلکہ ہر نبی اور اس پر نازل کئے جانے والے احکام کے واسطے اسی قوم اور اسی علاقے کی زبان کی رعایت فرمائی۔ حاصل یہ کہ ہر علاقہ کے خدامِ دین کی بڑی اہم ضرورت اس علاقہ کی زبان کا سیکھنا اور اس میں کمال پیدا کرنا ہے، تاکہ اپنے علاقۂ دعوت میں وہ مؤثر اور مثمر کردار ادا کرسکیں۔

ایک بات تو یہ ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ دین کی دعوت وتبلیغ کا ایک اہم وسیلہ صحافت ہے، اسی لئے دینی مدارس اور دینی تنظیموں اور جماعتوں کی جانب سے ماہناموں کی اشاعت کا سلسلہ بھی رکھا جاتا ہے، آج کل اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہمارے علاقہ آندھرا پردیش میں بھی شمالی ہندوستان کی طرح مدارسِ دینیہ اور علماءِ کرام کی تعداد دن بہ

---

[1] ہوسکتا ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تو صرف عربی ہے جب کہ آپ تمام اقوامِ عالم کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں، تو مفسرین کرام نے اس کے دو جواب دئے ہیں، ایک یہ کہ آپ کو زبانیں تو تمام اقوام کی سکھائی گئی تھیں مگر آپ کو ان کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی، اگر آتی تو آپ ﷺ اس کے استعمال سے مجبور نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ کی امت میں آپ کے اصحاب اور بعد کے علماء ایسے پیدا فرمائے گئے جنہوں نے آپ کی دعوت کو مکمل طریقہ پر دنیا کی ہر زبان میں منتقل کردیا، اس طرح حجتِ دعوت کامل ہوگئی اور دعوائے آیت بھی صادق!

دن بڑھتی جارہی ہے، مختلف دینی جماعتیں اور انجمنیں بھی قائم ہورہی ہیں اور خوب کام کررہی ہیں۔ان کے ذریعہ دینی کتابوں اور ماہناموں کی اشاعت بھی عمل میں آرہی ہے۔

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب کام اردو زبان ہی میں ہورہے ہیں ــــــ الاماشاء اللہ ــــــ تیلگو زبان میں بعض جگہ کام ہی نہیں ہورہا ہے اور بعض جگہ ہورہا ہے مگر بہت کم! بالخصوص اہل حق کے اداروں میں تو اس سلسلہ میں بہت ہی بے اعتنائی برتی جارہی ہے، جن میں خود راقم کا ادارہ بھی شامل ہے۔ کچھ دن قبل شہر کے ایک بڑے مکتبے پر جانا ہوا، تیلگو زبان میں اہلِ باطل کا لٹریچر تو بے حساب نظر آیا مگر اہلِ حق کی کتابیں معدودے چند دکھائی دیں، حالانکہ ابناءِ وطن تو کیا اہلِ اسلام کی بھی ایک بڑی تعداد اس وقت تیلگو زبان میں احقاقِ حق کی محتاج ومنتظر دکھائی دے رہی ہے۔

اس عاجز کو ایک عرصے سے شدید تمنا اور بہت فکر تھی کہ علاقائی زبان میں اہل حق کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا جائے، مگر پیدائش سے لے کر اب تک نصف صدی کا عرصہ پورا کا پورا خالص دینی مدرسوں کے ماحول میں گذر گیا، تیلگو زبان نہ کبھی پڑھی اور نہ مخصوص ماحول کی وجہ سے اس کی کچھ شد بد ہی آسکی، اس لئے اس تمنا کی تکمیل اور اس خواب کی تعبیر کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی، اور غیر ذمہ دار وغیر معتمد لوگوں کے ذریعہ یہ کام لیا نہیں جاسکتا تھا، اس لئے جن لوگوں سے یہ کام ہوسکنے کی امید تھی ان کو توجہ دلاتا رہا، اللہ تعالیٰ سے اس کی صورتیں وجود میں آنے کی دعائیں کرتا رہا لیکن کوئی اطمینان بخش صورت بنتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔

دین کی نسبت سے اطراف واکناف کے اسفار اور چھوٹی بڑی بستیوں میں آنے جانے کے مواقع اللہ تعالیٰ نے بہت عطا فرمائے، ادھر چند برس سے دیہی علاقوں کے مسلمانوں پر دینی، تعلیمی وتبلیغی محنتوں کی توفیق بھی بفضلِ خدا مقسوم میں آئی ہوئی ہے تو اپنے اندر علاقائی زبان سے ناواقفیت کا احساس بہت شدت اختیار کر گیا، دورانِ سفر راستوں اور آبادیوں میں دعوتِ دین کے بڑے زرّین مواقع ملتے رہتے ہیں، غریب مزاج، ملنسار اور

محبت بھرے مسلمانوں اسی طرح اخلاق مند غیر مسلموں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں، وہ عقیدت ومحبت سے گرے جاتے ہیں مگر میری بے بسی یہ کہ جی کے ترسنے اور دل کے تڑپ جانے کے باوجود دو بول احقاقِ حق اور دعوتِ دین وایمان کے ان کو نہیں سنا سکتا، وہ محبت سے مل کر، خوشی سے جھوم کر، کھلا پلا کر اور ہاتھ جوڑ کر زیر بار ہی نہیں ممنون ومسحور کرتے ہیں اور میں اس کے جواب میں زبان ہلا کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی پیغام بھی اُن تک ان کی سمجھ کے مطابق نہیں پہونچا سکتا! یقین مانئے ایسے وقت اس قدر شرمندگی وندامت ہوتی ہے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے یا دوگز زمین میں گڑھ جانے کو جی چاہتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ یا اللہ! میں علاقہ کا خادمِ دین ہوکر بھی علاقہ والوں کی زبان نہیں جانتا، اجنبی اور عجمی بنا بندگانِ خدا کے سامنے سے گذر جاتا ہوں، اگر میں کچھ کہہ سن سکتا تو کتنے بے ایمان ایمان کی دولت سے مشرف ہوجاتے اور کتنے ایمان والے اعمالِ ایمان کے پابند ہوجاتے۔ہم اہلِ حق کے برخلاف عیسائی، قادیانی، منکرینِ حدیث، جماعت المسلمین اور ان جیسے کتنے ہی گمراہ وبے دین فرقے ہیں جو زبان وبیان کا سہارا لے کر انہی بستیوں میں اہلِ ایمان کو مرتد بنانے اور اسلام سے ہٹا کر گرجا وصلیب سے وابستہ کر لینے میں کامیاب ہوتے جارہے ہیں، لیکن اس کڑھن گھٹن اور جلن کا عمر کے اس حصے میں فائدہ کیا ہوسکتا ہے؟ ہاں! یہ ممکن ہے کہ جو نسل ہمارے سامنے تیار ہورہی ہے اس کو صورتحال بتلا کر اس بات پر راغب کیا جائے کہ وہ اپنے علاقے کی زبان کو سیکھنے میں دلچسپی لے اور اس میں کمال پیدا کرکے قوم وملت کی صحیح خدمت کے قابل بنے۔ چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ اس کی بساط بھر سعی کی جاری ہے۔

پھر چونکہ زیرِ تعلیم وتربیت علماءِ کرام کے تیار ہونے اور میدانِ عمل میں اترنے کے لئے ابھی کافی وقت ہے، اتنا لمبا عرصہ انتظار نہیں کیا جاسکتا، اگر کیا جائے تو ناقابل تلافی نقصانات کا سامنا ہوسکتا ہے، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ علی الفور جس قدر ممکن ہو عملی

اقدامات شروع کردیے جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ادارہ اشرف العلوم سے ایک تیلگو ماہنامہ ’’پیغامِ ہدایت‘‘ کے نام سے آغاز کیا جارہا ہے، الحمدللہ تعالیٰ اردو ماہنامہ ’’اشرف الجرائد‘‘ کامیاب طریقے پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے، اس رسالہ کا آغاز اس آرزو کی پہلی اور عملی کڑی ہے، اگر یہ اقدام[1] مقبول ہوگا اور قارئینِ کرام کی طرف سے مثبت وہمت افزا ردِعمل سامنے آئے گا تو انشاءاللہ ادارہ اس کام کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے تیلگو زبان میں اپنے اکابر کے مسلک ومشرب کے مطابق ضروری اسلامی لٹریچر منتقل کرنے[2] اور بہترین دعاۃ ومبلغین کو تیار کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اس اقدام کو اپنی رضا کا سبب اور امت کے نفع وزیادتی ہدایت کا ذریعہ بنائے اور اگلے مرحلوں کو آسان فرمائے۔ آمین

(اداریہ: جنوری ۲۰۱۱ء)

---

[1] الحمدللہ تعالیٰ تیلگو ماہنامہ ’’پیغامِ ہدایت‘‘ کا حلقہ بھی اردو ماہنامہ ’’اشرف الجرائد‘‘ کی طرح وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔
[2] یہ دوسرا کام بھی شروع ہوچکا ہے، اس کتاب کی ترتیب تک بارہ کتابوں کا ترجمہ مقامی زبان میں ہوچکا ہے۔

شراب سے معاشرہ کو بچایئے

> درجِ ذیل مضمون دراصل حضرت والا کا بیان ہے، مستقل تحریر نہیں، عزیز گرامی مولانا محمد سمیع الدین صاحب قاسمی زید فضلہٗ نے سی ڈی کی مدد سے قلمبند کر کے ''اشرف الجرائد'' میں شائع کیا تھا۔　　　　از مرتب غفرلہٗ

اسلام سے پہلے عربوں کا ذوقِ شراب نوشی

امام الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نظام ہدایت لے کر تشریف لائے تو یوں تو ساری دنیا لیکن خصوصیت کے ساتھ سرزمین مکہ ـــــ جسے بَلَدَ اللہ الْاَمِین ہونے کا شرف حاصل ہے ـــــ مختلف قسم کی اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا تھی، مشرکینِ مکہ میں بہت سی اخلاقی اور سماجی خرابیاں زمانۂ فترت[1] کے طویل ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں، انہی برائیوں میں ایک بہت مہلک اور خطرناک بیماری شراب نوشی کی تھی۔

عرب نہ صرف یہ کہ شراب نوشی کے عادی تھے بلکہ انہوں نے اسے مایۂ افتخار اور عزت و شرافت کا مسئلہ بنا لیا تھا، ان کی تقریبات ان کی محفلیں، ان کی آپس کی بیٹھکیں اور مجلسیں، ان کے دن ان کی راتیں، ان کی خوشیاں اور ان کی غمیاں سب شراب کے مشغلہ سے معمور رہا کرتی تھیں، اور وہ لوگ ہر موقع پر اسی کا سہارا لیا کرتے تھے، کوئی حادثہ پیش آتا تو غم غلط

[1] زمانۂ فترت اس زمانہ کو کہتے ہیں جو دو نبیوں کے درمیان میں بغیر کسی ہادی و رہنما کے ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں نبوی تعلیمات کی برکات اور اس کے اثرات معاشرہ سے اٹھ جاتے ہیں۔

کرنے کے لئے شراب میں مشغول ہوجاتے، کوئی خوشی کی بات پیش آتی تو مستی کے اظہار کے واسطے شراب سے شغل کرتے، جنگ ہوتی تو دیوانگی اور جنون پیدا کرنے کے لئے شراب سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہ پاتے، امن کا زمانہ ہوتا تو بے فکری کے اظہار کے واسطے شراب کا دور چلتا، دوست ملنے آتے تو دوستوں کا استقبال شراب سے کرتے، اور محفلیں جمتیں تو ان محفلوں کی زینت بھی شراب کو بناتے، اگر کسی نے شراب پیش کر دی تو گویا اس نے بہت عزت دی اور اگر کسی نے شراب کو نہیں پوچھا تو گویا اس نے آنے والے کی تذلیل میں کوئی کسر اٹھا کے نہ رکھی، یعنی شراب ان کے لئے محض ایک عادت کی چیز نہیں تھی بلکہ وہ ان کی تہذیب، ان کے کلچر اور ان کی ثقافت کا حصہ بن گئی تھی، جس پر انہیں فخر تھا، ان لوگوں کو اس گندی چیز سے اتنی دلچسپی تھی کہ عربی زبان کے ماہرین بتلاتے ہیں کہ عربوں نے شراب کے ایک ہزار نام رکھے تھے۔ صرف ناموں کی تعداد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کو اس لعنت سے کیسی دلچسپی اور کس قدر تعلق تھا؟

شراب کی حرمت میں اللہ تعالیٰ کا تدریجی وحکیمانہ طریقہ

اسلام آیا تو اس نے سب سے پہلے عقیدہ اور ایمان پر محنت کی، کیونکہ آدمی جب تک ایمان میں کامل نہیں ہوتا کوئی اور بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نظام بنایا کہ پہلے ایمان اور عقیدہ کی درستگی پر محنت کی جائے، یعنی بندے پہلے اپنے نبی کی سچائی اور اس کی عظمت کے قائل ہوجائیں، نبی جس عظیم ذات کی طرف سے تشریف لائے ہیں اس ذات کی بڑائی، کبریائی، مالکیت اور معبودیت ان کی سمجھ میں آجائے، جس سے ان میں اطاعت وفرمانبرداری کا جذبہ اس قدر پیدا ہوجائے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ یہ چیز حلال ہے تو وہ کہیں یہ حلال ہے، یہ چیز حرام ہے تو وہ کہیں یہ حرام ہے۔ اس لئے اسلام نے یہ ترتیب بنائی کہ پہلے ایمان پر محنت ہو۔ چنانچہ جب ایمان کی محنت ان پر ہوگئی اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مقام ومرتبہ کو اچھی طرح جان گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے

اعمال واخلاق کی طرف توجہ فرمائی۔

دنیا میں جتنی اخلاقی اور سماجی گندگیاں ہوسکتی ہیں ان میں سب سے بدترین چیز شراب ہے، ہر برائی شراب سے جنم لیتی ہے، جیسے معدہ کی خرابی سے جسم کے سارے امراض پیدا ہوتے ہیں ایسے ہی شراب سے دنیا کی ہر اخلاقی بیماری وجود میں آتی ہے، اس لیے اس کو ''ام الخبائث'' یعنی تمام گندگیوں کے پیدا ہونے کا سبب کہا گیا ہے۔ شراب چونکہ عربوں کی بہت پرانی عادت بلکہ ان کی تہذیب وثقافت کا ایک اٹوٹ حصہ تھا، عرب معاشرہ میں ان لوگوں کا بڑا نام تھا جن کے پاس پرانی پرانی شرابیں الگ الگ ناموں سے رکھی ہوتی تھیں۔ حال یہ تھا کہ چاہے کسی کے پاس رہنے کو صحیح جھونپڑا، پہننے کو ڈھنگ کا لباس اور کھانے کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ ہو لیکن اس کے پاس اگر شراب ہے تو سب کچھ ہے، اس کے بعد ان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی، اب ایسے لوگوں سے اچانک کہہ دیا جاتا کہ یہ حرام ہے تو وہ اُسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے اور نافرمانی کے مجرم بن جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تدریجی ممانعت کا حکیمانہ طریقہ اختیار فرمایا۔

قرآن کریم میں شراب کی حرمت کا نزول

شراب پینے کی عادت مسلمان ہونے کے بعد بھی بعض لوگوں کو تھی، چنانچہ بعض حضرات نے اسی حالتِ نشہ میں نماز پڑھی اور اس میں سورۂ الکافِرُون کی تلاوت کی تو، لاَاَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلاَ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، جس سے ایمان کے دعوے کے بجائے کفر وشرک کا دعویٰ ثابت ہوا، بعض لوگوں نے نشہ کی حالت میں اپنے لئے دعا مانگی اور زبان سے بددعا نکل گئی۔

اللہ تعالیٰ نے پہلا حکم یہ نازل فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز مت پڑھو، کیونکہ جب آدمی نشہ کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کو یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ کون ہے کیا ہے اور اس کی زبان سے یا حرکات وسکنات سے کیا صادر ہورہا ہے؟ عزت کا سارا بھرم جو ہوش کی حالت

میں اپنے ہزار عیوب کے ہوتے ہوئے بھی باقی رکھا جاسکتا ہے وہ سب بے ہوشی میں ختم ہو جاتا ہے اور انسان کے اندر چھپے ہوئے سارے عیب اسی کی حرکتوں سے باہر آجاتے ہیں، اس لئے اللہ پاک نے مسلمانوں کو ہدایت دی اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى اے ایمان والو! جب تم نشہ کی حالت میں ہوتو نماز کے قریب بھی مت آؤ، (النساء:۴۳) نماز تو اللہ کی بارگاہ میں باریابی کا نام ہے اور ایسی گندی حالت میں اپنے مولیٰ کے دربار میں تمہیں حاضری زیب نہیں دیتی؟ یہ اپنے مولیٰ کی بہت بڑی گستاخی اور بے ادبی ہے، حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ یہاں تک کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ تمہیں سمجھ میں آنے لگے، یعنی نشہ اترنے کے بعد نماز پڑھ سکتے ہو۔۔۔۔۔شراب کے سلسلہ میں یہ قرآن کی پہلی ہدایت تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے اس سے ہونے والے بنیادی نقصان اور اس پر مرتب ہونے والے حکم کو بیان فرمایا کہ شراب سے عقل میں فتور آجاتا ہے جس کی وجہ سے بندہ اپنے رب کے حضور حاضری کے قابل نہیں رہتا۔

اس آیت کے نزول کے بعد جن صحابہ کے ایمان بہت مضبوط تھے انہوں نے سوچا کہ وہ چیز ہی کیوں اختیار کی جائے جس کی وجہ سے اللہ اپنے حضور میں آنے سے منع فرماتے ہیں، انہوں نے اسی وقت شراب چھوڑ دی، بعض حضرات نے اس خیال سے کہ ابھی حرمت نازل نہیں ہوئی محض نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، اوقاتِ نماز کی رعایت کرتے ہوئے اپنے اس شغل کو بدستور جاری رکھا، لیکن اسلام کی مبارک اور پاکیزہ تعلیمات کی برکت سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اجلۂ صحابہؓ کے گریز اور احتیاط کو دیکھ کر شراب کے بارے میں ان کے دلوں میں کھٹک پیدا ہونے لگی، اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا؛ آپ نے وحی کے انتظار میں خاموشی اختیار فرمائی، چنانچہ وحی آئی اور آپ سے کہا گیا: قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرۃ:۲۱۹) آپ فرمادیجئے کہ ان دونوں چیزوں۔۔۔۔۔یعنی قمار اور شراب۔۔۔۔۔میں بڑا نقصان ہے اور

لوگوں کا کچھ فائدہ بھی ہے، لیکن ان کے نقصانات ان کے نفع سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔
——— یہاں نہ حلال فرمایا نہ حرام، پہلے کہا تھا کہ نشہ کی حالت میں نماز مت پڑھو، اور اب فرمایا کہ اس کا نقصان نفع سے کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً فائدہ اگر دس فیصد ہے تو نقصان نوے فیصد ہے، یہ کہہ کر گویا مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ تھوڑے سے فائدہ کے لئے بڑے بڑے نقصانات کو برداشت کر لینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے بہر حال! لوگوں کے پوچھنے پر اتنا بتلا دیا گیا کہ شراب اور جوے میں نفع کم نقصان زیادہ ہے، یہ بتلا کر قرآن نے سکوت اختیار فرمالیا، اس کے حلال وحرام ہونے کا اب بھی کوئی حکم نہیں دیا۔ اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت نے اللہ کی مراد کو سمجھ لیا اور شراب چھوڑ دی۔

اب ایک تیسری جماعت تھی جس کو ایک طرف شراب سے غیر معمولی عشق ومحبت اور دوسری طرف یہ گنجائش کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی حرام تو نہیں کی ہے اس لئے بالکلیہ اجتناب نہیں کرتی تھی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس سلسلہ میں تیسری وحی آئی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (سورۃ المائدہ: ۹۰) اے ایمان والو! شراب جوا اور سٹے بازی دونوں گندی چیزیں ہیں جو شیطان کی کارستانی ہے، تم اس سے اپنے کو دور کرلو، فلاح پاجاؤگے۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾ (سورۃ المائدہ: ۹۱) اور یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ شیطان ان کے ذریعہ سے تمہارے درمیان بغض وعداوت پیدا کرنا اور یاد الٰہی اور نماز سے محروم کرنا چاہتا ہے، ان نقصانات کو جتا کر بڑے پیارے انداز میں پوچھا گیا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ؟ کیا میرے منع کرنے کے بعد تم لوگ اس کام سے رُک جاؤگے؟ ——— جب یہ قطعی حکم نازل ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اللہ کا یہ حکم سنایا، اور ایک گماشتہ کو حکم دیا کہ مدینہ کی گلی کوچوں میں گشت لگا کر

اعلان کردو کہ یَاأَیُّهَا النَّاسُ قَدْ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْخَمْرُ لوگو! اللہ کی طرف سے شراب اب تم پر حرام کردی گئی ہے۔

اس اعلان پر حضرات صحابہؓ کا جذبہ اطاعت

جب اعلان کرنے والے نے مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب نوشی کی حرمت کا اعلان کیا تو کچھ زیادہ لمحات نہیں گذرے تھے کہ دیکھنے والی آنکھوں نے اور ایک دو کی نہیں سینکڑوں لوگوں کی آنکھوں نے دیکھا کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب کے ریلے بہہ رہے ہیں، صحابہ نے سوسو برس سے جو شرابیں اٹھا کر رکھی تھیں وہ باہر پھینک دی، حتی کہ وہ برتن بھی توڑ دیے جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی یا استعمال کی جاتی تھی، کہ نہ یہ ہمیں نظر آئیں اور نہ کبھی اس کا خیال پیدا ہو۔ ذرا غور کیجئے! یہی وہ شراب تھی جس سے ان کے گہرے جذبات وابستہ تھے، جس کے بغیر وہ زندگی ادھوری سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ شراب نہ ہو تو زندگی میں لطف ہی کیا رکھا ہے؟ لیکن بس نبی کی طرف سے ایک اعلان ہوا اور سب کے گھروں سے پانی کی طرح شراب بہنے لگی اور پھر انہوں نے کبھی اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

ایک محفل میں ایک آقا اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کر رہے تھے، انہوں نے کسی اعلان کی آواز سن کر غلام کو حکم دیا کہ بھائی! ذرا معلوم کرو کہ یہ کیا اعلان ہو رہا ہے؟ غلام گیا اور واپس آکر کہنے لگا کہ آقا! ایک صحابیؓ اعلان فرما رہے ہیں کہ اللہ نے شراب حرام کردی ہے، یہ سنا تو وہ اپنے ہاتھ میں شراب کا جو پیالہ لئے ہوئے تھے اس پیالہ کو منھ تک نہیں اٹھایا اس کو زمین پر رکھ دیا اور یہ کہا کہ جب یہ چیز حرام ہوگئی تو اس سے ہمارا کیا رشتہ اور کیسا تعلق؟ ہمارا رشتہ تو ہمارے اللہ اور ہمارے نبی سے ہے، ان کو جو چیز پسند وہ ہماری پسند اور جو چیز ان کو ناپسند وہ ہمارے لئے ناپسند۔ حضرت عمرؓ اگر چیکہ پہلے ہی سے شراب سے دور تھے اور ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں رہا کرتے تھے مگر جب یہ آیت نازل ہوئی فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تو اُن کی زبان سے بے ساختہ نکلا اِنْتَهَیْنَا یَارَبِّ پروردگار ہم باز آگئے

شراب نوشی کے اخروی نقصانات

اسلام میں چند سزائیں ایسی ہیں جن کو حد کہا جاتا ہے، انہیں میں ایک شراب کی حد ہے، جسے اسلامی حکومت میں ــــــ یہ جرم ثابت ہونے پر ــــــ امیر المومنین جاری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کے سماج میں اس عمل کی اتنی برائی بیان کی کہ شاید ہی کسی عمل کی بیان فرمائی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل میرے پاس آئے اور مجھے خبر دی کہ جو شخص شراب پئے گا اور بغیر توبہ کئے اسی حال میں مرجائے گا تو اس کا حشر بتوں کی پرستش کرنے والوں کے ساتھ ہوگا۔ مدمن الخمرِ کعَابِدِ الْوَثَنِ کہ بتوں کا پوجنے والا اور شراب کا پینے والا اللہ کی نظر میں برابر ہے۔ (ابن ماجہ:۳۳۷۵)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ والی آیت کے ذریعہ سے اللہ نے تم پر شراب حرام کردی ہے اور شراب پینے کو شرک کے متوازی اور مساوی قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص شراب پئے گا اور بغیر توبہ کے مرجائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل نہیں فرمائے گا۔ (نسائی:۵۶۷۸)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی عبادتیں نامقبول فرماتے ہیں۔ اگر وہ توبہ کرتا ہے تو توبہ قبول کرلیتے ہیں، اور اگر پھر شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن کی عبادتیں پھر مردود کردیتے ہیں، پھر توبہ کرتا ہے تو توبہ قبول فرمالیتے ہیں، پھر شراب پیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی عبادتیں مسترد فرمادیتے ہیں، پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلیتے ہیں اور اگر چوتھی دفعہ شراب پیتا ہے اور اللہ سے توبہ کرتا ہے تو لم یقبل اللہ توبتہ اللہ اس کی توبہ بھی قبول نہیں کرتے و مات کافراً اور وہ کفر کی موت مرتا ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیوی شراب پئے گا اللہ تعالیٰ اسے

جنت کی شراب سے محروم کردے گا۔(متفق علیہ)

اس کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان اس گندی چیز سے نفرت کرتے رہے، اگر کوئی جہالت وحماقت سے شراب کے قریب بھی چلا جاتا تو اس سے اس کی بدبو سے، اس کی قربت سے ایسے ہی بچتے تھے جیسے کسی نجاست وغلاظت سے بچتے ہیں۔ مگر افسوس اور صد افسوس کہ آج یورپین کلچر کے ہر جگہ عام ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی شراب یہ لعنت پھر پیدا ہوگئی ہے، جہلاء وغرباء جہالت وغربت کی وجہ سے اور اُمراء وطلبہ دولت کی بہتات کی وجہ سے شراب نوشی کی طرف مائل ہو رہے ہیں، آج کل نوجوانوں میں یہ عادت تیزی سے بڑھتی جارہی ہے، معروف شراب سے ہٹ کر نت نئے قسم کے ڈرگس وجود میں آگئے ہیں جن سے غیر محسوس انداز میں نشہ حاصل کیا جاتا ہے، جگہ جگہ حُقہ پارلرز کُھل گئے ہیں، جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ بظاہر فلاورٹسٹ کے نام پر چلاتے ہیں مگر گاہکوں کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے مخفی طور پر ان فلاورز میں نشہ شامل کیا جارہا ہے، ان پرلروں سے حُقے کرائے پر بھی دستیاب ہو رہے ہیں، جنہیں گھروں پر لاکر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مخلوط حُقہ نوشی کررہے ہیں، براؤن شوگر دولتمندوں میں عام ہو رہی ہے، اور خدا جانے کیا کیا؟ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: **کل مسکر حرام** (بخاری: ۶۱۲۴) ہر نشہ آور شئی حرام ہے۔

مسلمانو! اللہ کے واسطے اس اُم الخبائث سے اسی طرح دور ہو جاؤ جس طرح اصحابِ کرامؓ دور ہوگئے تھے، اپنے معاشرہ پر محنت کرو، غرباء کو بھی اس سے نکالو اور امراء کو بھی نجات دلاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے کی توفیق دے۔ آمین

(مضمون ڈسمبر ۲۰۱۰ء)

منشیات ومخدرات اور مسلم نوجوان!

اسلام نے نشہ آور چیزوں کے استعمال پر سخت پابندی لگائی ہے، اس کی خلاف ورزی پر شدید وعیدیں سنائی ہیں، جرم ثابت ہونے پر دنیوی سزا بھی مقرر فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

"اے ایمان والو! بے شک شراب اور جوا گندی چیزیں اور شیطانی عمل ہیں، تم اس سے دور ہی رہو تاکہ فلاح پاسکو، دراصل شیطان شراب اور جوے کے ذریعہ تمہارے درمیان میں بغض وعداوت اور دشمنی ومنافرت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ تمہیں یادِ الٰہی اور پابندیٔ نماز سے روک دے، (ان برائیوں کے معلوم ہوجانے کے بعد) کیا تم (ان حرکتوں سے) باز آجاؤ گے؟" (مائدہ:۹۰،۹۱)

ایک زبردست حکیم ومربی نے اپنے نادان وناعاقبت اندیش بندوں کو شراب کے مہلک نتائج وعواقب سے خبردار کرکے اس سے بچنے کی حکیمانہ تلقین فرمائی ہے۔ کسی حرکت یا کسی چیز کے نقصان سے بچانے کے لیے اس سے عمدہ پیرائے اور اس سے بہتر تعبیر کا تصور بھی مشکل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ شریفہ میں اختیار فرمایا ہے۔ جب یہ آیت فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ عظمتِ خداوندی سے مرعوب ہوکر پکار اٹھے: اِنْتَهَيْنَا يَارَبِّ! اے اللہ! ہم باز آگئے اور اس عمل سے رک گئے!

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

"اے نبی! لوگ آپ سے شراب اور جوے کا حکم معلوم کررہے ہیں، آپ جواباً فرمادیجئے کہ اس میں بہت بڑا گناہ (اور بہت بڑا نقصان ہے) اور لوگوں کا کچھ فائدہ

(بھی) ہے، لیکن اس کا گناہ اس کے فائدہ سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔" (بقرۃ:۲۱۹)

جب ایسا ہے تو پھر لوگوں کو کیا کرنا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ کسی عقلمند کو اس کے جواب کی ضرورت نہیں وہ خود جانتا ہے کہ کسی موہوم نفع کے لئے یقینی نقصان کو گوارا نہیں کیا جاتا، یا چھوٹے فائدہ کے لئے بڑے خسارہ کا سامنا نہیں کیا جاتا۔ اور جب شراب میں گو عادی آدمی کے لیے وقتی سکون جیسی کوئی کیفیت حاصل ہونا ناممکن نہیں لیکن اس کی وجہ سے ظاہر ہونے والے عقلی فتور اور پھر اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے جسمانی و اخلاقی امراض اس قدر زیادہ اور اتنے شدید ہیں کہ عقل مندوں کے نزدیک ان مضرات کے مقابلہ میں اس نفع کی کوئی وقعت اور اہمیت نہیں ہوسکتی ایسی صورت میں کیسے اس کو جائز اور درست قرار دیا جاسکتا ہے؟ شراب نوشی کی مذمت میں احادیث بھی بکثرت وارد ہوئی ہیں، ارشادِ نبوی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے شراب کے پینے والے پر، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، بنانے اور بنوانے والے پر، اٹھانے والے پر اور اٹھا کر جس کو پہونچایا گیا ان سب پر لعنت فرمائی ہے۔" (ابنِ ماجہ:۳۳۸)

ایک حدیث میں ہے:

"جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ ایسے دسترخوان (یا میز) پر بھی نہ بیٹھے جس پر شراب پی جاتی ہو۔" (حاکم:۵/۲۴۸)

حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی تھی کہ:

"کبھی شراب نہ پینا، کیونکہ وہ تمام برائیوں کی کنجی ہے۔" (ابن ماجہ:۳۳۷۱)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے دل میں اس چیز کی سخت نفرت بیٹھ گئی، اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت نازل فرمائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منادی کے ذریعہ مدینہ میں اعلان کروادیا کہ "شراب حرام کردی گئی ہے" تو صحابہ کرامؓ نے برسوں سے جو شرابیں اٹھا رکھی تھیں وہ بلا کسی تأمل و تردّد کے سڑکوں پر پھنکوادیں اور ذرا غم نہ کیا۔ حرمت کے اعلان کے بعد اور ناپاکی کا علم رکھنے کے باوجود عہدِ صحابہ میں اللہ کے کسی بندے نے عادت سے

مجبور ہوکر ایک دفعہ شراب پی لی تھی تو نبی کریم ﷺ نے اس جرم کی پاداش میں اس کی پٹائی کرنے کا حکم دیا، اسی وقت:

"صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے ہاتھ سے، کسی نے کپڑے سے، اور کسی نے جوتے سے اس کی پٹائی کی۔" (بخاری)

پھر شراب کی یہ حرمت صرف کسی متعین اور مخصوص شراب کے سلسلہ میں ہی نہیں ہے بلکہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے کہ

"ہر وہ چیز جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔" (مسلم:۲۰۰۱)

اس ضابطہ کے تحت تمام منشیات ومخدرات کو ـــــ خواہ زمانۂ رسالت میں وہ متعارف ہوں یا نہ ہوں ـــــ حرام قرار دے کر امت کو اس سے سختی کے ساتھ اجتناب کرنے کا پابند کیا گیا۔

مسلمانوں کے سماج میں جب تک اسلامی تعلیمات کی تعلیم وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کی ترویج رہی، لوگ شراب کے نام سے نفرت کرتے اور اس کے تصور سے بھی تکدر محسوس کرتے رہے، اور جب سے شامتِ اعمال نے مسلمانوں کو محرماتِ قطعیہ پر نکیر اور معروفاتِ لازمہ کی ترویج سے زیادہ شخصی نظریات اور اختلافی مسائل کی بحثوں میں الجھا دیا ہے، تب سے امت کے نوجوان غیر ضروری مسائل میں تو پھر بھی کچھ دلچسپی لے لیتے ہیں ـــــ بلکہ آج کل تو کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں ـــــ مگر قطعیاتِ اسلام اور ضروریاتِ دین سے دن بہ دن لاپرواہ وبے بہرا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

چنانچہ شراب نوشی اور دیگر نشہ آور اشیاء کا استعمال اس وقت مسلمانوں کے نوجوان طبقہ میں عام ہوتا جا رہا ہے، گٹکے سے لے کر حقّے تک اور براؤن شوگر سے لے کر شراب تک کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس میں امت کے نوجوان مبتلا نہ ہو رہے ہوں، کالج کلچر کے نام پر تو ہر حرام کو حلال کر لیا گیا ہے، اور ماں باپ اور اساتذہ جانتے بوجھتے سب کچھ گوارا کر رہے ہیں۔ آج کل بڑے شہروں میں باقاعدہ حقّے کے دربار سجے سجائے قائم ہوتے جا رہے

ہیں، ان کے مالکین پاک و معطر اشیاء کا دھوکہ دے کر لوگوں کو دعوتِ ذائقہ دے رہے ہیں، مگر گاہکوں کو عادی بنانے اور اپنا کاروبار جمانے کے لیے اس میں افیون کی آمیزش بھی کرر ہے ہیں۔ اسی طرح خطرناک قسم کے گھٹکے عام ہو گئے ہیں، خصوصاً مصروف و مشغول لوگ حتیٰ کہ مدارس دینیہ کے طلبہ و اساتذہ اور مساجد کے مؤذنین و ائمہ بھی آج کل اس کے بہت عادی ہو گئے ہیں، جب کہ ان چیزوں کے استعمال کرنے والے اپنے حال و انداز سے صاف طور پر مست و مخمور نظر آتے ہیں۔ والعیاذ باللہ

متعدد نوجوانوں اور کالج اسٹوڈنس کے ذریعہ معتبر خبریں مل رہی ہیں کہ متمول مسلم نوجوانوں سے لے کر غریب پیشہ ور بچوں تک سب ہی کسی نہ کسی قسم کے نشہ کی عادت میں مبتلا ہیں، اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ایسی محافل و مواقع میں معمر لوگ کم اور چودہ پندرہ سال کے لڑکے اور لڑکیاں بڑی تعداد میں نظر آ رہی ہیں۔

سماج کی اس شرمناک صورتحال کا مقابلہ کرنے اور ملت کی نوجوان نسل کو راہِ راست پر لانے کے لیے علماءِ کرام، زعمائے اسلام، سماجی خدمت گذار اور ہر طبقہ سے وابستہ دردمندانِ قوم کو اس طرف متوجہ اور کمربستہ ہونے کی ضرورت ہے، ورنہ بعد میں پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو اس مسئلہ کی طرف خصوصی توجہ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(اداریہ: فروری ۲۰۱۱ء)

(اداریہ: مارچ ۲۰۱۱ء)

عالم عرب میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا؟

بچپن میں کہیں پڑھا تھا کہ کسی بستی میں ایک جابر و ظالم پہلوان رہا کرتا تھا، ایک سائل نے اس سے اپنا دکھ درد سنا کر کچھ مدد چاہی، اس نے جھڑک دیا، سائل نے اصرار کیا تو ایک پتھر اٹھا کر اسے مار دیا، غریب بھکاری کو تکلیف تو بہت ہوئی مگر اتنے بڑے آدمی سے نہ وہ بدلہ لے سکتا تھا نہ پوچھ سکتا تھا، صبر کر لیا، پتھر اٹھا کر اپنے جھولے میں ڈال لیا اور چلتا بنا، کہتے ہیں کہ وہ بھکاری اس پتھر کو بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھتا تھا، لوگ وجہ دریافت کرتے تو جواب دیتا کہ "کبھی کام آئے گا"۔ ایک دن وہ کہیں جا رہا تھا اسے پتہ چلا کہ بستی کا وہ ظالم پہلوان کسی کنویں میں گر پڑا ہے، نکلنے کی صورت نہیں بن رہی ہے، بھکاری کنوے پر پہونچا اور اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جھولے سے پتھر نکال کر اس کے اوپر دے مارا، وہ کہنے لگا ہائے! یہ تو مدد کا موقع ہے، بھکاری نے کہا جب تو نے مجھ پر ظلم کیا تھا تب میں کمزور تھا، وہ بھی مدد کا موقع تھا مگر اس وقت تجھے قوت و دولت کا نشہ تھا، میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا جب تو کمزور ہو جائے، تب میں اس ظلم کا بدلہ لے سکوں۔

دنیا میں قدرت کا قانونِ مکافات جاری ہے، ہر ظالم کو ظلم کا مزہ چکھنا پڑتا ہے، ہر فرعون کو موسیٰ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کمزور کبھی طاقتور ہو جاتے ہیں اور طاقتور کمزور بن جاتے ہیں، غریب کے جود و سخا کا مرکز بن جاتے ہیں اور مال و دولت کے مالک کاسۂ گدائی لئے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، تاریخ انسانیت اس کی گواہ ہے کہ صبح کا وزیر اعظم شام ہوتے ہوتے اسیر اعظم کہلانے لگا، جس ڈکٹیٹر کے مجسمے کے آگے سر جھکا کر جانا پڑتا تھا اسی مجسمے کو لوگوں نے جوتوں سے روندا اور لاتوں سے مارا۔ قدرت کے پاس دیر ہے پر اندھیر نہیں ہے۔

عالمِ عرب کی صورتِ حال اس وقت یہی ہے، تیونس، مصر اور لیبیا کے بعد بحرین، الجزائر، یمن اور اومان کی عوام نے بھی جبر و استبداد کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار اور عوامی حکومت کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا ہے، ہر طرف افراتفری کا ماحول ہے، کبھی ان ملکوں کی عوام اپنے حکمرانوں اور مطلق العنان شہزادوں کے ظلم و بربریت سے کراہ رہی تھی اور اب موت کو سروں پر منڈلاتا ہوا دیکھ کر حکمرانوں کی نیند اڑ گئی اور شہزادوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہیں، عیش و عشرت کے سب نقشے خاک میں مل گئے ہیں، حاکمیت و آمریت کے نشے کافور اور ماہ رویوں اور دوشیزاؤں کی صحبتیں دور ہو گئی ہیں، کمزوروں نے طاقتوروں کو آنکھیں دکھانی شروع کر دی ہے اور محکوموں نے حاکموں کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ان ممالک میں ـــــ جہاں اب بڑے بڑے جابر و سفاک حکمراں بے بس و عاجز نظر آ رہے ہیں، ـــــ اب تک کیا صورتحال تھی وہ لمبی داستان اور دنیائے انسانیت کی شرمناک تاریخ ہے، اسلام تو خیر ان ملکوں میں عرصے سے مظلوم تھا ہی، رعایا بھی مملوکیت و غلامی کا شکار تھی، مالداروں اور حکمرانوں کے علاوہ کوئی خوش نہ تھا، زبان سے چاہے کچھ بھی کہتے رہے ہوں عمل سے تو ہر حکمران اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا مدعی نظر آ رہا تھا، حد یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اللہ کا دین اسلام اور اس کی کتاب قرآن مجید بھی نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کی محتاج سمجھی جا رہی تھی، کیونکہ اس کے احکام اُن کی ہوسوں کو پورا کرنے میں حائل تھے۔

جب ضرورت ہوتی یہ حکمران بڑے فخر سے اسلام کا نام لیتے اور جب جی چاہتا اسلام کو مولویوں کے ذہنوں کی اختراع اور علماء کے دماغوں کی پیداوار قرار دیتے۔ علماء پر پابندیاں، خطباء کی زبان بندیاں، مجاہدین اسلام اور داعیانِ حق کی گرفتاریاں اور علمبردارانِ حق پر ظلم و زیادتیاں ان وحشی درندوں کا روزمرہ کا معمول بلکہ دل پسند شوق ہو گیا تھا، کیسے کیسے علماءِ کرام اور کیسی کیسی عظیم انقلابی شخصیتیں ان حکمرانوں کے ہاتھوں تہِ تیغ ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ اور مغربی آقاؤں کی مدد سے اسلام کی ہر طاقت کو دبایا

اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً کا نعرہ لگایا تھا، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کب تک ان کی دال گلنے والی تھی؟ آج یہی لوگ ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' کی عبرت ناک تصویر بنے نظر آرہے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارُ...

ان ممالک کی مجبور ومظلوم عوام نے جب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا تو ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق وقت کی حکمراں طاقتوں اور مغرب کے پروردہ جانوروں سے ٹکرا کر اور انہیں آنکھیں دکھا کر ساری دنیا بالخصوص عرب دنیا میں اٹھا پٹک کے اصل ٹھیکے دار ''اسرائیل وامریکہ'' کی آنکھیں کھول دیں کہ ؎

ظلم پھر ظلم ہے حد سے بڑھے گا تو تھم جائے گا

یہ بھی جتلا دیا کہ عوام کی طاقت کتنی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ فلسطینی، عراقی اور افغانی عوام دنیا کی سوپر پاورز کو واپس جانے پر مجبور کررہے تھے تو تیونس، لیبیا، مصر اور دیگر عرب ممالک کی عوام حکمرانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ کررہی ہیں۔

بہر حال عوام نے تو اپنی قوت دکھادی اور لوہا منوالیا، مگر اب ان ملکوں کے اقتدار کی جانب بڑھنے والوں کی آزمائش ہے، مغرب بالخصوص اس کے نیتا ـــــ امریکہ واسرائیل ـــــ صورتحال پر قریبی وگہری نظر رکھے ہوئے ہیں، وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ عوامی انقلاب کے بعد روبہ عمل آنے والی تبدیلیاں اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہوں، ان خود غرض نیتاؤں اور نام نہاد خیر خواہوں کو اپنے مفادات اور یہودی مقاصد سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ بے چارے عوام نے تو جانوں پر کھیل کر اور خطروں کو مول کر اپنا فریضہ ادا کردیا اور غلبۂ اسلام کی راہیں ہموار کردیں مگر.......... آگے قلم کو یارائے تحریر نہیں! قلم رکھ کر ہاتھ اٹھانے کو جی چاہتا ہے کہ بارِ الٰہا! نہتے، بے قصور، مظلوم ومقہور بچے بوڑھے اور جوانوں نے مل کر بڑی قربانیوں اور بڑی امیدوں سے جو ماحول بنایا ہے اپنے کرم سے اس کا فائدہ اسلام اور مسلمانوں ہی کو پہونچادے، دشمنانِ اسلام کے حریص وخونیں ہاتھوں کو ان ممالک کی طرف بڑھنے سے بچالے، تیرے سوا کوئی مظلوموں کا مددگار نہیں۔ آمین یارب العالمین۔

گرما کی چھٹیاں اور ان کا استعمال

گرما کی تعطیلات سامنے ہیں، قدرے تفاوت سے تمام اسکولوں میں چھٹیاں شروع ہوجائینگی، کالجس میں بھی تعلیم بند ہوجائیگی، کھیل کود، تقریب وتفریح، اور ملاقاتوں دعوتوں کے پروگرام بن ہی رہے ہوں گے، مالدار اپنے ذوق کے مطابق اور غرباء اپنی حسبِ استطاعت چھٹیوں کے استعمال کی ترتیب ہر سال بنالیتے ہیں، ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے، گذشتہ سال خلیج کے مدارس میں تعطیلات تھیں تو یہ راقمِ سطور حرمین شریفین میں تھا، دن بہ دن مختلف خاندان مختلف ذرائعِ سفر سے پہونچتے جارہے تھے، مگر دو چیزیں دیکھ کر بڑا افسوس ہوا، ایک تو یہ کہ یہ آنا ذوقِ عبادت کے بجائے ذوقِ تفریح کے طور پر تھا، نماز پڑھ لی اور صحن میں بنی چھتریوں کے نیچے گروہ در گروہ کھانے پینے، ہنسی مذاق کرنے، ایک دوسرے کے فوٹوز لینے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے میں ایسے مشغول جیسے نبی ﷺ کی مسجد میں نہیں کسی پارک میں آئے ہوئے ہوں۔ دوسرے بچوں اور بچیوں کے لباس کہ جس میں کسی قسم کی اسلامیت نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ان فیملیوں کو ــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ــــ نہ تلاوت کا اہتمام نہ ذکر نہ دعا درود بلکہ تفریح اور صرف تفریح سے مطلب! اسی اثناء میں جمعہ آیا تو امام صاحب نے خطبہ میں جو کچھ فرمایا وہ میرے اس احساس کی توثیق تھی، انہوں نے بہت مؤثر انداز میں توجہ دلائی کہ گرمی سخت پڑ رہی ہے گویا سورج آگ اگل رہا ہے، ایسے مواقع پر پہلے زمانے کے لوگ رجوع الی اللہ ہوتے تھے، متعدد بزرگوں کے حالات وملفوظات سنا کر انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ آج کل گرمی کا حل یا تو یورپ کے فحش ماحولوں میں ڈھونڈا جارہا ہے یا فارم ہاؤس اور سوئمنگ پولس کے سرد خانوں میں دریافت کیا جارہا ہے!

حرمین شریفین آ رہے ہیں تو بھی تفریح کے طور پر آ رہے ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو لاکھوں مسلمان بچوں کی تعطیلات کا زمانہ ان کے سرپرستوں اور علماءِ دین کے لئے ایک چیلنج ہے، مدارس دینیہ میں با قاعدہ تعلیم حاصل کرنے والے بھی دو تین فیصد سے زائد نہیں، سچر رپورٹ میں چار فیصد غالباً بتلایا گیا تھا، اسے بھی مان لیا جائے تو چھیانوے فیصد مسلم بچے دین اور علم دین سے دور ہیں، نہ صرف علم دین سے دور ہیں بلکہ بے دینی کے اسباب سے قریب تر ہیں، جن اسکولوں اور کالجس میں یہ بچے پڑھتے ہیں وہ اگر غیر مسلمین کے ہیں تو پھر پوچھنا ہی کیا ہے، اگر مسلمانوں کے ہیں تو بھی مشنری انداز ہی کے ہیں، اکثر اسکولوں کے ذمہ دار مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مشرقی تہذیب سے نالاں قسم کے لوگ ہیں، ان سے بچوں کی دینی تعلیم اور مذہبی تربیت کی توقع فضول ہے، گھروں کے ماحول جیسے ہو گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہے، ماں باپ کو اپنے بچوں کی دنیا کی فکر جس قدر ہے اس کا دس فیصد بھی ان کی دین کی فکر نہیں ہے۔

اگلی نسل کو اسلامی مزاج پر دیکھنے کی اب کیا صورت ہے؟ ان بچوں کو قرآنِ کریم کی تعلیم دینے اور دینیات و اسلامیات سے واقف کرانے کا آخر کیا طریقہ ہے؟ علماءِ کرام کا ان سے کوئی رابطہ نہیں، معلّمین و مدرّسین کو مدرسہ کی ذمہ داریوں سے فرصت نہیں، دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کا نشانہ بڑی عمر کے لوگ ہیں چھوٹے بچے نہیں۔ ملتِ اسلامیہ کا یہ معصوم طبقہ دس مہینے تک اسکول میں سر کھپانے کے بعد دو مہینے کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ اگر مالدار ہے تو تقریب و تفریح میں نکال دیتا ہے اور اگر غریب ہے تو سڑکوں کی گردش و آوارگی میں صرف کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دو مہینوں کا دینی و اسلامی تعلیم کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا؟ ضرور ہو سکتا ہے، بشرطیکہ:

۱) والدین اس معاملہ میں سنجیدہ ہوں، وہ رشتہ داروں سے ملاقات، تقریبات میں شرکت، اور تفریحات کے پروگراموں پر اپنے بچوں کے دین و ایمان اور تعلیم و تربیت کو

ترجیح دیں، وہ اپنے بچوں کے تئیں اپنے اوپر تربیت کی عظیم ذمہ داری کا احساس کریں، قیامت کے دن کی باز پرس کو سوچیں، خود بچوں کو شعور آنے کے بعد والدین کی اس حق تلفی کا جو شکوہ ہوگا اس پر غور کریں۔ اور یہ طئے کرلیں کہ تعطیلات کی فرصت میں ہر مصلحت اور ہر سماجی و معاشرتی تقاضے کو پیچھے ڈال کر یا کم از کم محدود کرکے ہم اپنے بچوں کو دینی و مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کا معقول انتظام کرینگے، خواہ اس کے لئے کتنا ہی ایثار کیوں نہ کرنا پڑے

۲) علماءِ کرام، عالماتِ اسلام، ائمہ مساجد، مدارسِ دینیہ کے معلّمین و مدرسین اپنے اپنے محلوں میں جس قدر ہوسکے گرمائی مکاتب کا انتظام و اعلان کریں، اور روزانہ کم از کم تین تا چار گھنٹے مکتب چلائیں، ایک جامع و آسان نصاب مقرر کریں اور اس کی تکمیل پر جلسہ عام کرکے بچوں کو اپنی سیکھی باتوں کے مظاہرہ کا موقع دیں، انعام سے نوازیں اور اس زائد وقتی محنت کو اپنی آخرت کا سودا اور وارثِ انبیاء ہونے کا بنیادی تقاضہ تصور کریں۔

۳) مساجد و مدارس کے ذمہ دار حضرات اپنی مسجدوں اور مدرسوں کے اندر اور ہوسکے تو قرب وجوار میں جس قدر ممکن ہو گرمائی کلاس کا انتظام کریں، مسجدوں میں رسمی مکاتب تو چلتے ہیں جو اکثر بے فیض اور ضابطہ کی خانہ پُری کے طور پر ہوتے ہیں، ضرورت مؤثر طریقے پر کام کرنے کی ہے، زائد اور عارضی تقرر کرنا پڑے تو کریں، خرچ کرنا پڑے تو کریں، بجٹ منظور کرلیں، گنجائش نہیں ہے تو فنڈنگ کریں، آج کل مساجد و مدارس میں تزئین و تسہیل کے لئے کیا کچھ صرف کیا جارہا ہے، لاکھوں روپیہ لوگ دے بھی رہے ہیں، اس کو عمارتوں میں کھپایا بھی جارہا ہے، آخر بنیادی مقاصد ہی کیلئے سرمایہ کی کمی کا رونا کیوں؟

۴) ان بچوں کا مزاج ذرا مختلف ہوتا ہے، اکثر شوخ و تیز ہوتے ہیں، مدارس دینیہ کے طلبہ کی طرح سکون سے نہیں بیٹھ پاتے، اساتذہ کو بھی کچھ نہیں سمجھتے، اس لئے کہ ایک تو ان بیچاروں کو ان باتوں کی تلقین ہی نہیں ہوئی، دوسرے عمر کا تقاضہ بھی ہوتا ہے، اس لئے اساتذہ متحمل مزاج اور سب کچھ گوارا کرتے ہوئے کام کرنے والے ہوں، انہیں بھی باقاعدہ

ہدایات دی جائیں اور طریقۂ کار قولاً وعملاً سمجھایا جائے، تاکہ ہر طبقۂ سماج کے بچے شرکت واستفادہ کرسکیں۔

۵) کوشش کی جائے کہ ایک جامع نصاب ۵۰ سبقوں پر مشتمل پہلے ہی مرتب کرلیا جائے، جس میں تجوید قرآن کے علاوہ اسلامی عقائد، مسنون دعائیں اور بنیادی فقہی مسائل شامل ہوں۔ چھوٹی چھوٹی حدیثیں بھی ازبر کرائی جائیں۔ نیز ہفتہ واری اجتماع کے ذریعہ سیرتِ نبوی، سیرت خلفاءِ راشدین، عظمتِ صحابہؓ اوراخلاقیات کے مختلف عناوین پر بچوں کی فہم کے مطابق تاریخی واقعات کی مدد سے سلسلہ وار لکچرز دیے جائیں، اس کا بہت نفع ہوتا ہے۔

۶) بالغین وبالغات کے لئے بھی مستقل نظم ہونا چاہیے، کالج کے لڑکوں کو کم ازکم دو گھنٹوں کے لئے جوڑا جائے، اس کے لئے ان کی نفسیات اور ضرورت کے لحاظ سے نظام العمل بنایا جائے، ہوسکے توان کی اپنی تعلیم میں مدد کرنے کی کوئی صورت بھی سوچی جائے کہ اس بہانے انہیں اس طرف میلان ہو، اس وقت ۱۳ تا ۲۰ سال کے بچوں کا حال بہت بُرا ہوتا جارہا ہے، ہرقسم کی بُری عادتیں پیدا ہوتی جارہی ہیں، اور کچھ نہیں تو بے دینوں اور فلم اسٹاروں کی نقالی، آوارہ گردی اور ٹھٹھا تماشہ ان کا دلچسپ مشغلہ ہوتا جارہا ہے، دین سے دوری کا یہ عالم ہے کہ اکثر نوجوان دین کو پُرانے زمانے کی باتیں سمجھنے لگے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ غور کرنے سے اہل علم وصلاح کو بہت تدبیریں اور نافع طریقے سمجھ میں آسکتے ہیں، یہ بات نہیں ہے کہ امت میں باصلاحیت لوگ نہیں ہیں، بات صرف یہ ہے کہ فکر واحساس کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ ان سطروں کے ذریعہ بس اسی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

آج ہی ظہر کی نماز ایک دیہات کی مسجد میں پڑھنے اور مقامی لوگوں سے بات کرنے کا موقعہ ملا، گاؤں میں معلوم ہوا کہ ساڑھے چارسو مسلم مکانات ہیں، مسجد میں کُل نوافراد نماز

کے لئے آئے تھے، جس میں سے سات بوڑھے اور دو نوجوان تھے، ایک چھوٹی سی مسجد قدیم زمانے کی بنی ہوئی ہے، میں نے بوڑھے حضرات سے عرض کیا کہ اگر ہر گھر میں دو آدمی مسجد جانے کے قابل مان لئے جائیں تو بھی نوسو ہو جاتے ہیں جبکہ نومسلمان مسجد میں آئے ہیں، گویا سو میں ایک آدمی کا مسجد سے تعلق ہے اور ان نو میں نوجوان صرف دو ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بوڑھوں کے گذر جانے کے بعد مسجد میں صرف دو ہی مصلّی رہ جائینگے، آپ سوچئے کہ ہمارے بڑوں نے ہمیں نمازی بنایا، مسجد سے جوڑا، تو ہم اس بڑھاپے تک جڑے ہوئے ہیں، اب اگر ہم اپنے بچوں کے لئے یہ فکر نہ کرینگے تو وہ کیسے مسجدوں سے جڑیں گے؟ ہمارے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے شادی نہ کر کے عبادات میں مشغول رہنے سے شادی کر کے اس کی الجھنوں میں مشغول ہونے کو افضل سمجھا، تا کہ ہم بھی عبادت کریں اور ہمارے بعد ہمارے ذریعہ سے عبادت گذاروں کی ایک جماعت دنیا میں چھوڑ جائیں، امام صاحبؒ کی یہ بات ہے بھی بڑی معقول، مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اولاد پیدا کر کے تھیٹروں، بازاروں اور سڑکوں کی رونق بڑھانے اور شراب وکباب کی محفلیں جمانے میں مدد کر رہے ہیں، مسجدیں ویران ہیں اور حقے پارلرز آباد ہیں، جس برائی میں دیکھو مسلم مرد اور عورتیں پیش پیش نظر آ رہی ہیں۔

پھر میں نے ان لوگوں سے معلوم کیا کہ گاؤں میں اسکول کتنے ہیں؟ بتایا گیا کہ ایک گورنمنٹ اسکول ہے ایک پرائیوٹ، دونوں میں کل ملا کے ایک سو بیس بچے بچیاں پڑھ رہے ہیں! میں نے عرض کیا کہ اگر گاؤں کے ہر گھر میں پڑھنے کے قابل دو بچے بھی مان لئے جائیں تو نوسو بچے محتاجِ تعلیم ہیں، اور ایک سو پڑھ رہے ہیں باقی آٹھ سو بچے کہاں ہیں؟ ان معصوموں مظلوموں کا کون جوابدہ ہے؟ یہی جاہل بچے جو آج گلی کوچوں میں صبح کو شام کر رہے ہیں، کل کے جاہل نوجوان اور پرسوں کے جاہل ماں باپ ہوں گے، کیا چند فکرمند لوگ اور مسجد کے پیش امام صاحب اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ کسی طرح محنت کر کے اسکول میں

بچوں کی تعداد دوگنی کردیں، بچے بڑھیں گے تو حکومت اساتذہ کو بھی بڑھائیگی عمارت بھی بڑھائیگی، اس میں تو اپنا کچھ خرچہ بھی نہیں ہے، مگر بات وہی فکر و احساس کی کمی کی ہے۔

گاؤں کے ان نونمازیوں اور امام صاحب نے بہت اہتمام سے یہ باتیں سنیں، حالاً وقالاً ان باتوں سے اتفاق کیا اور کچھ کرنے کا وعدہ بھی کیا، جب یہ لوگ میری باتیں توجہ سے سن رہے اور چہرے بشرے سے بات سمجھ میں آنے کا اشارہ کرتے جارہے تھے، تب میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم بے حس بھی نہیں ہوئی ہے، ہماری طرف سے انہیں احساس دلانے میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ بے شک علماءِ کرام بہت کچھ کر رہے ہیں، لیکن شاید ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ کا علماء کے نام پیغام ہے۔

رحمت کا ابر بن کر سارے جہاں پہ چھائیے
عالم یہ جل رہا ہے، برس کر بجھائیے

اور ہمارے حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر علماء کی مجلس میں بڑے سوز و درد سے سنایا کرتے تھے۔

دل میں لگا کے ان کی لو،
کردے جہاں میں نشر ضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سو،
بزم میں روشنی نہیں

اللہ کرے کہ ہمیں قوم کے ان لاکھوں محروموں کے لئے کچھ کرنے کی توفیق ملے۔ آمین (اداریہ: اپریل ۲۰۱۱ء)

کرنے کے چند اہم کام یہ بھی ہیں

مال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جس کو یہ دولت ملی ہے اس پر اس کے صحیح استعمال کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، حدیث میں ہے کہ بنی آدم کے قدم محشر سے اس وقت تک ٹل نہیں سکتے جب تک کہ اس سے پانچ امور سے متعلق مواخذہ نہ کرلیا جائے، عمر کے بارے میں، جوانی کے بارے میں، مال کے ذرائع حصول کے بارے میں، مال کے مواقعِ صرف کے بارے میں اور اپنے علم پر عمل کے بارے میں۔ (ترمذی: ۲۳۵۳) ان پانچ اہم سوالات میں سے ــــــ جن کا جواب دیئے بغیر اللہ تعالیٰ کے سامنے سے ہٹ سکنا تو بہت دور کی بات ہے آدمی قدم بھی نہیں ہلا سکتا ــــــ دو سوال مال ہی سے متعلق ہیں۔ کہاں سے کمایا؟ کہاں خرچ کیا؟ معلوم ہوا کہ جس طرح مال کا حلال وطیب ذرائع اور جائز طریقوں سے کمانا ضروری ہے وہیں ان کے مصارف کا معقول اور مناسب ہونا بھی ضروری ہے، نامعقول اور ناجائز طریقے سے کما بھی نہیں سکتا اور خرچ بھی نہیں کرسکتا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مال بندے کی مجازی ملکیت ہونے کے باوجود حقیقت میں امانتِ خداوندی ہے اور مالکِ حقیقی کے منشاو مرضی کی اس میں رعایت لازمی وضروری ہے۔

اس کے باوجود اگر غور کیا جائے تو یہ بات بہ آسانی سمجھی اور مانی جاسکتی ہے کہ اس زمانے میں جو مالدار بے دین ہیں اور حلال وحرام کی تمیز کے بغیر کماتے اور خرچ کرتے ہیں ان کا تو کہنا ہی کیا ہے، جو مالدار دین پسند اور سنجیدہ وسمجھدار ہیں وہ بھی اگرچہ کمانے میں حدودِ

جواز کی رعایت رکھتے ہیں مگر خرچ کرنے میں اس کا بھرپور خیال نہیں کرتے کہ معقول اور مناسب مصرف میں ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کام کے لئے اتنی مقدار ضروری ہے یا اس سے کم میں بھی کام چل سکتا ہے؟ یہ کام زیادہ ضروری ہے یا اس سے بھی انفع اور اہم کوئی اور کام ہوسکتا ہے؟ بعض تو انفاق فی سبیل اللہ میں تقاضۂ وقت اور رواجِ زمانہ سے زیادہ کچھ نہیں دیکھتے۔ مثال کے طور پر ہمارے دیار کے عوام ایصالِ ثواب کے لئے مسجد میں پاروں کا سیٹ بھیجنے کے رواج پر کچھ سوچے سمجھے بغیر اب تک بھی عمل کرتے چلے آرہے ہیں، کسی زمانہ میں جب قرآن مجید چھپے ہوئے نہیں ہوتے تھے، بمشکل فراہم ہو پاتے تھے تب بے شک مساجد میں متعدد نسخوں کی فراہمی کارِ ثواب تھا، حدیث میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن جب قرآن مجید کے نسخوں اور سیپاروں کے سیٹ کثرت کی وجہ سے رکھے رکھے بوسیدہ ہورہے ہوں اور اس قدر زیادہ ہوں کہ سال بھر میں ایک دفعہ بھی استعمال کی نوبت نہ آتی ہو کیا اس وقت بھی یہی کارِ خیر ایصالِ ثواب کا بہتر ذریعہ ہوگا یا اس سے بہتر کی تلاش عقل وعلم کا تقاضہ ہونا چاہیے؟ اسی طرح لوگوں کو کھانا کھلانے کی کتاب وسنت میں بڑی فضیلت آئی ہے ایک دور تھا جب کہ لوگ ایک وقت کے کھانے اور نانِ جویں کو ترستے تھے، غریبوں کے بچے بھوکے پیٹ ہی تھپک تھپک کر سلا دئے جاتے تھے، لیکن آج جب کہ ایسے بھوکے تلاشِ بسیار کے باوجود ملنے مشکل ہوں کھانا کھلانا ہی بڑی فضیلت کی بات ہے یا انسانوں کی کوئی دوسری ضرورت جو اشد واقدم ہو پوری کرنا اس سے زیادہ ثواب کی بات ہوسکتی ہے؟ یا جیسے عرب اہلِ خیر کا حال ہے کہ وہ مسجد بنانے سے زیادہ ثواب کا کوئی کام نہیں سمجھتے، ان سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بنی بنائی مساجد کی آبادی بھی معرضِ خطر میں ہے اور کتنی ہی مسجدیں جہل وبے دینی کے نتیجے میں ویران پڑی ہیں اس کے بجائے مدارس ومکاتب کی تعمیر میں حصہ لیجئے، جن کے ذریعہ دین زندہ ہوگا اور نمازی وجود میں آئیں گے اور جب نمازی ہوں گے تو مسجدیں خود بخود بنیں گی مگر یہ حقیقت کسی طرح ان کے فہم وادراک میں جگہ

نہیں پا سکتی، مسجد بنانا ہی ان کے نزدیک ثواب کا کام ہے خواہ ویران ہی کیوں نہ ہو جائے۔

حاصل یہ ہے کہ بہت سے متمول لوگ راہِ خدا میں صرف کرنے کے متمنی ہوتے ہیں مگر اس کے لئے مواقعِ صرف کا انتخاب ضرورت کے مقابلہ میں خواہش کی بنیاد پر کرتے ہیں، آج کی صحبت میں اسی امر کی طرف اہل خیر طبقے کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے کہ آج کل بڑے شہروں میں مدارس اور مساجد کی تعمیرات کا معیار اور ان کی مقدار اکثر جگہ ضرورت کے مقابلے میں خواہش اور چاہت کے موافق ہوتی جا رہی ہے، کسی زمانے میں جب بادشاہوں اور نوابوں کا دور تھا جس طرح تاریخ ساز اور یادگار عمارات ذاتی یا مملکتی زرِ کثیر صرف کر کے بنائی جاتی تھیں اسی قسم کی مسجدیں اور مدرسے بنانے کا آج کل بھی رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ جہاں کام کی وسعت کی وجہ سے وسیع عمارات کی ضرورت ہے وہاں تو خیر کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ہونی چاہیے، لیکن جہاں ضرورت اس معیار و مقدار کے مصارف کی داعی نہ ہو وہاں بھی اس قسم کے مصارف کی کیا کوئی معقول توجیہ ہو سکتی ہے؟ کئی مقامات ایسے ہیں جہاں مسجد وسیع و عریض اور آراستہ پیراستہ ہے مگر مصلّی معدودے چند، بعض جگہ مدرسہ کی عمارت کافی لمبی چوڑی ہے مگر طلبہ پچیس پچاس، سو سوا سو ہیں، جب کہ اتنی عمارت دو چار سو بلکہ ان سے بھی زیادہ طلبہ کے کام آ سکتی ہے، پھر یہ ایسے وقت جب کہ اسی علاقہ میں اس سے اہم کام اور قومی مسائل محض سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے تشنۂ توجہ ہیں۔ مثلاً ایک علاقہ میں ایک مسجد کے بارے میں معلوم ہوا کہ دس کروڑ روپے سے تعمیر ہوئی ہے، دیکھنے میں کوئی اتنی بڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی، پوچھنے پر اس بے تحاشہ صرفہ کی کئی وجوہات بتائی گئیں جن میں سے کوئی بھی ضرورت کے درجہ کی نہ تھی محض پسند اور چاہت کا معاملہ تھا، جب اسی مسجد کے اطراف میں آباد مکینوں کی معاشی، دینی اور اخلاقی حالات کا جائزہ لیا گیا تو وہ جہالت و عیسائیت زدہ نکلے۔ ایسے میں سمجھ میں نہ آ سکا کہ مسجد ہی کی تعمیر میں اس قدر خطیر رقم کیوں صرف کی گئی۔ کم از کم اس کی آدھی رقم سے بھی ایک دو اسلامی نہج کے اسکول، ایک دو اسلامی

نیچ کے کلینک، دس بیس ابتدائی تعلیم کے دینی مکاتب قائم کردئے جاتے تو علاقہ کے مسلمان خوشحال بھی ہوتے، جہالت کچھ نہ کچھ دور ہوتی اور ارتداد کے خطرات کسی نہ کسی درجہ میں کم ہوتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی شعور پیدا ہونے کی برکت سے یہ مسجد آباد اور مصلیوں سے شاد ہو جاتی۔

مجھے ایک مخصوص علاقے کے دیہاتوں میں شُدبُد دین کی خدمت کا بفضلہٖ تعالیٰ گذشتہ چند سال سے موقع مل رہا ہے، ایک چھوٹے سے دیہات میں ایک عرب صاحب نے شادی کی، انہیں وہاں مسجد بنانے کا خیال ہوا، ان کے مدِنظر صرف رقم تھی کہ پچاس لاکھ روپئے خرچ کرکے مسجد بنانا ہے، باقی کسی مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، گاؤں والوں نے اتنی بڑی مسجد کو بے ضرورت بتلایا، قریب کے بڑے گاؤں کی نشاندہی کی جہاں اس کا صحیح مصرف ہوسکتا تھا، مدرسے یا اسکول کھولنے کی ترغیب دی، ہاسپٹل قائم کرنے کا مشورہ دیا، کوئی بات قبول نہیں، مسجد بنے گی اسی گاؤں میں بنے گی اتنی ہی رقم کی بنے گی، ایک آرکیٹیکٹ کو شہر سے بلاکر اس کے ذمہ یہ خدمت کی گئی، اس نے سارا پیسہ صرف کروادیا، آپ یقین جانیں کہ گاؤں میں دس بارہ مسلم مکانات ہیں، ان کے لئے پانچ لاکھ میں بھی شاندار مسجد بن سکتی تھی مگر پچاس لاکھ کے صرفہ سے ایک مسجد وہ بھی ادھوری بناکر چھوڑ دی گئی، دو تین آدمی بھی نماز پڑھنے والے نہیں ہیں۔

آندھرا پردیش کے ایک ضلع سے تعلق رکھنے والے صاحبِ خیر دبئی میں رہتے ہیں، اللہ پاک نے انہیں انتہائی غربت سے انتہائی دولت تک پہونچایا، آدمی متواضع اور شکر گذار ہیں مگر جو لوگ ان کی دولت کو دین کے نام پر برباد کررہے ہیں وہ رہبروں کی شکل میں رہزن سے زیادہ کچھ کہلانے کے قابل نہیں ہیں۔ ایک صاحب نے انہیں ایک اسکول کھولنے کا مشورہ اور منصوبہ دیا، انہوں نے چہرے بشرے اور ہمدردانہ ودردمندانہ باتوں سے متأثر ہوکر قبول کرلیا، جس جگہ یہ کام شروع کیا گیا وہاں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے

برابر ہے، ایک بہت بڑی زمین خریدی گئی، تعمیر شروع ہوئی، دورانِ تعمیر اس عاجز کو بھی معائنہ کروایا گیا تھا، جو معیار اور میٹریل استعمال کیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر بے ساختہ ضمیر نے پکارا اَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ؟ ایک غیر اقامتی درسگاہ کے لئے جس میں مستقبل بعید تک بھی چند سو سے زائد بچے نہیں مل سکتے بلاشبہ کروڑوں روپئے اس شخص کے لگوائے جا رہے ہیں، یہ کام دیانتدارانہ تجزیہ کیا جائے تو اس رقم اور اس زمین کے دسویں حصے میں بھی اچھی طرح اور اچھے پیمانے پر کیا جا سکتا تھا، بقیہ رقم سے اسی علاقے کے مسلمانوں کے بعض دیگر مسائل حل ہو سکتے تھے، یا اسی ادارہ کو مسلمانوں کی مختلف ملی و سماجی خدمات کا سرچشمہ بنایا جا سکتا تھا، مگر خرچ کرنے والے نے آنکھ بند کر کے کسی پر اعتماد کر لیا اور اعتماد حاصل کرنے والے نے دوسرے کے پیسے پر اپنی انانیت کا بھوت سوار کر لیا۔ والعیاذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔

میرے ایک شاگرد نے چند دنوں قبل ایک علاقہ میں اپنے مدرسہ چلنے کی خواہش کی جہاں وہ پڑھاتے ہیں، موقعہ نہ ہونے کی وجہ سے جا تو نہیں سکا البتہ زبانی کچھ معلومات حاصل کیں، معلوم ہوا کہ آٹھ دس برس سے مدرسہ چل رہا ہے ۳۵ طلبہ اقامتی اور اتنے ہی غیر اقامتی پڑھتے ہیں، مدرسہ زیر تعمیر ہے، اب تک ساٹھ لاکھ روپئے خرچ ہو گئے ہیں ابھی بہت کام باقی ہے۔ یہ کام کوئی شخص واحد بھی نہیں کروا رہے ہیں، عمومی چندہ سے کیا جا رہا ہے۔ بقدرِ ضرورت کام اور بقدرِ ضرورت استحکام کی میں مخالفت نہیں کر رہا ہوں، صرف ضرورت سے زائد تعمیر و تزئین کی بات ہو رہی ہے۔

اس وقت ملت کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کاموں کی ضرورت ہے اور کوئی کام بھی ظاہر ہے کہ سرمایہ کے بغیر تکمیل نہیں پاتا، اس لئے اہل خیر حضرات کو راہِ خدا میں صرف کئے جا رہے اپنے سرمایے کو علماءِ کرام کے مشورہ سے مفید سے مفید تر بنانے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں چند مشورے درجِ ذیل ہیں۔

۱) مدارسِ دینیہ کا استحکام سب سے ترجیحی ضرورت ہے، یہ مدارس ہی ہندوستان میں ملت اور مذہب کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، لیکن مدارس پر بھی اپنا سرمایہ صرف کرتے وقت کام کی مقدار اور معیار کو سامنے رکھ کر بقدرِ ضرورت صرف کریں، البتہ کام کی مقدار اور اس کے معیار کو بڑھانے میں جتنی مدد کی ضرورت ہو دریغ نہ کریں۔ جس جگہ فی الحال نہ مقدار قابلِ لحاظ ہے اور نہ معیار لائقِ اعتبار، بس وسائل واسباب کے بڑھانے اور مضبوط کرنے کی فکر ہے وہاں ہرگز صرف نہ کریں کہ یہ مال کے ضیاع اور قیامت کے مواخذہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ محدثِ عظیم شیخ محمد عوامہ نے یہاں مدرسہ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا" کبھی اس پر بھی غور کرو کہ جب مسجدِ نبوی تعمیر کے اعتبار سے خستہ ٹٹیوں اور مٹی کی دیواروں پر مشتمل تھی، بارش کا پانی بھی ٹپکتا تھا تب اس سے ہدایت کا کتنا فیضان ہوتا تھا اور اب دنیا کی نایاب تعمیر سے آراستہ ہے تو ہدایت کا کتنا کام ہو رہا ہے؟"

۲) دیہاتوں میں مختصر سی مسجد اور مسجد میں مکتب کا قیام عمل میں لایا جائے، حفاظ وعلماء اس کے لئے عموماً تیار نہیں ہوتے، اس لئے سیدھے سادے دیہی نوجوانوں کو نورانی قاعدہ اور مختصر دینیات کی تربیت دے کر انہیں کے ذریعہ یہ کام لیا جائے، ہر پچاس مکتب کے لئے ایک سینٹر ہو جو اقامتی مدرسہ کا بھی کام کرے، معلّمین کی نگرانی وتربیت کا کام بھی کرے، تنخواہوں کا اجرا اور ضروریات کی فراہمی بھی یہاں سے ہو، اس سینٹر کے ذمہ دار کے لئے موٹر سائیکل کی سہولت ہو تاکہ وہ دورے کر کے برسرِ موقع جائزہ لیتا رہے اور کام کرنے والوں کی رہبری کرے، اس سینٹر میں چند علاقائی زبان جاننے والے مبلغ بھی ہوں جو گاؤں کے دورے کر کے اسلام دشمن سرگرمیوں پر نظر رکھیں، لوگوں کے دکھ درد، موت مٹی کے مسائل میں تعاون کریں۔ تجربہ ہے کہ دیہات کے قادیانی معلّمین تعلیم کے اعتبار سے قابل تو کچھ زیادہ نہیں ہوتے مگر میدان جیتنے اور ماحول بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

۳) علماءِ کرام کے ذریعہ سے ضرورت کی جگہوں پر مستقل تعلیمی نظام والے مدارس

کے قیام کا انتظام کریں، جہاں ضرورت کم ہے وہاں کا تعاون کم کر کے جہاں بالکل کام نہیں ہورہا ہے وہاں کام شروع کرانے کی فکر کریں۔آج کل جس کے جی میں آرہا ہے بس مدرسہ کا اعلان کر کے جگہ کی خریدی اور شاندار تعمیر کے لئے جدو جہد میں لگ جارہا ہے، تعمیر کی سوفی صد فکر ہے اور تعلیم کی طرف دس بیس فی صد توجہ بھی نہیں ہورہی ہے۔

۴) مساجد میں چلنے والے مکاتب کو معیاری تنخواہ پر اچھے اساتذہ فراہم کر کے مؤثر بنائیں، اکثر مساجد میں مکاتب تو ہوتے ہیں مگر محض رسمی طور پر چلتے ہیں، امام مؤذن کی تنخواہ میں دو چار سو کا اضافہ کر کے انہیں ناقابلِ تحمل تعداد طلبہ کو پڑھانے کی ذمہ داری دے دی جاتی ہے، جس کا نتیجہ بچوں اور اساتذہ کے ٹائم پاس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، بچوں کی نہ تجوید ہی صحیح ہوتی ہے اور نہ ہی دینیات واسلامیات سے واقفیت ہوتی ہے۔

۵) مساجد سے ہٹ کر بھی محلوں کے مختلف مقامات پر جز وقتی مکاتبِ دینیہ کا قیام عمل میں لایا جائے، خواہ اس میں کتنا ہی سرمایہ صرف ہو، البتہ ان مکاتب کی نگرانی اور تعلیم وتربیت کا نظام معتبر علماءِ کرام کی نگرانی وسرپرستی میں چلایا جائے، اس سے نئی نسل کے عقیدہ وعمل اور فکر ونظر کو اسلامیانے میں بہت مدد ملے گی اور بستیوں کے ماحول میں ایک خوشگوار اسلامی واخلاقی تبدیلی نظر آئے گی۔

۶) اقامتی صنعت خانے قائم کئے جائیں، جہاں حسبِ سہولت دو تین پیشہ ورانہ ہنر سکھانے کا اہتمام ہو، ساتھ ہی بقدرِ ضرورت علمِ دین اور مسنون تربیت کا اہتمام بھی ہو، جو بچے نہ دینی تعلیم حاصل کررہے ہیں اور نہ عصری درسگاہوں سے وابستہ ہیں انہیں اس میں شریک کر کے صنعت وحرفت سے آراستہ کیا جائے، اس سے ایک طرف ان کے لئے کسبِ حلال کا بندوبست ہوجائے گا، اخلاقی خرابیوں سے محفوظ ہوجائینگے، دوسری جانب لوگوں کو بااخلاق وہنرمند کاریگروں کی فراہمی آسان ہوجائے گی۔

۷) غربت زدہ مسلمانوں اور پسماندہ بستیوں میں چھوٹے پیمانے پر اسلامی وعصری

علوم کے امتزاج کے ساتھ پرائمری درجہ کے اسکول کھولے جائیں اور گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرنے والے بچوں کو کسی طرح کچھ نہ کچھ تعلیم فراہم کی جائے، یہ کام گرچہ بہت مشکل ہے مگر پیسے کی طاقت سے بہت حد تک کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسے بچے ترغیبات وانعامات کے لالچ میں آمادۂ تعلیم ہوجاتے ہیں، ان کے والدین پچیس پچاس روپئے کی مزدوری کو تعلیم وتربیت پر ترجیح دے کر مارکٹوں کے حوالے کردیتے ہیں، بعد میں یہی بچے بدکاری و شراب خوری کے خوگر ہوکر مسلم سماج کے لئے داغ اور اپنے خاندان کیلئے آفتِ جان بن جاتے ہیں۔

۸) ایسے علاقوں میں مسلم لڑکیوں کو ٹیلرنگ اور دیگر خانہ داری کے امور کی تربیت کا نظم بھی کیا جاسکتا ہے، عورتوں میں بڑے خاموش طریقے پر عیسائیت کی محنتیں ہورہی ہیں، کافی نقصانات کے بعد یہ خبریں باہر آرہی ہیں، اس قسم کے سنٹرز اہل باطل قائم کرکے اس کو مذہبی تبلیغ کا وسیلہ بنارہے ہیں، ہم بھی ایسے مراکز قائم کرکے اپنے بھائیوں کے حفاظتِ دین و ایمان کا فریضہ ادا کرسکتے ہیں، دعوت وہدایت کی محنت تو مومن کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔

۹) مسلم ڈاکٹروں کو ترغیب دی جائے کہ وہ پیشہ ورانہ پریکٹس میں سے تھوڑا سا وقت فارغ کرکے مسلم بستیوں میں خدمت کریں، اس کے لئے متمول حضرات کلینک کے لئے جگہ اور ادویہ فراہم کرنے کی ذمہ داری لیں، اس میں دوفائدے ہیں، ایک تو یہ کہ علاج جو اس زمانے کی بیش خرچ ضرورت ہے غرباء کو بہ سہولت حاصل ہوجائے گا، دوسرے اس کے ذریعہ دعوت وارشاد کے کام میں بے حد مدد ملے گی، آج بڑے بڑے شہروں میں تک اہلِ باطل کے ڈاکٹرز اپنی کلینک کو اپنی تحریک کی دعوت کے مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کررہے ہیں اور اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ آسانی سے شکار ہورہے ہیں۔

۱۰) گریجویٹ نوجوانوں کے ذریعہ ٹیوشن سنٹرز چلائے جاسکتے ہیں، یہاں پر اکثر نوجوان آتے ہیں اور اپنی ضرورت سے مجبور ہوکر آتے ہیں، ان کی تعلیمی کمزوری کو دور

کرتے ہوئے ان کی فکری وعملی اصلاح کی جدوجہد موثر طریق پر بآسانی کی جاسکتی ہے اوراہلِ باطل خوب اچھی طرح کررہے ہیں۔اس قسم کے کاموں کے ذریعہ دیکھتے دیکھتے بستیوں میں اچھے خاصے گھرانوں کے بچے تک فکری بے راہ روی کے شکار ہوتے چلے جارہے ہیں، ان سنٹرز سے پڑھے لکھے بچوں کو آمدنی بھی ہوجائے گی اور نوجوانوں کو اسلام اوراسلامی اعمال سے دلچسپی بھی ہوجائے گی۔

۱۱) غریب لڑکیوں کو اسلامک فیشن ڈزائنر بنایا جائے، اور بڑے پیمانے پر کمپنی قائم کرکے برانڈڈ معیار کا ریڈی میڈ اسلامی لباس مارکیٹوں میں لایا جائے یا فیکٹری آؤٹ لیٹ میں متعارف کرایا جائے۔آج دینداروں کی عورتیں بے تکلف طریقے پر غیر اسلامی لباس قبول کرتی چلی جارہی ہیں بالخصوص بچے بچیاں، کیونکہ تیار ملبوسات استعمال کرنے کا رواج عام ہوگیا ہے، جب کہ ملبوسات تیار کرنے والی سب کی سب کمپنیاں یورپ سے فیشن درآمد کرتی ہیں، اور یورپ میں سب کو معلوم ہے کہ دن بہ دن بے لباسی کو لباس کا درجہ دیا جارہا ہے، اس قدر شرمناک قسم کے لباس متعارف ہوگئے ہیں کہ دیکھنے والوں کی نظریں حیا سے جھک جائیں مگر پہننے والے فخر ومسابقت کے ساتھ ان کا استعمال کررہے ہیں، حد یہ ہے کہ علماء وحفاظ کے گھروں میں تک ان کا چلن ہوتا جارہا ہے، فالی اللہ المشتکی۔اس مجبوری کو بڑے پیمانے پر فیکٹریاں قائم کرکے جذبات وخواہشات کے لحاظ کے ساتھ اسلامی مطالبات کی رعایت والے لباس متعارف کرواکے دور کیا جاسکتا ہے، اور انشاء اللہ ایک لباس کی یہ تبدیلی بہت سے سماجی واخلاقی مضرات سے حفاظت کا سبب ثابت ہوسکتی ہے۔

۱۲) نوفارغ علماءِ کرام کے لئے علاقائی زبان پر عبور اور انگریزی زبان بقدرِ ضرورت سکھانے کے بامعیار اور باوقار مراکز کا قیام بھی ایک اہم ضرورت ہے، دعوت کے کام میں زبان ہی حقیقی ہتھیار اور مضبوط رابطہ ہے، آج علاقائی زبانوں میں اہلِ باطل کا جتنا لٹریچر آگیا ہے اس کا عشر عشیر بھی اہل حق کا نہیں ہے۔میں ایک مرتبہ ایک بہت بڑے

بکڈپو پر گیا، ہمارے علاقے کی تیلگو زبان میں ہر باطل تحریک کی بیسیوں چھوٹی بڑی کتابیں نظر آئیں، اس کافی بڑے اور نظر نواز ذخیرے میں اہل حق کی کتابیں چند ایک ملیں وہ بھی کافی تلاش کروانے پر۔ یہ اہلِ حق کا المیہ ہے کہ پڑھنے والے خواہ کسی زبان میں پڑھتے سمجھتے ہوں کتابیں ہماری سب اردو میں لکھی جارہی ہیں۔ان مراکز میں علماء کو اچھی اسکالرشپ دی جائے، محنت بھی خوب لی جائے، کیونکہ اکثر علماء فارغ ہونے سے قبل ہی خانگی و معاشی مسائل کے شکار رہتے ہیں، مزید ایثار وانتظار ان کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے، یقین کیجئے کہ اس پر خرچ ہونے والا سرمایہ علماء پروری اور دعاۃ سازی کے دو گنے اجر وثواب کا سبب بن جائے گا۔اس کام میں البتہ اس کا خیال بھی ضروری ہے کہ اس مرکز کا ماحول تقویٰ وطہارت، فکرِ آخرت اور دردِ امت والا ہو، علماءِ ربانیین کی آمدورفت اور نصح وموعظت کا سلسلہ جاری رہے، اعمالِ صالحہ، مسنون طرزِ زندگی اور سادگی وسنجیدگی کی تربیت بھی ہوتی رہے۔

یہ چند امور ہیں جن کی جانب ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا
کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

کے مصداق اس راقم عاجز نے قریب ہی زمانے میں مختلف علاقوں میں مختلف حوالوں سے بے حساب پیسے کے ضیاع کو دیکھ کر اہلِ خیر ومتمول طبقے کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے، یاد رہے ہم اس نبی کی امت ہیں جس نے الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة فرمایا تھا، (بیہقی، باب الاقتصاد فی النفقة) اس امت کا وہ پیسہ جو بے دینوں کی خود سری ومن مانی کی نذر ہورہا ہے اس کی تو کوئی حد نہیں لیکن جو سرمایہ دیندار مالداروں کا لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے بے موقع وبلاضرورت لگ رہا ہے کم از کم اس کا تحفظ ہوکر ضرورت کے مصارفِ خیر میں استعمال ہوجائے تو بھی الحاد وارتداد کے بہت سے دروازے بند کئے جاسکتے اور ضلالت وگمراہی کے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

؎ تغیر کے ساتھ

ان سطور کے ذریعہ ہونے والے دین کے کاموں کی ناقدری یا مخلص معاونینِ اسلام کی ناشکری مقصود نہیں بلکہ کام کے مختلف تشنۂ توجہ میدانوں کی جانب توجہ مبذول کرانا اور بے اعتدال وغیر متوازن مصارف سے بچنا مدِ نظر ہے۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلاَّ الْاِصْلاَحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

(اداریہ: جون ۲۰۱۱ء)

رمضان مولائے مہربان کے لئے یا نفس وشیطان کے لئے؟

رمضان المبارک انتہائی برکت ورحمت اور قدر وعظمت والا مہینہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض روایات کے مطابق ہلالِ رجب کے نمودار ہوتے ہی رمضان المبارک کی یاد اور اس کے ملنے کی تمنا فرمایا کرتے تھے، اعمالِ خیر میں اضافہ فرماتے تھے، پھر جب شعبان کا مہینہ شروع ہوجاتا تو بکثرت روزے رکھتے تھے بلکہ پورا مہینہ روزوں میں گذار لیتے تھے، صحابہ کرامؓ کو اواخر شعبان میں رمضان کے قریب تر آجانے کی خبر دے کر اس کے فضائل و خصوصیات اور مسائل واحکام سے باخبر فرماتے تھے، رمضان کے شروع ہوتے ہی آپ کی خیر خیرات اور غمگساری ومواسات میں مزید شدت پیدا ہوجاتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان کے دن میں روزہ تو رکھتے ہی تھے رات کی نوافل بھی بڑھادیتے تھے، آخری عشرہ میں تو اپنی دیگر دینی ودعوتی مصروفیات ترک کر کے مسجد میں معتکف ہوجاتے اور پوری یکسوئی وانہماک کے ساتھ عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

آپ اکے خود اہتمام فرماتے اور دوسروں کو اہتمام کی ترغیب دیتے رہنے کی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے بعد تابعین عظام پھر ائمہ مجتہدین اور محدثین، علماء وصوفیاء اور عامۂ مومنین غرض یہ کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ مہینہ عظمت و برکت ہی کا نہیں طاعت وعبادت، ذکر وتلاوت، استغفار وانابت اور جود وسخاوت کی کثرت کا مہینہ قرار پاگیا۔ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر آج تک ہر زمانے کے مسلمان —— کیا عوام کیا

خواص ــــ بڑے جوش وخروش کے ساتھ اعمالِ صالحہ کی طرف راغب رہتے ہیں، اور پورے عالم میں ہر طرف تقویٰ وطہارت اور بندگی وعبادت کا روحانی ونورانی ماحول بن جاتا ہے، جس سے اہلِ ایمان کے قلوب مسرور اور آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔

غور کریں تو واقعی یہ رمضان المبارک کا آنا بھی کوئی معمولی نعمت نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہ کا اپنے بندوں پر عظیم انعام اور زبردست احسان ہے کہ بہ یک وقت دونوں جہاں کی سرخروئی کا سامان ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقتِ واقعہ ہے کہ یہ نفس امارہ بالسوء آدمی کو چین سے رہنے نہیں دیتا، اس کے پاس تمناؤں اور ارمانوں کی ایک لمبی فہرست ہے، حیلے بہانوں کا بڑا ذخیرہ ہے، تادیلات وتسویلات کا زبردست خزانہ موجود ہے، اس دشمنِ دین وایمان اور رہزنِ تقویٰ وپرہیز کا شیوہ ہی آدمی کے ہر عمل کو ضائع اور ہر خوبی کی مٹی پلید کرنا ہے۔ چنانچہ یہ قوتِ نفسانیہ رمضان جیسے مہینے کی مبارک ساعتوں اور قیمتی اعمال کو گھن لگانے میں بھی پیچھے نہیں ہٹتی بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے، پہلے تو اعمالِ خیر ہی سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے بنائے گئے خاص ماحول کی برکت سے قوت پا کر اہلِ اسلام آمادۂ طاعت وطہارت ہونے لگتے ہیں تو وہ ان اعمالِ صالحہ کی شکلیں بدلنے اور ان کا حلیہ بگاڑ کر نا قابلِ قبول بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں رسمیت حقیقت کی جگہ لے لیتی ہے۔

روزہ فاقۂ محض ہو کر رہ جاتا ہے، تراویح تفریح کی دوسری شکل بن جاتی ہے، افطارِ صائم افطار پارٹی کی مکروہ صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے، زکوٰۃ وخیرات ریا واحسان کی نذر ہو جاتی ہے، ازدیادِ رزق اسراف وتبذیر کے حوالہ ہو جاتا ہے، نوجوان منافقوں کی طرح دن تمام پڑے سوتے رہنے اور راتوں کو بازاروں اور چبوتروں کی زینت بنے رہنے کو رمضان کا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ بازار تو بقعۂ رنگ وروشنی بن کر اہلِ ایمان کے قلوب کو دعوتِ ظلمت دینے لگتے ہیں، عشرۂ اخیرہ بجائے اعتکاف اور شبِ قدر کی تلاش کے عید کی تیاریوں

میں کھپ جاتا ہے، لیلۃ القدر میں اگر چیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ توجہ ہو جاتی ہے مگر اب یہ انتہائی بابرکت رات بھی قدر کے عنوان سے کم اور جشن کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہوگئی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک مہینے کے ذریعہ ــــــ جسے اہل دل بزرگانِ دین نے سلوکِ ربانی کا مہینہ قرار دیا ہے ــــــ ہماری مغفرت ونجات کا سامان فرمایا تھا مگر ہمارے نفس لعین نے اپنے مکر وشر کے ذریعہ سامانِ مغفرت کو سامانِ مواخذہ بنا دیا ہے۔

یاد رکھئے! نفس ہو کہ شیطان یہ اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی کام کے لئے ہوئے ہیں، لیکن ہم مسلمان ان کی چاپلوسی کے لئے نہیں پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کس قدر بدنصیبی کی بات ہے کہ جس مخلوق کو ہم خود ملعون قرار دیتے ہیں تو وہ تو اپنا کام برابر کرتے رہیں اور ہم جو اشرف المخلوقات کہلائے جاتے ہیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے عاجز رہ جائیں! فیا اسفا علی عجزنا وغفلتنا!!

ہم انسان ہیں، سب سے زیادہ طاقتور ہیں اور سب مخلوقات کو مسخر کرنے کے قابل ہیں، ایسے مواقع پر ہمیں ارادہ کی طاقت سے کام لینا چاہیے۔ آیئے! ہم ارادہ کریں کہ اس سال رمضان المبارک کو اس طرح گذاریں کہ نفس وشیطان مایوس اور مولائے مہربان راضی وخوش ہو جائے۔ اللہ ہماری مدد فرمائے۔ آمین

(اداریہ: اگست ۲۰۱۱ء)

ایصالِ ثواب کا عقیدہ برحق اور اجماعی ہے

اسلامی عقائد میں ایک اہم عقیدہ ''ایصالِ ثواب'' کا بھی ہے، معتزلہ اس کے سرے سے منکر ہیں، اہل السنۃ والجماعۃ اس بات کو جائز اور درست قرار دیتے ہیں کہ کسی مسلمان کے انتقال کے بعد اس کے عزیز واقرباء یا کوئی بھی مسلم اپنی سعی وعمل کا ثواب اس کو بخش دینا چاہے تو بخش دے۔

امام ابوجعفر طحاویؒ اس سلسلہ میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''العقیدۃ الطحاوی'' میں اہلِ اسلام کا عقیدہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفی دعاء الاحیاء وصدقتهم منفعة للاموات۔ (ص:۱۳۴)	زندہ لوگوں کی دعاؤں اور ان کے صدقات کا نفع مردوں کو پہونچتا ہے۔

اس کی تشریح میں حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

اتفق اهل السنة علی ان الاموات ینتفعون من سعی الاحیاء بطریق عدیدة۔ (ایضاً علی الهامش)	اہلِ سنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ مردوں کو متعدد طریقوں سے زندوں کی سعی وعمل کا نفع پہونچ سکتا ہے۔

امامِ نووی شافعی رحمہ اللہ نے مقدمہ صحیح مسلم کی شرح میں ایک مسئلے کی تشریح کرتے ہوئے ضمناً اس عقیدہ پر بھی روشنی ڈالی ہے:

من ارادبر والديه فليتصدق عنهما، فان الصدقة تصل الى الميت وينتفع بها بلا خلاف بين المسلمين، هذاهو الصواب واما ما حكاه اقضى القضاة ابوالحسن ما وردى البصرى الفقيه الشافعى فى كتابه"الحاوى" عن بعض اصحاب الكلام من ان الميت لا يلحقه بعدموته ثواب فهو مذهب باطل قطعاً وخطأ بين مخالف لنصوص الكتاب والسنة واجماع الامة فلا التفات اليه ولا تعريج عليه۔ (مسلم بشرح النووی ۱/ ۸۰)	یہ مسئلہ اپنی جگہ تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہیکہ اگر کوئی والدین سے مرنے کے بعد حسنِ سلوک کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ وہ صدقہ خیرات کرے، اس لئے کہ صدقہ کا ثواب میت کو پہونچتا ہے اور وہ اس سے منتفع ہوتا ہے، یہ بالکل صحیح بات ہے، اور وہ جو قاضی ابوالحسن ماوردی نے اپنی کتاب الحاوی میں بعض اہلِ کلام سے نقل کیا ہے کہ میت کو اس کی موت کے بعد کوئی ثواب نہیں پہونچ سکتا تو ان کا یہ قول قطعی طور پر باطل اور بالکل واضح غلطی ہے، نیز کتاب وسنت کے نصوص اور اجماعِ امت کے برخلاف ہے، اس لئے ناقابلِ التفات وتوجہ ہے۔

امام قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں آیتِ شریفہ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً کے تحت ''المسئلۃ السابعۃ'' میں حج بدل کے احکام بیان کرتے ہوئے اس عقیدہ پر اجماع کا ذکر کیا ہے:

ففی ھذا ما یدل علی انه من باب التطوعات وایصال البر والخیرات للاموات، الا تری انه قد شبه فعل الحج بالدین، وبالاجماع لو مات میت وعلیه دین لم یجب علی ولیه قضاءه من ماله، فان تطوع بذلک تأوی الدین عنه۔ (قرطبی: ۴/ ۱۱۷)

اس حدیث میں ــــ کہ آپؐ نے سائل سے فرمایا: اگر تمہارے مرحوم والد پر قرض ہوتا اور تم ادا کرتے تو کیا ادا نہ ہوتا؟ ــــ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل نفل کاموں کے ایصالِ ثواب کے باب سے ہے، دیکھئے آپ نے حج کے عمل کو قرض سے تشبیہ دی (اور فرمایا کہ جس طرح میت کی طرف سے اس کا قرض ادا کرنے سے ادا ہوجاتا ہے، اسی طرح اس کی جانب سے حج کیا جائے تو وہ بھی ادا ہوجائے گا) جب کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ میت کے اولیاء پر لازم نہیں ہے کہ اپنے مال سے اس کا قرض ادا کردیں، (پھر بھی) اگر کسی نے ادا کردیا تو ادا ہوجاتا ہے۔

علی ابن ابی العزد مشقی فرماتے ہیں:

اتفق اھل السنة ان الاموات ینتفعون من سعی الاحیاء بامرین، احدھما: ما تسبب الیه المیت فی حیاته والثانی: دعاء المسلمین لھم واستغفارھم له، والصدقة، والحج ...وذھب بعض اھل البدع من

اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مردے زندوں کے عمل سے دوطرح منتفع ہوسکتے ہیں، ایک ان ذرائع سے جن کے اسباب انہوں نے خود اپنی زندگی میں بنائے ہوں، دوسرے مسلمانوں کی اپنی طرف سے کی جانے والی دعا، استغفار، صدقہ خیرات

اهل الکلام الی عدم وصول شیئ البتة لا الدعا ولاغیره فقولهم مردودبالکتاب والسنة۔
(شرح العقیدۃ الطحاویہ ص:۳۶۹)

اورحج وغیرہ کے ذریعہ......(اس سلسلہ میں جزئی اختلاف کاذکرنے کے بعد لکھتے ہیں) اور بعض بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ کسی قسم کا انتفاع زندوں سے مردوں کونہیں ہوسکتا، نہ دعا سے نہ کسی اور عمل سے تو ایسے لوگوں کا قول کتاب وسنت کی روشنی میں مردود اور نا قابل قبول ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ پہلی صورت یعنی اپنی زندگی میں اپنی سعی سے اختیار کردہ ذرائعِ ثواب سے مرنے کے بعد فائدہ اٹھاسکنا تواس کے ثبوت میں وہ روایت کافی ہے جوامام مسلم اوردیگر محدثین نے اپنی سند سے نقل فرمائی ہے:

اذامات ابن آدم انقطع عمله الامن ثلاث صدقة جارية، او ولدصالح يدعوله، او علم ينتفع به بعده۔
(مسلم، کتاب الوصیۃ/ ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)

آدمی جب مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین اعمال کے (۱) صدقہ جاریہ (۲) نیک اولاد جواس کے لئے دعا کرتی ہے اور (۳) اس کا وہ علم جس سے لوگ اس کے مرنے کے بعد بھی مستفید ہوتے رہیں۔

اوردوسری صورت یعنی ان اعمال کے ذریعہ بھی میت کوثواب پہونچ سکنا جومحض دوسروں کاعمل ہے تواس کاثبوت بھی کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاسِ صحیح ہرچہار اصول دین میں موجود ہے (اس کے بعد انہوں نے متعدد دلائل نقل کئے ہیں، یہاں ان میں سے صرف ایک ایک مثال نقل کی جارہی ہے۔)

کتاب اللہ سے ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

● وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (الحشر:۱۰)

اور جو بعد میں آئے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری مغفرت فرما اور ان لوگوں کی بھی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گذر چکے ہیں۔

حق تعالیٰ نے اس میں مردہ مسلمانوں کے لئے زندوں کی دعا کی تعریف فرمائی ہے، اگر ان کا یہ عمل مقبول و معتبر نہ ہوتا تو قرآن کریم میں اس کی تعریف کئے جانے کے کیا معنیٰ؟

سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت کے لئے اس حدیث کو ملاحظہ کر لیجئے جسے امام ابوداؤد نے سندِ صحیح کے ساتھ حضرت عثمان غنیؓ سے روایت کیا ہے:

● كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه فقال: استغفروا لاخيكم، واسألوا له التثبيت، فانه الآن يسأل۔ (ابوداؤد، کتاب الجنائز بسند صحیح)

جب نبی کریم ﷺ کسی میت کی تدفین سے فارغ ہوجاتے تو وہاں تھوڑی دیر ٹھہرتے اور فرماتے: اپنے مسلمان بھائی کے لئے مغفرت کی دعا کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے استقامت طلب کرو، کیونکہ یہ وقت اس کے سوال وجواب کا وقت ہے۔

● اجماعِ امت کا ثبوت یہ ہے کہ نبی کریم اکے زمانہ سے لے کر آج تک امت بلا اختلاف مردوں پر نمازِ جنازہ پڑھتی اور دعائے مغفرت کرتی آرہی ہے، یہ میت کا اپنا عمل نہیں ہے غیر کا ہے، مگر اس کو غیر کے اس عمل سے نفع ہوتا ہے کسی کو اس سے عملی اختلاف نہیں ہے۔

● قیاسِ صحیح اور عقل کامل بھی اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ نفل اعمال کا ثواب بندہ کا اپنا حق ہے، اگر وہ کسی اور کو ہدیہ کر دینا چاہتا ہے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، جیسا کہ کوئی آدمی اپنا مال کسی اور کو ہبہ کر دینا چاہے تو کر سکتا ہے اس میں کوئی مانع نہیں، یا جیسا کہ اگر کوئی

زندہ مردہ کا قرض ادا کردے تو اس کی جانب سے ادا ہو جاتا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص ثواب کا کام کرے اور اس کا ثواب کسی مرحوم کو بخش دے تو اس کو پہونچنے میں عقلاً کوئی تردّد نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم (انتھی کلامہ)

بہر حال! یہ تو نفس ایصالِ ثواب کا ثبوت تھا کہ زندوں کے عمل کا مردوں کو ایصالِ ثواب کرنا باجماعِ امت ثابت وجائز ہے، خواہ میت نے زندگی میں اپنی طرف سے ان کے اسباب کئے ہوں یا نہ کئے ہوں، بس مسلمان اپنی جانب سے پہونچا رہے ہوں، دونوں صورتیں صحیح ہیں، اس کے برخلاف جو لوگ ایصالِ ثواب کو لغو عمل اور میت کے لئے غیر نافع کام سمجھتے ہیں وہ اجماعِ امت کے مخالف، بدعتی اور اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہیں۔ البتہ اہل السنۃ والجماعۃ کے ائمہ میں ''ایصالِ ثواب'' کے برحق ہونے پر اتفاق کے باوجود اس کی صورت ونوعیت میں کچھ اختلاف موجود ہے کہ بعض علماء کے ہاں وہ چند عبادات کے ساتھ خاص ہے اور بعض کے ہاں عام! امام مالک اور امام شافعیؒ اس کو بعض اعمال کے ساتھ خاص کرتے ہیں، امامِ اعظم ابوحنیفہؒ، امامِ احمدؒ اور جمہور سلف تمام اعمالِ صالحہ نافلہ کے ذریعہ ایصالِ ثواب کو جائز سمجھتے ہیں۔

امام ابی العز دمشقی فرماتے ہیں:

واختلف فی العبادات البدنية كالصوم والصلوة وقراء ة القرآن والذكر، فذهب ابو حنيفة واحمد وجمهور السلف الى وصولها، والمشهور من مذهب الشافعی ومالک عدم وصولها۔

(شرح العقیدۃ الطحاویہ ص:۳۶۹)

عباداتِ بدنیہ مثلاً روزہ، نماز، تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ سے ایصالِ ثواب کرنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے، امامِ ابوحنیفہؒ، امامِ احمدؒ اور جمہور علماءِ سلفؒ کے نزدیک ان اعمال کا ثواب میت کو پہونچتا ہے اور امامِ مالک وشافعیؒ کے نزدیک مشہور قول کے مطابق نہیں پہونچتا ہے۔

''مشہور قول کے مطابق'' اس لئے کہا کہ بعد میں محقق علماءِ شافعیہ نے بھی وصول وجواز کا قول اختیار کرتے ہوئے جمہور ہی کی تائید کی ہے۔

جمہور کے مسلک کی تائید وتوثیق کے لئے درج ذیل روایات پیش کی جاسکتی ہیں:

● امام مسلم نے حضرت بریدہ سے نقل کیا ہے کہ:

کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا اخرجوا الی المقابر ان یقولوا : السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین و المسلمین، وانا ان شاء الله بکم لاحقون، نسأل الله لنا ولکم العافیة۔(مسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو تعلیم فرماتے تھے کہ جب تم لوگ قبرستان جایا کرو تو مردوں سے اس طرح مخاطب ہوا کرو، اے مسلمانو! تم پر اللہ کی سلامتی ہو، ہم بھی تمہارے پاس آنے والے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

یہ اور اس قبیل کی تمام قولی وعملی روایات جو مختلف الفاظ و انداز میں منقول ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ زندوں کی جانب سے مردوں کے لئے دعا واستغفار کا فائدہ مردوں کو حاصل ہوتا ہے۔

● بخاری ومسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

أن رجلا اتی النبی صلی الله علیه وسلم فقال ، یا رسول الله! ان امی اقتلت نفسها، ولم یوص، واظنها لو تکلمت تصدقت ، افلها اجر ان تصدقت عنها؟ قال نعم! (بخاری، کتاب الجنائز)	ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آ کر سوال کیا کہ میری ماں کا اچانک انتقال ہوگیا، کچھ کہہ نہیں پائیں، میرا خیال ہے کہ اگر وہ کچھ کہہ پاتیں تو شاید کچھ صدقہ ضرور کرواتیں، اب اگر میں خود ہی اپنی طرف سے ان کے لئے کچھ صدقہ کروں تو ان کو ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا، ہاں!

یہ اور بخاری ہی میں مروی حضرت سعد بن عبادہؓ کے اسی طرح کے واقعے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ میت کو زندوں کے صدقات وخیرات کا اجر وثواب پہونچتا ہے۔

● بخاری ومسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مات وعلیہ صیام صام عنہ ولیّہ (بخاری، کتاب الصوم)

کسی شخص کا انتقال ہوگیا اور اس کے ذمہ روزے رہ گئے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھ لے۔

یہ اور اس قسم کی دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بدنی عبادات کا ثواب بھی میت کو پہونچ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میت کے قضا روزے اس کا ولی روزوں کی شکل ہی میں ادا کرسکتا ہے یا اس کا فدیہ ادا کرکے اس کو سبکدوش کرسکتا ہے اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں مروی ممانعت کی وجہ سے روزہ کا فدیہ ادا کرنا زیادہ صحیح ہے۔

● صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

ان امرأۃ من جھینۃ جاءت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: ان امی نذرت ان تحج فلم تحج حتی ماتت، افاحج عنھا؟ قال حجی عنھا ارأیت لو کان علی امک دین اکنت قاضیتہ؟ اقضوا اللہ فاللہ احق بالوفاء۔ (بخاری، کتاب الحج)

ایک خاتون نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا یا رسول اللہ! میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی، مگر اس کو پورا کرنے سے قبل ہی انتقال کرگئیں، کیا میں ان کی جانب سے حج کرلوں؟ فرمایا: کرلو، دیکھو! اگر اس پر قرض ہوتا تو تم ادا نہ کرتیں؟ پس اللہ کا حق بھی ادا کردو، کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے وفا کی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے ذریعہ بھی میت کو نفع پہونچایا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ حج بھی اصلاً بدنی عبادت ہے، اگر چہ مال اس کا ذریعہ ہے مگر سب کے لئے ضروری نہیں، حرم شریف کے رہنے والے بغیر کسی مالی صرفے کے محض مناسکِ حج ادا کرتے ہیں اور ان کا حج سب کے نزدیک معتبر ہے۔ معلوم ہوا کہ حج اصلاً بدنی عبادت ہے۔

● امام احمد نے جابر بن عبداللہؓ سے بہ سندِ حسن روایت کیا ہے:

''ایک شخص کا انتقال ہوا تو ہم لوگوں نے ان کا جنازہ تیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے آئے، اور عرض کیا کہ نمازِ جنازہ پڑھا دیجئے، آپ چند قدم چلے پھر رک کے پوچھا کہ میت مقروض تو نہیں؟ عرض کیا گیا کہ اس پر دو دینار کا قرضہ ہے، یہ سن کر آپ لوٹ گئے، یہ دیکھ کر حضرت ابوقتادہؓ نے عرض کیا: اس کی ادائیگی میری ذمہ داری ہے، ادائیگی کا اطمینان کر کے آپ نے نمازِ جنازہ پڑھا دی، اگلے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دیناروں کی ادائیگی کے بارے میں پھر دریافت فرمایا، جب حضرت قتادہ نے عرض کیا کہ وہ دینار ادا کر دئے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الاٰن برّدت علیه جلده (مسند احمد ۳/۴۰۵) اب تم نے اس کی روح کو پُرسکون کر دیا۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اولاد اور رشتہ تو کیا؟ کوئی اجنبی شخص بھی ازراہِ خیرخواہی میت کا قرض ادا کر دے یا اور کوئی نفع اس کو پہونچانا چاہے تو شریعت میں گنجائش ہے اور اس کا یہ اہداء وایصالِ ثواب معتبر ہے۔

● امام احمد، امام ابوداؤد اور امام ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے:

فلما انصرف (من المصلّٰی) اتی بکبش فذبحه فقال، بسم الله و الله اکبر اللّٰهم هذا عنی و عمن لم یضح من امتی۔ (مسند احمد: ۳/۱۴۳)

(بقرعید کے دن) عیدگاہ سے واپسی کے بعد آپ نے ایک مینڈھا بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح فرمایا، اور کہا اے اللہ! یہ قربانی میری جانب سے ہے اور میری امت کے ان تمام افراد کی جانب سے ہے جو قربانی نہیں دے سکے۔

● ان کے علاوہ اور بھی متعدد روایات کتبِ حدیث میں موجود ہیں مثلاً سعد بن عبادہؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بہن کی طرف سے پانی کی سبیل لگانے کا مشورہ دیا، حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمن کی طرف سے اعتکاف کیا اور غلام آزاد کیا، حضرت علیؓ نے ایک بوڑھے شخص کو ہدایت دی کہ وہ حج کو نہیں جا سکتا ہے تو کسی اور کو اپنی جانب سے بھیج دے۔ (دیکھئے: قرطبی ۱/ ۱۱۵) حضرت عمرو بن عاصؓ کے دریافت کرنے پر کہ ان کے والد عاص نے سو غلام آزاد کرنے کی نذر مانی تھی مگر پوری نہ کر سکے، مرنے کے بعد میرے بھائی ہشام نے اپنے حصے کے پچاس غلام آزاد کر دئے، کیا میں بھی اپنے حصے کے غلام آزاد کر دوں؟ آپ نے فرمایا: اگر تمہارے والد نے توحید کا اقرار کر لیا تھا تو اس کا نفع پہونچے گا، خواہ غلام آزاد کرو، یا ان کی طرف سے صدقہ کرو، یا حج کرو۔ (سب کا ثواب پہونچے گا) (ابوداؤد، باب ما جاء فی وصیۃ الحربی، مسند احمد) حدیث سے یہ بھی پتہ چلا کہ ایصالِ ثواب کے مفید ہونے کے لئے میت کا مومن ہونا بھی ضروری ہے۔

● امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے:

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اذا مات احدكم فلاتحبسوه واسرعوا به الى قبره وليقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجليها خاتمة البقرة۔
(شعب الایمان: ۲/ ۱۲۳۰)

میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اسے روکے مت رکھو، جلدی سے اس کی قبر میں پہونچا دو، اور چاہیے کہ (تدفین کے بعد) اس کے سرہانے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پائنتی اس کی آخری آیات پڑھ دی جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کا ایصالِ ثواب بھی دیگر عباداتِ نافلہ کی طرح بالکل درست ہے اور اس سے میت کو نفع ہوتا ہے، عصر حاضر کے عظیم محقق و مفسر اور فقیہ

ومدبر علامہ ڈاکٹر وہبہ زُحیلی اپنی تفسیر ''التفسیر المنیر'' میں رقمطراز ہیں:

والمعتمد فی المذاهب الاربعة ان ثواب القراءة یصل الی الاموات، لانه هبة و دعاء بالقران الذی تتنزل الرحمات عند تلاوته، وقد ثبت فی السنة النبویة وصول الدعاء والصدقة للمیت ، وذالک مجمع علیه۔ (التفسیر المنیر ۱۴/۱۴۰)

ائمہ اربعہ کے نزدیک جو بات معتبر و محقق ہے وہ یہ کہ قراءتِ قرآن کا ثواب بھی میت کو پہونچتا ہے، کیونکہ وہ ہدیہ اور دعا ہے اس قرآن کا جس کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اترتی ہیں، جب کہ میت کی طرف سے کئے گئے صدقہ اور اس کے لئے کی گئی دعا کا پہونچنا سنتِ نبویہ سے ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

مذکورہ بالا تمام روایات سے یہ باتیں اچھی طرح واضح ہوگئیں کہ:

۱) ایصالِ ثواب برحق ہے، سلف سے خلف تک اس کی حقّیت پر سب کا اجماع ہے۔

۲) ایصالِ ثواب تمام عباداتِ قولیہ، مالیہ اور بدنیہ کا ہوسکتا ہے۔

۳) زندوں کی اس سعی و سفارش اور اہداء و ایصال کا نفع میت کو حاصل ہوتا ہے۔

رہ گیا وہ اشتباہ جو وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى سے معتزلہ یا ان کے ہم نوا طبقے کو ہو گیا ہے کہ انسان کو اپنی سعی (عمل) کے علاوہ کسی چیز کا نفع نہیں ہوسکتا تو اس شبہ کا باطل ہونا اظہر من الشمس ہے، تفصیل تو حدیث کے شارحین اور متکلمین کی کتب میں دیکھی جاسکتی ہے، ہم امام قرطبیؒ جیسے عظیم مفسر کی اسی آیت کے تحت کی گئی ایک وضاحت پیش کر دینے کو عوام الناس کے لئے کافی سمجھتے ہیں، صاحبِ سمجھ و انصاف کے لئے یہی کافی ہے۔

وقال الربيع بن انس (وان ليس للانسان الا ما سعى) يعنى الكافر، واما المؤمن فله ما سعى وما سعى له غيره قلت كثير من الاحاديث يدل على هذا القول، وان المؤمن ليصل اليه ثواب العمل الصالح من غيره۔ (قرطبی ۱۷/ ۱۱۴)

ربیع ابن انس آیتِ شریفہ میں انسان سے کافر کو مراد لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کافر کو زندوں کی کسی سعی کا نفع نہیں پہونچ سکتا، البتہ مومن کو تو اس کی اپنی سعی بھی نفع دے گی اور غیر کی سعی بھی۔ میں کہتا ہوں کہ ربیع ابن انس کے اس قول کی تائید بہت سی احادیثِ شریفہ سے ہوتی ہے کہ مومن کو دوسرے کے عملِ صالح کا ثواب پہونچتا ہے

اس تفصیل سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ مردہ مسلمانوں کے لئے ایصالِ ثواب تمام اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک جائز ہے، جو لوگ اس کے منکر ہیں وہی بدعتی اور اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(مضمون: اگست ۲۰۱۱ء)

برہنہ سری اسلامی تہذیب کے خلاف ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں میں دینی احکام اور اسلامی تہذیب کا احترام دن بہ دن کم ہوتا جارہا ہے، اس کے برخلاف مغربی تہذیب کو عام کرنے کی کوششیں چوطرف سے اور مختلف ذرائع سے عام ہوتی جارہی ہیں۔ نتیجتاً ایک ٹوپی ہی کیا سارا لباس بلکہ پوری معاشرت ہی اسلامی خصوصیات وامتیازات سے محروم ہوگئی ہے۔ یہ صورتحال افسوسناک ضرور ہے مگر تہذیبی تصادم اور مغرب کے ناحق دباؤ نیز عالمِ اسلام کی تہذیبی مغلوبیت کے مدِنظر تعجب خیز بالکل نہیں ہے، تعجب صرف اس پر ہوتا ہے کہ بعض جدید و غیر معتبر افکار کے حاملین ان یورپ سے درآمدہ فیشنوں کو کلین چٹ بلکہ اسلامک لیبل کس طرح دیدیتے ہیں؟ بیماری حد سے بڑھ جائے اور بدعملی قابو سے نکل جائے تو اسے صحت اور نیکی کا نام دے کر قبول کرلینا اور بڑھاوا دینا کسی عقل مند کے نزدیک صحیح نہیں ہوسکتا۔

برہنہ سر رہنے یا نماز پڑھنے کا چلن انگریزوں کی آمد سے پہلے مسلم معاشرہ میں کہیں نظر نہیں آتا، ان کی آمد سے قبل علماء وصلحاء تو سر ڈھانک کر رہتے ہی تھے عام شرفاء بھی اسے تہذیب وشرافت کا لازمہ سمجھتے تھے۔

امام ابن جوزیؒ تلبیس ابلیس میں فرماتے ہیں:

’’سمجھدار آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ سر کا کھلا رکھنا بُری بات اور ناپسندیدہ حرکت ہے، کیونکہ اس میں ترکِ ادب اور شرافت کی خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔‘‘

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں:

''ننگے سر لوگوں میں گھومنا پھرنا (مسلمانوں کے لئے) مکروہ ہے۔''

(بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ ۸/ ۱۵۰)

ہندوستانی مسلمانوں میں برہنہ سری انگریزوں کی آمد کے بعد اور عالم عرب میں مغربی ممالک سے تعلقات کے بعد وجود میں آئی ہے۔ لیکن یہ تقلیدِ فرنگ شروع میں صرف دفتروں، کالجوں اور بازاروں تک محدود تھی، مذہبی مجلسوں اور مسجدوں میں لوگ اس طرح شرکت کو سخت معیوب سمجھتے اور اس سے احتراز کرتے تھے۔ گویا یہ پہلا مرحلہ تھا جب کہ مسلمانوں نے اسلامی تہذیب کو اسلامی سرگرمیوں کے ساتھ مخصوص کر کے انگریزی تہذیب کو زندگی کے بقیہ مرحلوں میں اختیار کر لیا تھا۔ پھر جب طبیعتیں اس اجنبی تہذیب سے مانوس ہو گئیں اور ایک نسل گذر گئی تو اگلی نسل کے لئے یہ جدید کلچر ہی پسندیدہ کلچر بن گیا اور سابقہ تہذیب اجنبی سی ہو گئی۔ اب جدید تعلیم یافتہ طبقے میں ٹوپی پہننا ایسا ہی معیوب ہو گیا ہے جیسے چند سال قبل ننگے سر رہنا معیوب تھا، یہ سب تہذیبِ جدید یا یہودیوں کی عالمی واحد تہذیب (یعنی گلوبلائزیشن) کی کوششوں کی دَین ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا علماءِ دین اور امت کے مصلحین کا کام بہر صورت اسلامی ثقافت اور تہذیب کا تحفظ کرنا اور قوم کے اندر اس کے شعور کو باقی رکھنے کی فکر کرتے رہنا ہے، چاہے قوم اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے، بلکہ جب ایسا نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سخت پکڑ فرمائی، قرآن کریم میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہے۔ اس لئے بطورِ اتمام حجت کے یہ چند سطریں تحریر کی جا رہی ہیں۔

قرآن کریم میں خود نماز و عبادت کے لئے مکمل لباس اور کامل زینت اختیار کرنے کی ترغیب موجود ہے، سورۃ الاعراف: ۳۱ میں ارشادِ ربانی ہے: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ، یہ اگرچہ برہنہ بدن کعبۃ اللہ کا طواف کرنے والوں کو دی

گئی ہدایت ہے مگر مفسرین کرام نے کُلِّ مَسۡجِدٍ کے عموم سے یہی سمجھا ہے کہ اس میں نمازوں اور دیگر عبادات کے ادا کرنے اور مقدس مقامات پر جانے کے لئے بھی مکمل لباس اختیار کرنا داخل وشامل ہے۔ اور کل لباس میں جہاں کرتا پاجامہ داخل ہے وہیں ٹوپی یا عمامہ بھی شامل ہے۔

نبی کریم ﷺ کا برہنہ سر رہنا یا نماز پڑھانا ثابت نہیں ہے، مشہور حسن سلمان نے ابن تیمیہؒ کی "الدین الخالص" سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے حالتِ احرام کے علاوہ ننگے سر نماز پڑھانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اگر آپ نے پڑھائی ہوتی تو احادیث میں ضرور منقول ہوتا، اگر کسی کو اس کے ثبوت کا دعویٰ ہے تو دلیل اس کے ذمہ ہے۔ والحق احق ان یتبع۔ (القول المبین ص:۵۷)

اس کے برخلاف متعدد روایتوں میں آپ کے سر مبارک کا عمامہ یا ٹوپی سے آراستہ ہونا مروی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ سفید ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔ (شعب الایمان: ۱۳/ ۲۵۶) حضرت عائشہؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ (جامع صغیر: ۲/ ۱۲۰) حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ ٹوپی عمامے کے تحت بھی اور بغیر عمامے کے بھی استعمال فرماتے تھے۔ (جامع صغیر: ۲/ ۱۲۰) حضرت ابوقر صافہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک ٹوپی دے کر اس کے استعمال کی ہدایت دی تھی۔ (فتح الباری: ۱۰/ ۲۲۳) جب آپ مرض الوفات میں آخری خطبہ دینے کے لئے مسجد میں تشریف لائے تھے تو حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں آپ کا سر مبارک عمامہ یا سرخ پٹی سے ڈھکا ہوا تھا۔ (بخاری: ۱/ ۵۳۶) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تین ٹوپیاں تھیں، ایک کن ٹوپ بھی تھی جسے سفر میں استعمال فرماتے تھے۔ (تخریج احادیث الاحیاء ۶/ ۱۱۰) ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں:

"آپ ﷺ عمامہ باندھتے تھے، اس کے نیچے ٹوپی بھی پہنتے تھے، کبھی بغیر ٹوپی کے بھی

عمامہ باندھتے تھے، کبھی بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی بھی پہن لیتے تھے۔ (زادالمعاد: ۵۱) یہی بات حضرت ابن عباسؓ سے روایتاً بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ ٹوپی استعمال فرماتے تھے، عمامے کے ساتھ بھی، بنا عمامے کے بھی۔ (جامع صغیر: ۲/۱۲۰)

یہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول اور عادتِ شریفہ تھی، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صحابہ کرامؓ کا عام رواج بھی یہی تھا، کیوں نہ ہوتا؟ وہ لوگ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ہر ادا کے عاشق اور اس کے متبع تھے، بخاری شریف میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محرم کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کون کون سے کپڑے پہن سکتا ہے؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قمیص، شلوار، عمامہ اور ٹوپی نہ پہنے۔ (بخاری: ۲/۴۴) معلوم ہوا کہ ٹوپی کا پہننا صحابہ کرامؓ کے معاشرہ کی عام بات تھی، تب ہی تو آپ نے دوسرے لباس کے ساتھ اس کا بھی ذکر فرمایا۔ فلتان بن عاصم سے مروی ہے کہ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے کے لئے پہونچے تھے تو صحابہ کرام کو کپڑوں اور ٹوپیوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ (مجمع الزوائد: ۲/۱۸۴) اسی طرح ترمذی میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے شہید کی فضیلت بیان کرتے ہوئے بتلا رہے تھے کہ اس کے بلند ترین مقام کو یوں سر اٹھا کر دیکھا جائے گا، جب آپ نے سر پیچھے کیا تو ٹوپی سر سے گر گئی۔ (ترمذی: ۳/۲۴۱) اس کے علاوہ متعدد صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کے بارے میں روایات موجود ہیں کہ وہ ٹوپی کا استعمال فرمایا کرتے تھے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت انسؓ ریشم کی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھے گئے۔ (۴/۲۷۰) اسی طرح ابو اسحاق کے بارے میں ہے کہ انہوں نے نماز کی حالت میں ٹوپی نکال کے رکھی پھر اٹھا کے پہن لی۔ (۱/۵۱۵)

مصنف ابن ابی شیبہ میں تو متعدد احادیث موجود ہیں، مثلاً جلد ۲ کتاب الصلوٰۃ میں حضرت شریح، اسود، عبد اللہ ابن زید، سعید ابن جبیر، علقمہ، مسروق رحمہم اللہ کے بارے میں اور جلد ۱۲ کتاب اللباس میں حضرت علی بن حسینؓ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ، حضرت

ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت انس بن مالکؓ، ابراہیم نخعیؒ اور ضحاکؒ کے بارے میں ٹوپیوں کا استعمال کرنا منقول ہے۔اسی طرح حضرت حسن بصریؒ سے بخاری شریف میں مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ ٹوپیوں اور عمامے کی کوروں پر سجدہ کرلیا کرتے تھے۔(بخاری:۱/ ۲۳۲)اس سے تو صحابہ کرام کا عموم استعمال صراحتاً معلوم ہوگیا۔فتح الباری میں عبداللہ بن ابی بکر سے مروی ہے کہ قرآنِ کریم کے تمام قراء(صحابہ) کے پاس ٹوپیاں ہوا کرتی تھیں۔(۱۶/ ۳۵۴)

اسی لئے ابن عربی فرماتے ہیں:

''ٹوپی انبیاء، صالحین واولیاء کے لباس میں داخل ہے، سر کی حفاظت کرتی ہے اور عمامہ کو جماتی ہے، جو کہ سنت ہے البتہ سر سے چمٹی ہوئی ہو بلند نہ ہو۔ہاں! اگر آدمی بخاراتِ دماغ کے خروج کی ضرورت محسوس کرے تو سوراخ دار بلند ٹوپی بھی پہن سکتا ہے۔''

(فیض القدیر:۵/ ۲۹۹)

فتح الباری کتاب الحج میں محرم کے لئے سر ڈھانکنے کے متعدد طریقوں کا ذکر کرکے ان کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔(۵/ ۱۸۶) جس سے اتنا تو معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ سر ڈھانکنا قدیم رواج ہے۔

مذکورہ بالا احادیث وآثار جن میں بعض صحیح اور بعض اُن کی مؤید ہیں یہ بتلارہی ہیں کہ سر کو ڈھکنا یعنی ٹوپی یا عمامہ سے آراستہ رکھنا بالخصوص نماز کے اندر برہنہ سری سے بچنا اسلامی تہذیب کا حصہ اور مسنون لباس میں داخل وشامل ہے۔اس کے برخلاف ٹوپی نہ پہننے یا برہنہ سر رہنے کی ترغیب وفضیلت کا کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ صحیح حدیثوں میں نہ ہی ضعیف روایتوں میں۔پس معلوم ہوا کہ موجودزمانے کا یہ فیشن اور غیر مقلدین کا چلایا ہوا چلن غیر اسلامی اور ناپسندیدہ ہے، جس سے احتیاط کرنا ضروری ہے۔جہاں تک ان لوگوں کا ان روایتوں سے استدلال کرنے کا تعلق ہے جن میں ایک اور دو کپڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے، وہ یا تو وقتی ضرورت پر محمول ہے یا بیانِ جواز کے لئے ہے، ورنہ

دوامی معمول نبی کریم ﷺ کا سر ڈھانک کر رہنا ہی ہے۔ بالخصوص نمازوں میں تو کبھی ننگے سر امامت فرمائی ہی نہیں۔

شیخ ناصر الدین البانی ایک بڑے عالم گذرے ہیں، سلفی علماء اور عوام انہیں خاتمۃ المحدثین سمجھتے ہیں، چونکہ ننگے سر کا کلچر اسی طبقے سے عام ہو رہا ہے بلکہ باقاعدہ کیا جارہا ہے اس لئے ان کی چشم کشائی کے واسطے اس مسئلے میں شیخ کی تحقیق ذیل میں نقل کی جارہی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس لئے کہ نماز کا مکمل ہیئتِ اسلامی میں ادا کرنے کا پسندیدہ ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کے لئے اپنے آپ کو سنوارا جائے، نیز ننگے سر رہنے کی عادت ڈال لینا، یا بازاروں میں ننگے سر گھومنا یا مقاماتِ عبادت میں ننگے سر داخل ہونا سلفِ صالحین کے مبارک عرف میں ہیئتِ حسنہ کے خلاف اور غیر اسلامی تہذیب کا امتیاز ہے، جو کفار کے بلادِ اسلامیہ میں داخل ہونے کے بعد شائع ہوا ہے، وہاں کے مسلمانوں نے بلا دلیل شرعی ان بُری عادتوں کو قبول کر کے اس مسئلے میں اسی طرح بعض اور تہذیبی مسائل میں بھی اپنے بڑوں کی تقلید ترک کر دی ہے، پس یہ نئی رسم اس لائق نہیں ہے کہ اسلام کے سابقہ عرف اور طریقے کی مقابل بن سکے، اور نہ ہی اس رسم کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھنے کا جواز نکالا جا سکتا ہے۔''

اس کے بعد بعض علماء کے غلط استدلال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جہاں تک مصر کے بعض علماء کا حج کے دوران سر کھلے رکھنے اور اسی طرح نماز پڑھ لینے سے استدلال کا تعلق ہے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان کا یہ قیاس قیاس مع الفارق ہونے کی وجہ سے فاسد ہے، اس لئے کہ اوّلاً تو وہ مناسکِ حج کے ساتھ خاص ہے اور شعارِ حج میں سے ہے اس کو عام نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اس سے ہر حال میں سر کھلے رکھ کر نماز پڑھنے کا

ثبوت نکل سکتا ہے تو پھر وجوباً ماننا پڑے گا جوازاً نہیں، کیونکہ احرام میں سر کھلا رکھنا واجب ہے، یعنی ننگے سر نماز پڑھنے کو واجب کہنا پڑے گا جو کوئی نہیں کہتا۔ پس یہ ایسا الزام ہے کہ ان لوگوں کو اپنے قیاسِ فاسد سے رجوع کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، ہمیں امید ہے کہ یہ علماء اپنی غلطی سے رجوع کر لینگے۔ (تمام المنۃ فی التعلیق علی فقہ السنۃ ۱۶۴/ ۱۶۵)

نوٹ: ہم نے اس سلسلہ میں فقہاءِ کرام کے مواقف اور فقہی احکام اس لئے نقل نہیں کئے کہ جس طبقے کو متوجہ کرنا مقصود ہے اس کی نظر میں اس کا کوئی مقام اور احترام نہیں ہے۔ ورنہ فقہاءِ کرام بلکہ غیر مقلدین کے معتبر و معتدل علماءِ کرام کے فتاویٰ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(مضمون: ستمبر ۲۰۱۱ء)

سنِ ہجری، تاریخ و احکام

اسلامی جنتری کے اعتبار سے محرم الحرام سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا ہے، اور ذی الحجہ پر سال کا اختتام عمل میں آتا ہے، گویا ہم اب اپنی تاریخ کے چودہ سو بتیس سال مکمل کر کے چودہ سو تینتیسویں سال میں داخل ہورہے ہیں، اللہ تعالیٰ سارے عالم کے مسلمانوں کے لئے گذشتہ سال کے اختتام اور نئے سال کے آغاز کو ہر اعتبار سے خیر و برکت اور امن و سلامتی کی خوشخبری بنادے، آمین۔ ضرورت ہے کہ ہم اس موقع پر پچھلے سال اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جو دینی صورتِ حال رہی اس کا جائزہ لے کر اگلے سال کے لئے اس سے بہتر لائحۂ عمل بنانے کی فکر کریں تاکہ گذرتے دنوں کے ساتھ ہم اپنے رب کے حضور حاضری کی تیاری بھی اچھی طرح کرسکیں۔

سن اسلامی کا استقرار سیدنا عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں صحابۂ کرامؓ کے مشورہ اور ان کے اتفاق سے ہوا، ہجرتِ نبوی کے واقعے کو اس کی اساس و بنیاد بنایا گیا، اسی لئے اس کو سنِ ہجری کہتے ہیں۔ (البدایۃ والنہایۃ) اس کے مقابلے میں سن عیسوی سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخِ ولادت کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، اسی لئے اس کو سنِ میلادی بھی کہا جاتا ہے۔

''ہجرت'' بمعنی علیحدگی و دوری ایک اسلامی اصطلاح ہے اور اس کے معنی اپنے دین کی حفاظت کے لئے ترکِ وطن کر کے کسی دوسرے مقام کو منتقل ہوجانے کے ہیں۔ (التعریفات للجرجانی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص اپنے دین کو بچانے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے چاہے وہ ہجرت ایک بالشت کے برابر بھی کیوں نہ ہو اس پر جنت واجب ہوجاتی ہے۔ (مجمع بحار الانوار)

ابتداءِ اسلام میں اہلِ اسلام کو ـــــ مکے پر کفار کے غلبہ کی وجہ سے ـــــ پہلے حبشہ کی جانب پھر مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کا حکم دیا گیا تھا، صحابۂ کرامؓ یکے بعد دیگرے ہجرت کرتے رہے، بالآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق نبوت کے تیرہویں سال اور اپنی عمر مبارک کے ترپنویں سال مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی، ہجرت الی المدینہ فتح مکہ سے قبل تک ایک خاص ضرورت کے تحت ہر مسلمان کے لئے لازم تھی، لیکن ضرورت پڑنے پر اپنے دین کی حفاظت کے لئے ہجرت کرنا اب بھی دین میں داخل ہے: لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ۔ (بیہقی) یعنی جب تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوگا اس وقت تک ہجرت کا حکم بھی منسوخ نہیں ہوگا اور حدیث میں لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ (بخاری) جو فرمایا گیا ہے تو اس کے معنی ہجرت کی منسوخی کے نہیں ہیں۔ خاص مدینہ منورہ کی طرف نصرتِ اسلام کے لئے جو ہجرت فرض تھی اس کی ضرورت فتحِ مکہ کے بعد چونکہ ختم ہوگئی اس لئے اس کی فرضیت بھی منسوخ ہوگئی، باقی ضرورت پڑنے پر اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا کے تحت ہجرت کا حکم ہمیشہ باقی رہے گا۔ (النساء:۹۷)

اپنے آبائی وطن سے محبت ایک فطری امر ہے، جہاں آدمی پلتا پھلتا اور بڑا ہوتا ہے وہاں کے افراد واحباب، اشیاء واسباب حتی کہ گلی کوچوں اور درودیواروں سے بھی قلبی تعلق اور فطری لگاؤ ہوجاتا ہے، اسے چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا تو دور کی بات ہے اس کے تصور سے بھی آدمی کو تکلیف ہوتی ہے، آسانی سے دل آمادہ نہیں ہوتا، لیکن ضرورت آدمی کو مجبور کرتی ہے تو ترکِ وطن کرنا ہی پڑتا ہے، خاص طور سے طلبِ علم اور کسبِ مال کے لئے ترکِ وطن کا عام رواج پہلے بھی تھا اب بھی ہے اسلام نے تحفظِ دین وایمان اور نصرتِ اسلام کے لئے جب ہجرت کے عنوان سے ترکِ وطن کا حکم دیا تو صحابۂ کرامؓ نے بصد ذوق وشوق اپنے گھر دار کو خیرباد کہہ کے اور مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کر کے دین وایمان کی حفاظت اور اسلام کی اشاعت کو ہر تمنا پر مقدم رکھنے کی نظیر قائم فرمادی، اور رہتی دنیا تک مسلمانوں کو سبق دے گئے

کہ حقیقی مومن وہ ہے جس کے نزدیک دین وایمان سے بڑی کوئی دولت نہ ہواور وہ اس کے تحفظ کیلئے سب کچھ قربان کرسکتا ہو۔ یہ حضرت عمرؓ کی فراستِ ایمانی اور دوراندیشی تھی کہ انہوں نے اسلامی جنتری کی بنیاد اسلامی تاریخ کے اس عظیم الشان وفقید المثال واقعہ پر رکھی۔

جہاں تک ماہِ محرم کا تعلق ہے تو وہ نہایت ہی بابرکت مہینہ ہے، اشہرحرم یعنی حرمت وعزت کے لائق مہینوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ (سورۂ توبہ:۳۶) بے شک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کی کتاب میں زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت ہی سے بارہ ہے اور ان میں سے چار بہت حرمت والے ہیں۔ ان چار میں سے ایک محرم بھی ہے۔ (بخاری) احادیثِ صحیحہ میں اس کی نسبت اللہ پاک کی طرف کرتے ہوئے اس کو شَهْرُ اللّٰه بھی کہا گیا ہے۔ (مسلم) جو اس کی عظمت وجلالت کی نشاندہی کرتا ہے، اس مہینے کے روزہ کو رمضان شریف کے روزوں کے بعد سب سے افضل بتلایا گیا ہے۔ (مسلم) ایک روایت میں تو محرم کے مہینے کے ایک روزہ کو ایک مہینے کے روزوں کے برابر فرمایا گیا ہے۔ (طبرانی کبیر) خلاصہ یہ کہ اسلامی تاریخ کا یہ پہلا مہینہ یعنی محرم الحرام متعدد وجوہ سے فضیلت وبزرگی کا حامل ہے اور اس کی یہ فضیلت اسلام سے قبل ہی سے چلی آرہی ہے، کیونکہ تکوینی طور پر کائنات کے بہت سے اہم انقلابات کا اس مہینے سے تعلق ہے، اہل کتاب اور مشرکین مکہ بھی اس کی حرمت کے قائل تھے، اسلام نے بھی اس کی تحریم وتعظیم برقرار رکھی، اس لئے عوام الناس کا ''شہادتِ حسینؓ'' کے واقعے سے منسوب کرکے اس مہینے کو منحوس سمجھنا اور روافض کی طرح غم وماتم کے رسوم اختیار کرنا جہالت اور کم فہمی وکم علمی کی وجہ سے ہے۔ افسوس! رسم ورواج کا اتباع بھی ایسی اندھی چیز ہے کہ حرمت وبرکت کے عقیدے کو شقاوت ونحوست کے اعتقاد سے تبدیل کرلیا گیا۔

عاشوراء دسویں محرم کو کہتے ہیں، احادیث سے اس دن کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور

اس میں دو کاموں کا حکم ملتا ہے، ایک اس دن روزہ رکھنا اور یہود کی مشابہت سے بچنے کے واسطے دس کے ساتھ نو یا گیارہ کا روزہ ملا لینا۔ دوسرے اس دن اپنے اہل وعیال کے نفقے میں توسع کرنا، یعنی روزمرہ کے اخراجات میں کچھ زیادتی کر لینا۔ پہلے عمل کی فضیلت یہ ہے کہ عاشوراء کا روزہ گذشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ (مسلم) اور دوسرے عمل کا فائدہ یہ کہ اگلے سال روزی میں برکت رہتی ہے۔ (شعب الایمان) امام بیہقیؒ اس سلسلہ میں چھ روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: ھٰذِہِ الْاَسَانِیْدُ وَاِنْ کَانَتْ ضَعِیْفَۃً، فَھِیَ اِذَا ضَمَّ بَعْضُھَا اِلٰی بَعْضٍ اَخَذَتِ الْقُوَّۃُ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ عاشورے کے دن وسعتِ انفاق کی یہ روایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں مگر ایک دوسرے سے مل کر قوی ہو جاتی ہیں یعنی قابلِ عمل ہیں۔ ان دو اعمال کے علاوہ کوئی عمل مشروع نہیں ہے اور یہ دو عمل بھی فرض وواجب درجہ کے نہیں ہیں مستحب اور پسندیدہ سمجھے گئے ہیں، اس لئے ان فضیلتوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ کسی عمل کی فضیلت عمل کرنے اور حصولِ اجر و ثواب کے لئے ہی بیان کی جاتی ہے۔ البتہ ان کے ضروری اور لازمی ہونے کا اعتقاد نہ رکھے جس کی علامت یہ ہے کہ نہ کرنے والوں پر طعن واعتراض نہ کرے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ محرم اور عاشوراء کے حوالے سے ـــــ اس مہینے کی فضیلت، صومِ عاشوراء اور اہل وعیال پر وسعت کے علاوہ ـــــ جو کچھ اعمال اور توہمات مسلم معاشرہ میں پائی جاتی ہیں وہ سب من گھڑت و بے اصل ہیں، رافضیوں اور شیعوں کے ساتھ اختلاط اور سماجی تعلقات کے نتیجے میں سنی مسلمانوں کی معاشرت میں بھی داخل ہو گئی ہیں۔ پھر ان میں سے بعض تو درجۂ اعتقاد کو پہونچ کر ایمان کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں اور بعض کلچر کا حصہ بن کر بدعملی ورسوم پرستی کی شکل اختیار کر گئی ہیں، ان باطل اعمال اور خیالات سے خود بچنے اور امتِ مسلمہ کو بچانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کی اتباع اور اس کی اشاعت کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

(اداریہ: ڈسمبر ۲۰۱۱ء)

حیاتِ برزخی علامہ ابنِ تیمیہؒ کی نظر میں

آج کل کے جدید الفکر طبقوں نے علماءِ دین، ائمۂ مجتہدین ومتبوعین کو چھوڑ کر اتباعِ کتاب وسنت کے نام پر صرف ایک عالمِ دین یعنی "امام ابن تیمیّہ الحرانی رحمہ اللہ" کو پکڑ لیا ہے، تقلید کے شرک فی النبوت ہونے اور ترکِ تقلید کے ضروری ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر امت کو ابن تیمیہؒ کی جامد تقلید پر لا کھڑا کیا ہے، میں گذشتہ دنوں تقریباً ایک چلّہ سعودی عرب کے مختلف شہروں میں رہا، جمعے کے خطبوں اور ریڈیو پر ہونے والے محاضروں میں قال ابن تیمیۃ رحمہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے قول کا ذکر شاذ ونادر ہی سننے میں آیا، اور شاذ ونادر ہی کوئی خطبہ یا مقالہ یا محاضرہ یا کوئی مضمون ایسا دیکھنے میں آیا جس میں کتاب وسنت کی وضاحت کے لئے ابن تیمیہؒ کے افکار واقوال کا سہارا نہ لیا گیا ہو۔ مدینہ یونیورسٹی کے ایک معتدل المسلک استاذ نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ دکتورہ کے ایک مقالے کے لئے عنوان کی بات چل رہی تھی، میں نے طلبہ ہی سے کچھ عناوین وضع کر کے دکھانے کے لئے کہا، طلبہ بیس بائیس عنوانات لکھ کر لائے اور سب کے سب ''ابن تیمیہ وافکارہ'' ہی پر مشتمل تھے، صرف تعبیرات جدا تھے۔ تعجب ہے کہ ایسی جامد وفاسد تقلید کے قائل ہونے کے باوجود یہ لوگ تیرہ صدیوں سے چلی آ رہی ائمۂ متبوعین کی معقول اور مدلل ومحقق تقلید کو بدعت بلکہ شرک تک کہہ دینے کی جرأت کیسے کر لیتے ہیں؟ یعنی ہماری آہیں تو بدنامی کا سبب بن جاتی ہیں اوران کے قتل وغارت کا کہیں چرچا نہیں ہوتا۔ فالی اللہ المشتکی۔

اس جدید فیشن یا کہئے قریب العہد نظریئے کے دوررس نہیں چشم دید اعتقادی، عملی اور

تہذیبی مضرات پر بہت کچھ اظہارِ خیال کا جی چاہنے کے باوجود اس وقت اس موضوع کو قلم انداز کر کے ایک دوسرے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ اور وہ مسئلہ ہے ''ایصالِ ثواب'' کا۔ آئے دن اس مسئلہ کے سلسلہ میں مرد و خواتین معلوم کرتے رہتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے ذریعہ مُردوں کو نفع پہونچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جب ان کو اثبات میں جواب دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایصالِ ثواب سے میت کو نفع پہونچنا برحق ہے تو بتلاتے ہیں کہ ہمارے فلاں رشتہ دار یا اہل تعلق کہہ رہے ہیں کہ یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ مثلاً ایک نوجوان ایصالِ ثواب کے لئے شائع کردہ احادیثِ صحیحہ کے ایک مجموعے کو دیکھ کر برہم ہوتے ہوئے کہنے لگے ''کیا ان حدیثوں کو چھاپ دینے اور لوگوں کے ان کو پڑھ لینے سے آپ کے باپ کی مغفرت ہوجائے گی؟ اگر ایسا ہے تو پھر دین ہی کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے ہی بدعمل رہ کر مرجاؤ، بچے ایصالِ ثواب کر کے کام بنادینگے، یہ سب بے کار باتیں ہیں جو جاہل مولویوں نے پھیلا رکھی ہیں، ورنہ آدمی کے ساتھ اپنے عمل کے علاوہ کچھ جانے والا نہیں ہے'' وغیرہ

یہ اور اس قسم کی بہت سی منطقیں ہیں جو قرآن وحدیث پر عمل کے نام سے ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، اور ہم حتی المقدور احقاقِ حق کی سعی کرتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے حالیہ سفر سعودی عرب کے دوران ایک مکتبے پر ایک مختصر رسالہ ''**حکم عذاب القبر و عذابهم ونعيمهم**'' کے نام سے نظر آیا، جو امام ابن تیمیہؒ ہی کا ایک فتویٰ ہے جسے مدینہ یونیورسٹی کے ایک استاذ ڈاکٹر عبداللہ بن محمد نے اپنی تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے، اخیر میں خلاصے کے طور پر برزخ سے متعلق اہل السنۃ والجماعت کے ۱۳/ عقیدے بھی نقل کردئے ہیں۔ چونکہ متوارث و متفق علیہ تقلید کو قولاً بدعت یا شرک قرار دے کر تنہا ابن تیمیہؒ کی تقلید کو عملاً توحید وسنت اعتقاد کرنے والا طبقہ انہی کی تحقیقات کو حق سمجھتا ہے، خواہ وہ ان کا تفرد ہی کیوں نہ ہو، اس لئے امام ابن تیمیہؒ کے اس فتوے کو جو جمہور علماءِ اسلام کے اجماعی

اعتقاد کے مطابق ہے ترجمہ کرکے ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے، تاکہ ایسے لوگوں کے چشمِ فکر سے پردہ اٹھانے میں مددگار ہو۔ یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اس زمانے میں لوگ خود قرآن وحدیث پڑھ لیا نہیں کرتے تھے، بلکہ علماء سے معلوم کرلینے کو ضروری سمجھتے تھے۔

ان سے کسی نے درج ذیل استفتاء کیا تھا:

۱) کیا مردے زائرین کو دیکھنے اوران کی آواز سننے پر قادر ہوتے ہیں؟

۲) کیا اس وقت ان کی ارواح ان کے ابدان کی طرف لوٹائی جاتی ہیں؟

۳) کیا ان کو پسماندگان کی طرف سے ایصال کئے گئے تلاوت وصدقہ کا ثواب پہونچتا ہے؟

۴) کیا آدمی کی روح مرنے کے بعد پہلے مرچکے اپنے عزیز واقارب کی ارواح کے ساتھ مل سکتی ہے؟

۵) کیا آدمی کی روح اس جگہ منتقل کردی جاتی ہے جس جگہ کی مٹی سے وہ پیدا ہوا تھا، خواہ کہیں مرا اور دفن ہوا ہو؟

۶) کیا میت کو اس کے اعزہ واقربا کے گریہ وبکاء کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے؟

سائل نے لکھا کہ ان سوالات کو لے کر (ہمارے علاقے میں) بہت تشویش پائی جاتی ہے، اس لئے کتاب وسنت، اقوالِ صحابہ وتابعین اور ائمۂ متبوعین کی روشنی میں تسلی بخش جواب عنایت فرمایئے اور اختلاف کی صورت میں راجح قول کی نشاندہی بھی کیجئے، اللہ آپ کو اجرِ جزیل عطا فرمائے گا انشاء اللہ۔

امام ابن تیمیہؒ ان سوالات کے جواب میں حمد باری تعالیٰ کے بعد رقم طراز ہیں:

۱) جی ہاں! مردہ زائر کی آواز کو فی نفسہ سن لیتا ہے، جیسا کہ بخاری ومسلم کی حدیث سے ثابت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب لوگ قبر کے پاس سے لوٹنے لگتے ہیں تو میت کو ان کے چپلوں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ (بخاری ۲/۲۴۴، مسلم ۴/۲۲۰)

اسی طرح حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے بدر کے مقتولین کو تین دن تک یونہی پڑے رہنے دیا، اس کے بعد ان کی لاشوں کے پاس آئے اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا: اے ابوجہل ابن ہشام، اے امیہ ابن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ! کیا تم لوگوں نے تمہارے رب کے وعدوں کو برحق نہیں پایا؟ میں نے تو اپنے رب کے وعدہ کو بالکل سچ دیکھ لیا! حضرت عمرؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سنا تو عرض کیا: یارسول اللہ! یہ لوگ تو گل سڑ گئے، یہ کیسے آپ کی باتیں سن لینگے اور کیا جواب دے سکیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم سے بڑھ کر وہ لوگ میری بات سن رہے ہیں لیکن وہ بس جواب نہیں دے سکتے۔ (بخاری ۷/۳۵۰) اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ (بخاری ۳/۲۴۷)

صحیحین میں متعدد طرق سے مروی ہے کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو اہل قبور کو سلام کرنے کا حکم دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ قبرستان جاؤ تو یوں کہا کرو: السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین الخ (مسلم: ۹۷۵) اس سلام ودعا میں اہل برزخ کو مخاطب کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطبت اسی سے ہوتی ہے جو سننے کا اہل ہوتا ہے۔

ابن عبدالبرؒ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جب بھی کوئی شخص کسی شخص کی قبر سے گذرے جس کو وہ پہنچانتا تھا اور اس کو سلام کرے تو اللہ تعالیٰ اس میت کی روح اس کے جسم میں لوٹاتے ہیں تا کہ وہ سلام کا جواب دے سکے۔
(الاستذکار ۱/ ۲۳۴)

خود اپنے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب بھی کوئی مسلمان مجھ کو سلام کرے گا تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ میں لوٹا دے گا اور میں اس کے سلام کا جواب دوں گا۔
(مسند احمد ۱۶/ ۴۷۷)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: جمعہ کی شب اور اس کے دن میں مجھ پر کثرت سے درود پڑھو، کیونکہ تمہارا درود مجھ کو پہونچایا جاتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا: ہمارا

صلوٰۃ وسلام آپ کو کیسے پہونچے گا جب کہ آپ بوسیدہ ہو جائیں گے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو گلانا حرام کر دیا ہے۔

(ابوداؤد، النسائی، ابن ماجہ، احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان بسند صحیح)

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری قبر پر فرشتے مقرر کر دئے ہیں جو میری امت کا سلام مجھ کو پہونچاتے ہیں۔ (نسائی، احمد، دارمی وغیرہ بسند صحیح)

پس! یہ اور ان جیسی دیگر نصوص واضح کرتی ہیں کہ مردہ زندے کی آواز فی نفسہٖ سنتا ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر وقت سنتا رہے، بلکہ کسی وقت سنتا ہے تو کسی دوسرے وقت نہیں سن پاتا، جب کہ زندہ کو بھی ایسی صورتِ حال پیش آتی ہے کہ کبھی متوجہ کرنے والے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کبھی کسی عارض کی وجہ سے متوجہ نہیں ہو پاتا۔ البتہ یہ سننا ادراک وشعور کے تحت ہوتا ہے، اس پر کوئی جزا مرتب نہیں ہوتی۔ نیز یہ سننا وہ سننا نہیں ہے جس کی اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى سے نفی کی گئی ہے، کیونکہ اس آیت میں مطلق سننے کی نفی نہیں ہے، قبولیت وتعمیل والے سننے کی نفی ہے، اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو مردے سے تشبیہ دی ہے جو پکارنے والے کا جواب نہیں دے سکتا، اسی طرح چوپایوں سے تشبیہ دی ہے کہ آواز تو سن لیتے ہیں مگر معنیٰ نہیں سمجھ پاتے۔ پس مردہ بھی اگرچہ پکارنے والے کی آواز سن لیتا اور اس کے مفہوم ومعانی کو بھی سمجھ جاتا ہے مگر جواب دینے یا حکم پورا کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو امر ونہی کا ــــ باوجود سننے کے ــــ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

جہاں تک مردے کے دیکھنے کا تعلق ہے تو اس کے جواز وثبوت میں بھی حضرت عائشہؓ وغیرہ کے آثار موجود ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب تک میرے کمرہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ مدفون تھے میں یہ سوچ کر کہ یہ تو میرے شوہر اور میرے والد ہیں کپڑے اتار لیا کرتی تھی، مگر جب حضرت عمرؓ بھی مدفون ہو گئے تو خدا کی قسم اس کے بعد میں کبھی بغیر اچھی طرح چادر اوڑھے اپنے کمرہ میں داخل نہیں ہوتی تھی، کیونکہ مجھے

عمرؓ سے حیا آتی تھی۔ (رواہ حاکم ۳/۶۱، واسنادہ علی شرط الشیخین)

۲) یہ سوال کہ آیا مردے کی روح قبر میں اس کے بدن کے اندر لوٹائی جاتی ہے یا اس وقت اس کی قبر پر منڈلاتی رہتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مردے کی روح زیارتِ قبر کے وقت اس کے اندر لوٹا دی جاتی ہے جیسا کہ خود حدیث شریف میں آیا ہے، زیارت پسماندگان کے علاوہ وقتوں میں بھی روح بدن میں وقتاً فوقتاً لوٹائی جاتی رہتی ہے۔

مومنین کی روحیں حدیث شریف کے مطابق جنت کے درختوں پر پرندوں کی طرح لٹکی ہوتی ہیں، جب اللہ تعالیٰ حشر فرمائے گا تو ان کے ابدان میں لوٹا دی جائینگی۔ دوسری روایت میں ہے کہ "پھر عرش پر لٹکی قندیلوں میں پہونچ جاتی ہیں" (مؤطا امام مالک ۱/۲۴۰) اسی کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ چاہے بدن میں بھی پہونچتی رہتی ہے، اور یہ بدن میں روح کا آنا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس کی آمد ورفت اسی سرعت کے ساتھ ہوتی رہتی ہے جیسے کہ فرشتوں کی زمین وآسمان کے درمیان آمد ورفت ہوتی رہتی ہے یا جیسے سونے والے کی شعاعوں کے زمین پر آنے کی رفتار ہوتی ہے کہ کسی لمحہ وہاں ہوتی ہے تو کسی لمحہ یہاں! یہ بات متعدد آثار حدیث میں منقول ہے کہ روحیں قبر کے اندر رہتی ہیں یعنی کبھی (اور کبھی وہیں چلی جاتی ہیں جو ان کا مقام ہے،) یہ آثار ابن ابی الدنیاؒ کی کتاب القبور، ابن قیمؒ کی کتاب الروح، ابن رجبؒ کی اھوال القبور اور سیوطیؒ کی شرح الصدور وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۳) اب جہاں تک قراءت، صدقات اور دیگر خیر کے اعمال مردوں کو پہونچنے یا نہ پہونچنے کا سوال ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک صدقہ وخیرات، دعا واستغفار، نمازِ جنازہ اسی طرح قبر کے پاس (آزمائشِ برزخ میں تسہیل کے لئے) کی گئی دعا کا ثواب مردوں کو پہونچنے میں کوئی اختلاف نہیں (یعنی اس پر اہل السنۃ والجماعت کا اجماع ہے) البتہ عباداتِ بدنیہ مثلاً نماز، روزہ، تلاوت کا ثواب پہونچنے میں اگرچہ بعض

کو اختلاف ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان سب کا ثواب میت کو پہونچتا ہے۔
صحیحین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ: اگر کسی مرنے والے کے ذمے روزے باقی رہ گئے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے یہ روزے رکھ لے۔ (بخاری ۴/۲۲۶) یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ ایک عورت کا انتقال ہوا جس کے ذمے روزے رہ گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیٹی کو مرحومہ والدہ کی طرف سے روزہ رکھنے کا امر فرمایا۔ (بخاری ۴/۲۲۷) مسندِ احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمروؓ بن العاص (کے پوچھنے پر ان) سے فرمایا تھا کہ: تمہارے والد اگر مسلمان ہوتے تو تمہارا ان کی طرف سے صدقہ کرنا اور روزہ رکھنا انہیں نفع دے سکتا تھا۔ (مسند احمد، سنن ابوداود، بیہقی ۶/۲۷۹ بسند صحیح
چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبل رحمہ کا یہی مسلک ہے، اور مالکی علماء کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ (گویا جمہور علماءِ اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ عباداتِ مالیہ کی طرح عباداتِ بدنیہ کا اجر وثواب بھی میت کو پہونچایا جا سکتا ہے)
جن لوگوں نے وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم:۳۹) سے یہ سمجھا ہے کہ زندوں کی سعی و عمل سے مردوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تو ان کی بات غلط ہے، اس لئے کہ سنتِ متواترہ اور اجماعِ امت سے یہ جو ثابت ہے کہ میت پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے، اس کے لئے دعا واستغفار کی جائے، یہ بھی تو سعیِ غیر اور دوسرے کا عمل ہے، نیز صدقہ وخیرات اور مالی عبادات کا اجر پہونچنے پر پوری امت کا اجماع ہے جب کہ وہ بھی دوسرے ہی کا عمل ہے، جب یہ اعمال (آیتِ مذکورہ) کے منافی نہیں سمجھے گئے تو بقیہ اعمالِ صالحہ کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا، اور منکرین سے کہا جائے گا کہ تم آیتِ مذکورہ کے ہوتے ہوئے نمازِ جنازہ ودعائے مغفرت وخیرات کے جائز ہونے کا جو ثبوت دوگے وہی ثبوت ہم بقیہ اعمالِ صالحہ نماز، روزہ اور حج وتلاوت کے جواز کے لئے تم کو دینگے۔ ویسے علماء نے اس اشکال کے مختلف جوابات دئے ہیں، ان میں سے ایک مضبوط جواب یہ ہے کہ آیت وَاَنۡ لَّيۡسَ

لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ انسانوں کو دوسرے کا عمل نفع نہیں دیتا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس کو اس کا عمل نفع دیتا ہے، یعنی وہ صرف اپنے عمل کا مالک ہے دوسرے کے عمل پر اس کا کوئی تصرف نہیں ہے، لیکن دوسرا اپنا عمل کسی اور کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اس کی کہیں ممانعت نہیں، جیسا کہ مال کا معاملہ ہے کہ آدمی صرف اپنے مال کا مالک ہے، اسی پر حق رکھتا ہے، دوسرے کے مال پر اس کا کوئی حق نہیں، لیکن اگر دوسرا اپنا مال اپنی خوشی سے کسی کو دینا چاہے تو وہ برابر دے سکتا ہے، مال کی طرح کوئی اپنے اعمال (نافلہ) کا ثواب کسی اور کو دے دینا چاہے تو بلا خوف دے سکتا ہے، اس میں کوئی اشکال کی وجہ ہی نہیں ہے۔

۴) کیا مرنے والے کی روح اور پہلے سے مرے ہوئے لوگوں کی روحیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی رہتی ہیں؟

حدیث میں آتا ہے کہ میت کی روح جب آسمانوں پر لے جائی جاتی ہے تو دوسری روحیں اس سے مل کر زندہ لوگوں کے بارے میں پوچھنے لگتی ہیں کہ کیا حال ہے؟ پھر ان میں سے بعض روحیں کہتی ہیں ٹھہرو! اس کو ذرا آرام تو لے لینے دو۔..........

(ابن حبان، طبرانی کبیر ۴ / ۱۵۴۳ بسند ضعیف)

چونکہ زندوں کے اعمال واحوال کا مردوں کو علم ہو جاتا ہے اسی لئے حضرت ابو درداءؓ دعا میں کہتے تھے "اے اللہ! میں آپ کی کسی ایسے عمل کے کرنے سے پناہ چاہتا ہوں جس کی وجہ سے عبد اللہ بن رواحہؓ کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے"

یہ تو روح کے پہونچنے کے وقت پچھلی روحوں کا استقبال اور سوال و جواب تھا، جہاں تک ان روحوں کے مستقل قیام کا معاملہ ہے تو ان کی قیام گاہیں ان کے حسب مراتب ہوں گی، بعض جو اللہ تعالیٰ کے بہت ہی مقرب ہوں گے وہ اعلیٰ منازل میں ہوں گے اور جو اس مرتبے کے نہیں ہوں گے وہ ان سے کم مرتبے کی منزلوں میں ہوں گے، لیکن جب اللہ چاہے گا یہ روحیں جمع بھی ہوتی رہیں گی، جیسا کہ دنیا میں لوگ درجات کے تفاوت کے باوجود ایک

دوسرے کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ اب خواہ دفن کے اعتبار سے یہ اموات دنیا میں ایک دوسرے سے قریب رہی ہوں یا بعید وہاں تو اپنے اپنے مقام کے اعتبار سے ہوں گے۔ مثلاً کوئی کافر کسی مسلمان کے جوار میں مدفون ہو مگر روحیں وہاں ایک کی جنت میں ایک کی جہنم میں ہوں گی، یا مثلاً دو آدمی ایک ساتھ دفن کئے گئے ہوں مگر اعمال کے تفاوت کی وجہ سے دونوں میں دوری ہو سکتی ہے کہ کوئی عذاب کا حق دار ہو اور کوئی انعام و اکرام کا مستوجب تو یکجا دفن ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور ہوں گے۔

۵) جسم کے پیدائش کی جگہ منتقل کر دئے جانے کی بات صحیح نہیں ہے، (اس جگہ دو روایات میں مصنفؒ سے خلطِ مبحث ہو گیا ہے، محقق نے حاشیہ میں اس کی صراحت کر دی ہے) انسان قیامت کے دن وہیں سے اٹھایا جائے گا جس جگہ مرا اور مدفون ہوا، نیز تدفین کے بعد اس کے جسم کا قبر میں پایا جانا عام تجربہ و مشاہدہ ہے، محض وہم و گمان کے ذریعہ مشاہدہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا، پس انتقالِ جسم کا خیال عقل و نقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔

۶) کیا میت پر رونے سے میت کو تکلیف ہوتی ہے؟

اس مسئلے میں علماءِ سلف و خلف کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں صحیح بات یہ ہے کہ میت کو پسماندگان کے اس عمل سے تکلیف پہونچتی ہے، جیسا کہ بخاری (۳/۱۸۰) میں ہے "میت کو اس کے گھر والوں کے رونے اور بین کرنے سے عذاب ہوتا ہے" اسی طرح حضرت عبداللہ بن رواحہ کے واقعہ (بخاری ۷/۵۸۹) میں ہے کہ ان کے سکرات کے موقع پر ان کی بہن بین کر کے رونے لگیں تھیں اور اس بیچ میں ان کو ہوش آیا تو انہوں نے فرمایا "جب بھی تم میری کوئی تعریف کر رہی تھیں تو مجھ سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا تم واقعی ایسے ہی ہو؟؟

برخلاف اس کے بہت سے علماءِ سلف و خلف کی یہ بھی تحقیق ہے کہ میت کو عذاب نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں میت کا کوئی قصور نہیں اور دوسرے کے گناہ کی وجہ سے اس کو عذاب دئے جانے کا کوئی جواز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ

اُخْرٰی (الانعام: ۱۶۴) پھر جو احادیثِ صحیحہ اوپر مرقوم ہوئی ہیں ان کے سلسلہ میں ان علماء میں سے بعض مثلاً حضرت عائشہؓ اور امام شافعیؒ نے راویوں کی تغلیط کی ہے، بعض مثلاً امام مزنیؒ وغیرہ نے میت کے اس سے راضی رہنے اور تاکید کرنے پر محمول کیا ہے کہ اگر میت اس عمل کو پسند کرتا تھا یا اس نے خود اس کی وصیت کی تھی تو ان زندوں کی اس حرکت سے اس کو بھی عذاب ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں میت اپنی پسند کی وجہ سے اس سزا کی مستوجب ہوجائے گی۔

یہ اقوال ضعیف ہیں جب کہ ان کے مقابلے میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے صحابہ کرامؓ سے مروی احادیث واضح اور مضبوط ہیں۔ (آگے مصنف سے ایک دوسری بحث چھڑ گئی ہے جو نفس موضوع سے متعلق نہیں ہے اس لئے ترک کردی گئی ہے۔ (از مترجم) البتہ یہ اشکال کہ بلا قصور سزا دینا اللہ تعالیٰ کی شانِ عدل اور اصولِ دین وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عقاب اور سزا تو نائحہ یعنی بین کرنے اور رونے والوں ہی کو ملے گی جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نوحہ کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اس کو قیامت کے دن سوزش کی قمیص اور تارکول کا پاجامہ پہنایا جائے گا۔ (مسلم: ۹۳۴) یہاں عذاب سے مراد تکلیف واذیت ہے عقاب اور جزاءِ عمل نہیں، اسی وجہ سے یعذب کہا گیا ہے یعاقب نہیں کہا گیا، عذاب عقاب کے مقابلے میں اعم ہے، یعنی اس کے معنی میں وسعت ہے، جیسا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر کو قطعة من العذاب فرمایا ہے جو کھانے پینے کی مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ (بخاری ۳/ ۲۸ ۷) پس معلوم ہوا کہ احادیث میں پسماندگان کے نوحہ کرنے اور بین کرنے سے میت کو عذاب ہونے کی جو بات کہی گئی ہے وہ کسی کے عمل کا بوجھ کسی دوسرے پر ڈالنا نہیں ہے بلکہ اپنے معنی کی وسعت کے اعتبار سے دوسری چیز ہے یعنی اذیت وتکلیف کا محسوس ہونا۔ بہر حال میت کو اس عمل سے تکلیف ہونا واضح ہے۔ یہ تو سب ہی مانتے ہیں کہ قبر میں آدمی مختلف

طریقوں مثلاً خوفناک آوازوں، متعفن بدبوؤں اور قبیح شکلوں کے ذریعہ عذاب دیا جاتا ہے، تو پھر اسی کے انکار کی کیا وجہ ہے کہ میت کو اس کے لوگوں کے نوحہ و بکاء سے عذاب ہوتا ہے؟ (غور کیا جائے تو مصنفؒ نے اتنی ساری تفصیل اور حضرت عائشہؓ کی بھرپور تردید کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ وہی ہے جو حضرت عائشہؓ کا موقف ہے۔ از مترجم)

(اداریہ جولائی ۱۲ء)

اعتکاف میں آداب کی رعایت

اس شمارے کے آپ کے ہاتھوں میں پہونچنے تک رمضان المبارک کا عشرۂ رحمت نکل چکا ہوگا اور عشرۂ مغفرت کا آغاز ہو چکا ہوگا۔ اس لئے اس شمارہ میں رمضان المبارک کی نسبت سے تو صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ قارئین کرام عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف اور شبِ قدر کی تلاش کی طرف خصوصی توجہ خود بھی فرمائیں اور متعلقین واحباب کو بھی متوجہ کریں۔ شب قدر اگرچہ غیر متعین شب ہے مگر احادیث مبارکہ میں اُسے رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی راتوں میں محصور بھی بتلایا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کی مصلحت شب قدر کی تلاش اور حصول کو یقینی بنانا ہی قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں شب قدر کو یقینی طور پر پالینے اور اس کے خیر سے محروم ہونے سے اپنے کو بچانے کا شاید اعتکاف سے بہتر، آسان اور باوقار طریقہ کوئی اور سوچا بھی نہیں جاسکتا، سوچیں تو دریافت بھی نہ ہو سکے گا۔ اللہ پاک پوری امت کی طرف سے آقائے محسن ومہربان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو بہترین جزا عطا فرمائے جنہوں نے ہم کمزور عزم وہمت والوں کے لئے آخرت کی بھلائیاں حاصل کرنے کے نہایت آسان طریقے سکھائے اور ہمیں ان احسانات کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اعتکاف کی ترغیب کے علاوہ باتوفیق دوستوں بالخصوص نوجوانوں سے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ہر عمل کی طرح اعتکاف میں بھی نیت کا استحضار اور مقاصد کا استذکار بار بار کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر اچھے عمل کو عادت سے عبادت کی طرف منتقل کر کے بندہ کیلئے اجر وثواب اور ترقیٔ درجات کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں مگر نفس وشیطان اسے عبادت سے عادت ورسم کی

طرف لے جا کر بے ثمر و بے اجر بنا دینے کی سازش میں لگے رہتے ہیں۔اس لئے بیچ میں نیت کو رکھا گیا ہے، تجدید نیت سے عادت عبادت بن جاتی ہے، یعنی ہر عمل سے قبل مقاصد شرعیہ کا لحاظ اور رضائے الٰہی کے خیال کو تازہ کرنا پھر دوران عمل آداب کی رعایت اور احکام کے احترام کو ملحوظ رکھنا، نیز ایک دوسرے کو اپنے ضرر سے بچانا بہت ضروری ہے، اسی کے بعد کسی عمل کا دنیوی واُخروی نتیجہ صحیح معنوں میں مُیسر آتا ہے، پس جو لوگ اپنے اپنے مقام کی مسجدوں میں انفراداً معتکف ہوتے ہیں ان کو بھی اور جو لوگ اپنے مشائخ یا معتبر علماء کی معیت میں تعلیم وتربیت کا زائد نفع اُٹھانے کی غرض سے اجتماعاً اعتکاف کرتے ہیں ان کو بھی سب ہی کو کوشش کرنی چاہیے کہ مقاصد اعتکاف کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور منشاء صرف رضائے الٰہی اور شب قدر کی برکات کا حصول ہو۔

اسی طرح مساجد کے بیوت اللہ ہونے اور اس کے آداب کی اہمیت کو فراموش نہ کریں ہر شخص اپنے کو تنہا آیا ہوا سمجھے، دوستانے ہمارے آج کل کچھ زیادہ معتبر نہیں ہوتے، اکثر دوستوں سے دینی لحاظ سے نفع کم نقصان زیادہ ہوتا ہے، اعتکاف میں اگرچہ مباح کلام ممنوع نہیں ہے مگر اس بہانے ہمارا نفس ہمیں معاصی تک پہونچا دیتا ہے، غیبتوں تک کا ارتکاب ہو جاتا ہے، کچھ نہیں تو کم از کم فضولیات میں ابتلا تو ضرور ہی ہو جاتا ہے، جبکہ روحانیت کو نقصان پہونچانے کے لئے فضول کلام کچھ کم زہر نہیں ہے، اسی لئے حضرت شیخ الحدیثؒ کے ہاں کہا جاتا ہے کہ اعتکاف میں یہ سب سے بڑا پرہیز تھا کہ آپس میں باتوں کی اجازت نہ تھی۔ مختصر یہ کہ اعتکاف میں نیتوں کی صحت اور اوقات کے صحیح استعمال کی طرف توجہ ضروری ہے ان باتوں کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اعتکاف جیسی عظیم عبادت کی شان اور اس کی شکل متاثر ہو رہی ہے اور عام مسلمانوں پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم لوگ عام طور سے وقتی اعمال پر قناعت کے عادی ہوتے

جارہے ہیں، عوام کا تو خیر پہلے ہی سے یہ مزاج تھا خواص بھی اب اس کے خوگر ہوتے جارہے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم کچھ ایسا نظام بنائیں اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے رمضان المبارک میں کی گئی عبادتوں اور مجاہدوں کی برکات اگلے رمضان تک متعدی ہوں، تاکہ دین وایمان اور اعمال واخلاق میں ہر سال ترقی ہوسکے، اب ایسا ہورہا ہے جیسے کوئی شخص بڑی مشکل سے ایک سیڑھی چڑھے پھر بجائے اگلی سیڑھی چڑھنے کے واپس پہلی سیڑھی پر آجائے، ظاہر ہے کہ ایسا شخص عمر بھر اسی جگہ رہے گا آگے نہ بڑھ سکے گا، ہر رمضان ہمارے لئے قُربِ الٰہی کے اگلے مرحلے کی طرف ترقی کا سبب ہونا چاہیے، اگر ہم ہر سال رمضان میں سنبھل جائیں پھر حسبِ حال بحال ہوجائیں تو اگرچہ رمضان کے یہ اعمال واشغال، انفاق مال اور توبہ واستغفار، ہماری پاکی کا تو حسبِ وعدۂ الٰہی سبب بن جائیں گے مگر ترقی کا سبب نہ بن پائیں گے، ترقی کا سبب یہ اعمال اس وقت ہوں گے جب کہ اس سطح کو اگلی رمضان تک قائم رکھیں اور اگلے رمضان میں اس سے اوپر اٹھیں، یوں ہر رمضان ایک سیڑھی کے مثل ہمارے ایمان ویقین اور تعلق مع اللہ کو پروان چڑھاتا رہے گا۔ امید کہ قارئینِ کرام اس پر غور فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ خود مجھے اور میرے تمام احباب وقارئین اور جمیع مسلمین کو دین وایمان میں ترقی کے لئے مسلسل سعی کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

(اداریہ اگست ۱۲ء)

رمضان کے بعد!

رمضان المبارک کا مبارک و مسعود مہینہ تیس دنون تک اپنی باغ و بہار برکات ورحمات دکھا کر بالآخر رخصت ہو گیا، خدا تعالیٰ کے بندوں نے حسب مقدرت وتوفیق اس بارانِ رحمت و بہار مغفرت سے بہرہ لیا، ہر چہار طرف صیام وقیام، خیرات وصدقات، انفاق وایثار اور ذکر وتلاوت ہی کی باتیں اور اسی کے مناظر آنکھوں کے سامنے تھے، اس کے بعد عید سعید کی مسرتوں اور خوشیوں نے ایک دوسرے کو قریب اور بغل گیر کر کے ان رحمتوں کی تکمیل کردی۔ فالحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔

اب رمضان المبارک کو تو گذرنا تھا گذر گیا لیکن رمضان میں ملی نعمتوں کا تحفظ ہمارے ذمے رہ گیا، کہنا چاہئے کہ ایک مہینے تک رمضان انگلی پکڑ کر ہمیں چلاتا رہا اور آگے اسی طرح خود چلتے رہنے کی تاکید کر کے چھوڑ گیا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ بندگی کی اس شان کو یعنی طاعات کے اہتمام اور معصیات سے اجتناب کو حتی المقدور اسی طرح باقی رکھنے کی کوشش کریں، عزائم اور ارادے تو سب نے اچھے ہی کئے ہیں مگر نفس وشیطان کے مقابلے میں ہم لوگ اکثر ہار جاتے ہیں، بعض جلد بعض بہ دیر!

رمضان المبارک کی سب سے عظیم سوغات ''نورِ تقویٰ'' کا حصول ہے، قرآن کریم میں روزہ کا مقصد لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ فرمایا گیا ہے، حدیث میں ہے کہ روزہ رکھ کر بھی اگر کسی نے گناہ کا کام اور گناہ کی باتیں ترک نہیں کیں تو اس کا یہ بھوکا پیاسا رہنا فاقہ تو کہلا سکتا ہے صوم کا مبارک ومحبوب کا عمل بن نہیں سکتا۔

معلوم ہوا کہ ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے صوم کا ماحول بنا کر ہمیں تقویٰ اللہ کی دولت سے سرفراز کیا گیا ہے، اور تقویٰ کی حقیقت " امتثال الأوامر واجتناب عن النواهی " ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالاتے رہنا اور اس کی منہیات وممنوعات سے اپنے کو دور رکھنے کی سعی کرتے رہنا۔ پس مبارک ہیں وہ بندے جنہیں رمضان کے بعد بھی رمضان میں ملی اس عظیم نعمت تقویٰ کے تحفظ کی توفیق ہوجائے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ

منکرین فقہ کا ظلم وعدوان[۱]

ادھر چند برسوں سے ایک دین نا آشنا طبقے کی مہربانیوں سے جیسے ہی رمضان المبارک کا چاند نظر آجاتا ہے اختلافی مسائل کے مباحث چھڑ جاتے ہیں، شہروں سے لے کر دیہاتوں تک مختلف علاقوں سے ملی خبروں کے مطابق عوام الناس میں بجائے عملی جدوجہد کے علمی بحث ومباحث کا بازار گرم رہا اور وہ بھی پوری بے علمی وجہالت کے ساتھ! اس لئے کہ بحث وتحقیق علما کا کام ہے اور اس کے لئے مسئلہ مجوث عنہا سے متعلق موافق ومخالف دلائل اور اختلاف کے اسباب پر گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ ان عوام کے بس کا کام نہیں جو دین کے بنیادی علم سے بھی بے خبر ہیں چہ جائیکہ وہ اصولِ روایت ودرایت اور اساسِ تفقہ واجتہاد کی بصیرت رکھتے ہوں۔

منکرینِ فقہ اپنے عمل کے ذمہ دار اور عنداللہ جواب دہ ہیں کہ انہوں نے محض اپنے مسلک کی توسیع واشاعت کے لئے دورِ حاضر میں ملے چند مادی اسباب کو استعمال کرتے ہوئے عمل بالحدیث کے نام پر مسلمانوں کے درمیان جو انتشار واختلاف برپا کیا ہے اس کا شرعی جواز کیا ہے؟ کیا ماضی میں علمی مباحث کبھی عوام کالانعام کے حوالے کئے گئے تھے؟ کیا اختلافی مسائل کو کبھی دین اور بے دینی یا ضلالت وہدایت کے خانوں میں تقسیم کیا گیا تھا؟ کیا محدثین کے اصول اخذ ورد اور فقہاء کے ضوابط تقدیم وترجیح کا اصل محرک اتباعِ سنت اور

[۱] اس طبقے کے لئے اہل حدیث، سلفی، غیر مقلد کسی نام کا اطلاق صحیح نہیں معلوم ہوتا، وہ نہ صحیح معنوں میں حدیث پر عامل ہیں، نہ سلف کے پیروکار ہیں اور نہ ہی تقلید سے محفوظ ہیں، بس ان کا کام فقہ اور فقہاء کا انکار ہے۔

مراد نبوی تک پہونچنا ہی نہیں ہے؟ کیا علماء غیر مقلدین کو نہیں پتہ کہ اختلافی مسائل میں اصلا اختلاف کتاب وسنت کے فہم، معانی کی تعیین اور روایات میں ترجیح وتطبیق کے سلسلہ میں ہوتا ہے، ہر فریق اتباع کے اعلیٰ مقام تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے پاس اپنے موقف کو ترجیح دینے کے لئے عقلی واجتہادی دلائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، چونکہ وہ اس سے زیادہ کی طاقت نہیں رکھتا اور اس سے زیادہ کا مکلف بھی نہیں، اس لئے یہ اجتہادی نتیجہ اس کیلئے اور اس پر اعتماد کرنے والے کے لئے قابل عمل اور شریعت میں مقبول ومعتبر ہوتا ہے؟ ایسا نہیں ہوتا کہ حنفی اپنا موقف اجتہاد شخصی سے ثابت کرتا ہے اور سلفی وحی الٰہی سے اس کو متعین کرتا ہے، ظاہر ہے کہ ختم نبوت اور انقطاعِ وحی کے بعد اس کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہی مراد الٰہی اور منشاءِ نبوی ہے، دوسری کوئی صورت کا احتمال نہیں۔ اور کرتا ہے تو کذاب ومفتری قرار پا کر جب خود ہی مردود ہے تو دوسروں کے لئے ایسا شخص مطاع وراہنما کیسے بن سکتا ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ مواقع اختلاف میں ایک ہی معنیٰ متعین یا ایک ہی موقف قابل ترجیح ہوتا ہے تو اولاً تو اس کی کوئی دلیل نہیں دوسرے پھر کیا ضروری ہے کہ غیر مقلدین کا موقف ہی برحق اور متعین ہو کسی اور کا کیوں نہیں ہو سکتا؟

یہ حقیقت ہے کہ اختلاف وہیں ہوتا ہے جہاں اختلاف ناگزیر ہے، جہاں اختلاف کی کوئی شرعی وجہ نہیں وہاں علماء امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، سب کا ایک ہی موقف ہے اور سب متحد ہیں۔ پھر جن مسائل میں اختلاف ہوا ہے وہ یا تو نص کے معنے میں ایک سے زائد احتمالات ہونے کی وجہ سے ہوا ہے، یا نصوص میں تعارض کی وجہ سے ہوا ہے، یا نصوص اور تعامل میں اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے، یا صحابہ کرامؓ کے عمل میں تعدد کی وجہ سے ہوا ہے، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اختلاف کی یہ وہ وجوہ ہیں جن کی واقعیت وواجبیت سے کوئی صاحب علم تو کیا کوئی عقل مند بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی معقول اور ناگزیر وجہ سے بعض مسائل شریعت کی تعیین وترجیح میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہوا وہ تمام علماء وعقلاءِ امت کے

نزدیک خیر سمجھا گیا اور محمود قرار پایا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اجتہادی اختلاف اسلام کے مزاج رحمت اور اصول تیسیر و تسہیل کے حوالہ سے دیکھا جائے تو تکوین و تقدیر ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اختلاف الوان والسنہ قرآن کریم کی روشنی میں توحید باری تعالیٰ کی آیت بن سکتے ہیں تو علوم نبویہ کے ذریعہ عمل کی مختلف شکلوں کا وجود میں آنا توحید و رسالت کو مت اثر کرنے کا سبب کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ان چند مسائل کی بنیاد پر علماء امت کے درمیان جو اختلاف وجود میں آئے ان کو لے کر بڑے بڑے علمی مباحث مناظرے اور دلائل عقلیہ و نقلیہ کے تبادلے ہر زمانے میں ہوتے رہے، کتابیں لکھی گئیں، علوم اسلامیہ میں ان کی وجہ سے متعدد فنون کا اضافہ ہوا، لیکن اس سب کے باوجود اکاّ دکاّ واقعات کو چھوڑ کر ـــــ جن سے اتنے بڑے سماج کا خالی ہونا ممکن بھی نہیں اور ان کی کوئی انصاف پسند پذیرائی بھی نہیں کرتا ـــــ اہل اسلام علماء و عوام متحد و متفق اور ایک دوسرے کے حقوق کے محافظ رہے، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ضرورت پڑنے پر دوسرے کی حمایت و تائید سے بھی گریز نہ کیا۔ چونکہ یہ اختلاف فہم و عقل اور استنباط و استخراج میں ہوتا تھا اس لئے ہر فریق اپنے موقف کو اپنی کوشش میں کامیابی کے اطمینان پر غلطی کے امکان کے ساتھ ''صحیح'' اور دوسرے کے موقف کو اس کی دیانت و دلیل کے اعتماد پر صحت کے امکان کے ساتھ ''غلط'' سمجھتا تھا، اسی امکان کی گنجائش و وسعت نے اختلاف میں اتحاد اور خصومت میں مودت و محبت کی شان پیدا کردی تھی۔

یہ ساری تفصیل اس لئے لکھنی پڑی کہ گذشتہ دو دہائیوں کے دوران طبقۂ منکرینِ فقہ کی طرف سے توسیع مسلک اور تبلیغ موقف کی جو جارحانہ و جاہلانہ مہم شروع کی گئی ہے اس نے مذکورہ بالا معیار اختلاف اور وقار علم و عمل کو تاخت و تاراج کر کے تنفر و توحش کا ماحول قائم اور بغض و عناد کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس صورتحال پر جس قدر بھی غور کیا جاتا ہے تو اس کی درج ذیل وجوہ سمجھ میں آتی ہیں کہ ان حضرات نے

● اختلافی مسائل میں اپنے موقف کو اس طرح حتمی اور قطعی سمجھ لیا ہے جیسے وحی آسمانی سے مؤید کر دیا گیا ہو، گویا ان کا موقف ایک عقیدہ ہے جس سے سرمو انحراف کی گنجائش نہیں، اسی لئے اس کی باقاعدہ دعوت دیتے اور اس کے خلاف کو بے دینی و گمراہی سمجھتے ہیں، جب کہ ایسا سمجھنا حقیقتِ واقعہ اور عقیدۂ متواترہ کے خلاف ہے۔

● احادیث و آثار کے صحت و سقم کے سلسلہ میں اصول متوارثہ کو نظر انداز کر کے کتب متعینہ بلکہ کتاب واحد یعنی بخاری شریف پر انحصار کر لیا گیا ہے یا شیخ البانیؒ کی تصحیح و تضعیف کو حرفِ آخر مان لیا گیا ہے۔ اگر چہ کہ یہ انحصار بھی عملاً اپنی ضرورت کی حد تک ہی ہے، کل مرویات پر نہیں۔

● خالص علمی مباحث کو جو وفورِ علم اور احاطۂ معلومات کے متقاضی ہیں عوام الناس کے ـــــ جو ان مباحث کے الف بے سے بھی واقف نہیں ہوتے ـــــ حوالے کر کے انہیں انتہائی سطحی اور نعوذ باللہ سوقی حد تک اتار دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے تحقیق و اجتہاد کا اختلاف دین و ایمان کے اختلاف کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

● اپنا اصولی موقف اپنے اکابر کے حوالہ سے مضبوط رکھنے کے بجائے "سلفیت" سے جوڑ دیا گیا ہے، اور اس میں تلبیس سے کام لیا گیا ہے، کیوں کہ حنابلہ کی سلفیت مخصوص کلامی موقف سے تعبیر ہے، جبکہ غیر مقلدین کی سلفیت فقہی موقف و امتیاز پر مبنی ہے۔ چنانچہ سعودی علماء سلفیت کے حوالہ سے استواء علی العرش، الایمان قول و عمل، اور باری تعالیٰ کے وجودی فوقیت و علویت جیسے مباحث پر بولتے لکھتے رہتے ہیں اور غیر مقلدین سلفیت کے نام سے آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأت فاتحہ وغیرہ مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ گویا اتحاد مسلک کا فریب دے کر ان کی سرکاری و مالی تائید حاصل کی گئی ہے، اور اس کا استحصال کرتے ہوئے سعودی عرب میں آنے والے نوجوانوں کو باور کرایا جا رہا ہے کہ وہ اب تک بدعقیدہ و بدعمل تھے، کم از کم اب ان کے ذریعہ اپنے دین و ایمان کو صحیح کر لیں۔

● مسائل قیاسیہ ونوازلہ میں اپنے پاس کوئی صحیح صریح نص نہ ہونے کے باوجود حنابلہ کے فتاویٰ اوران کی تحقیقات کوان کی مالی مدد سے عام کیا جارہا ہے، اسی پر عمل کیا اور کرایا جا رہا ہے، اس طرح کہ یہی وحی آسمانی ہے اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے وہ فعلِ شیطانی ہے۔

● حنابلہ کے بمقابلہ احناف کو بالخصوص کمزور دکھانے، ان کی تصغیر وتحقیر کرنے اوران پر صدیوں سے بلکہ خیر القرون سے بنے اعتماد کو متأثر و مضمحل کرنے کے لئے شرمناک تعبیرات کا استعمال کیا جارہا ہے، فرضی داستانیں وضع کی جارہی ہیں اور کتب فقہ کے لاکھوں مسائل میں سے بعض ضمنی مسائل یا تسامحات کو چُن چن کر پھیلایا جارہا ہے، یہ تأثر دیتے ہوئے کہ فقہ بس ایسی ہی باتوں کا نام ہے، گویا فقہاء کرام نے اپنی عمریں پیشاب سے تعویذیں لکھنے، انگلیوں سے غلاظت چاٹنے اور جانوروں سے بدفعلی کرنے کی وکالت و حمایت میں گذاری تھیں، اوران کے متبعین اب تک بھی یہی کررہے ہیں۔رہ گئی عبادت و انابت، تقویٰ وطہارت، خوف وخشیت تو یہ سب سلفیوں کے حصے ہی میں آئے ہیں، تقریر و تحریر کا یہ انداز مسلکی تعصب کی بدترین ونادر صورتحال ہے۔

● فقہ وفتاویٰ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے یہ باور کرایا جارہا ہے کہ یہ سب قیاسی مسائل ہیں اور قیاس شیوۂ ابلیس ہے اس کا کتاب وسنت سے کوئی تعلق نہیں، تاکہ عوام الناس علماء سے آزاد ہوکر انہی کی بتائی ہوئی ہر بات کو برحق مان لیں یا پھر بدرجۂ مجبوری حنابلہ سعودیہ کے فتاویٰ اور خیالات اختیار کئے جاسکیں، حنفیہ کے تو ہرگز نہیں۔

اسی صورتحال کو ہم نے منکرین فقہ کی جارحانہ وجاہلانہ مہم سے تعبیر کیا ہے، ان کے سنجیدہ طبقے سے ہمیں نہ پہلے کوئی اختلاف تھا اور نہ اب ہے، البتہ اس صورتحال کی خاموش تماشائی بنے رہنے اوراس کے نتیجے میں پیش آمدہ دین بیزاری وعداوت باہمی کو گوارا کر لئے جانے پر اس طبقے کے علماء وقائدین پر تعجب ضرور ہے۔جب کہ دین محض ان اختلافی مسائل کا نام نہیں ہے، دین ان مسائل کے اختلاف کا متحمل تو ہوسکتا ہے مگر اس نفرت وانتشار اور کسی

ایک موقف پر ناروا اصرار کا متحمل ہرگز نہیں ہوسکتا، کتاب وسنت صرف نماز اور نماز کے بھی چار مسائل کا نام نہیں ہے، کتاب وسنت تو ایمانیات سے لے کر اخلاقیات تک تمام شعبہ ہائے حیات کی راہنمائی کرتے ہیں، حقوقِ اسلام و مسلمین پر روشنی ڈالتے اور اس کا سختی سے پابند بناتے ہیں، تہذیبی ورثے کی طرف توجہ دلاتے ہیں، لیکن ان سب سے بے خبر اور بے پروا ہو کر اس طبقے کی اکثریت حقوق اسلام و مسلمین کو پامال کر رہی اور نفرت و علاحدگی کی دیواریں تعمیر کر رہی ہے۔

رمضان تمام چوطرف یہی سوالات اور یہی مباحث چلتے رہے، مثبت و مفید کاموں میں کم اور منفی و مُضر بلکہ بعض لغو و لایعنی باتوں میں وقت ضائع ہوتا رہا، علماء کا بھی عوام الناس کا بھی۔ تراویح میں یہ لوگ سب مل کر ایک طرف کو کھڑے ہوتے ہیں تاکہ آمین کی گونج کر سکیں، آٹھ رکعت ہوتے ہی صفوں میں سے نکل کر صحن میں انفرادی نفلیں پڑھتے ہیں یا قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، بعض تو مسجد کی چھتوں پر سگریٹ نوشی اور گپ باشی میں مصروف ہوتے ہیں مگر مسجد میں نماز با جماعت اور تسلسل تلاوت سے استفادہ نہیں کرتے، جیسے آٹھ سے زائد نماز ان کے ہاں نماز نہیں کوئی بڑا گناہ اور فحش عمل ہو[۱]۔ اعتکاف میں آتے ہیں تو بھی انہی مسائل کی اشاعت کرنے اور انہی امور پر اصرار سکھانے کے لئے آتے ہیں، مغرب سے قبل عین امام کے پیچھے سنت کی نیت باندھ لیتے ہیں، خطبے میں قصداً تاخیر سے آ کے بیچ مسجد میں سنت شروع کر دیتے ہیں، جبکہ ایک طرف کو ہو کے بھی پڑھ سکتے ہیں، بعض جگہ معمولاً جماعت کے بعد آ کر علاحدہ جماعت بناتے ہیں، ٹوپی پہننے کو کبیرہ گناہ سے کم نہیں سمجھتے[۲]، دینی مجالس میں بھی کوئی سوال کرتے ہیں تو انہی اختلافی امور سے متعلق

---

۱ مجھے امریکہ میں مقیم ایک عالم دین نے بتایا کہ شیخ البانیؒ جب وہاں بلائے گئے تھے، ان کی قیامگاہ سے قریب مسجد میں بیس رکعت تراویح ہوتی تھی، شیخ بھی مکمل پڑھتے تھے، کسی کے اعتراض پر فرمایا کہ رمضان عبادت کا مہینہ ہے، میں قائل تو آٹھ رکعت تراویح کا ہی ہوں مگر اس کے بعد بھی اگر نوافل جاری ہیں تو میں اس کو کیوں ترک کر دوں؟

۲ ایک نوجوان کو اسی رمضان میں خود دیکھا کہ کھڑے کھڑے وضو بنایا، جوتوں پر مسح کر لیا، اور پھر جوتے باہر چھوڑ کر مسجد میں نماز ادا کر لی، اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کونسا مسلک ہے؟

کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان چند مسائل کے علاوہ دین وایمان کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ یہ نری بے دینی کی بات ہے۔

اس تیزی سے بڑھتی جارہی بے دینی کی عام صورتحال کے ذمہ دار وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو سوائے ان علامتی مسائل کے اور کسی مسئلے کی اہمیت سے اپنے طبقے کو واقف نہیں کراتے اور نہ اختلاف کے حدود وآداب سے باخبر کرتے ہیں۔ الحمدللہ ہم لوگ تو ہمارے نوجوانوں کے معلوم کرنے پر یہی کہتے ہیں کہ وہ عمل اور طریقہ بھی مروی ہے جیسے ان لوگوں نے اختیار کیا ہے مگر ہمارے نزدیک مسنون ہونا ثابت نہیں۔ اس دینی ناانصافی اور علمی خیانت کا جواب اگر اُسی طرز وانداز پر دیا جائے تو یہ ہمارے لئے کوئی بڑی بات نہیں، جہالت وجارحیت کیلئے کرنا ہی کیا پڑتا ہے؟ لیکن دو باتیں ہمارے لئے رکاوٹ ہیں، ایک تو یہ کہ اس صورت میں نہ تو احادیث وروایات کا احترام باقی رہے گا نہ محدثین ورُواۃ کا مقام قائم رہ سکے گا، جیسا کہ ان لوگوں کو یہ نقصان ہوچکا ہے۔ ان کے ہاں عام رجحان میں صحیح کا مطلب سچ اور ضعیف کے معنیٰ جھوٹ ناقابلِ التفات بلکہ وضع محض کے ہوگئے ہیں، جبکہ بات ایسی نہیں ہے، یہ اور ان جیسی تمام اصطلاحات صرف فنی معیار اور وضعی مفاہیم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہیں ورنہ یہ بات مسلم ہے کہ بسا اوقات کوئی صحیح حدیث ہر اعتبار سے صحیح وصریح ہونے کے باوجود ناقابل عمل اور ایک ضعیف روایت ضعف وجرح کے باوجود شواہد وتوابع یا تعامل وتوارث کی مدد سے لائق احتجاج واستفادہ ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کیلئے وسیع علم اور اصول وضوابط پر گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح خود جرح وتعدیل میں ائمہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ ہر ایک کے اصول الگ ہیں، پھر جرح وتعدیل کے انداز والفاظ میں قوت وضعف کا اختلاف پایا جاتا ہے، نیز ائمہ جرح وتعدیل میں تشدد وتساہل بصیرت وعجلت کا اختلاف موجود ہے۔ غیر مقلد حضرات نے محدثین کے وضع کردہ اصطلاحات کے حوالہ سے صرف صحیح وضعیف کی بحث عوام کو یاد کراکے دیگر ضوابط وتفصیلات

سے بے خبر رکھا ہے۔ اب اگر ہم بھی تمام قواعد وضوابط سے صرف نظر کر کے صرف مقابلہ آرائی اور فتح مندی کے جذبات سے آگے بڑھیں اور محض یک طرفہ بات کرتے رہیں تو عوام کے جہل کا فائدہ تو اٹھایا جا سکتا ہے مگر اپنے ہی دین کی جڑوں کو کھوکھلا ہونے سے بچایا نہیں جا سکتا۔ ہم محدثین وفقہاء دونوں کا احترام واعتماد بحال رکھنے کو دین اسلام کی حفاظت کیلئے لازم سمجھتے ہیں، کیوں کہ جس طرح سے فقہ اور فقہاء کی پگڑیاں اچھالی جا رہی ہیں اسی طرح اصولِ حدیث اور محدثین کی قبائیں اتاری جانے لگیں تو پھر دینِ اسلام تو ایک مذاق ومفروضہ بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے ہمارا طریق یہ ہے کہ اختلافی امور میں اختلاف کی نسبت محقق اور مجتہد کی طرف کی جائے، اس کو دین و بے دینی یا حق و باطل کا اختلاف نہ کہا جائے، نیز مجتہد اور اس کے متبع کیلئے اپنی تحقیق کو اختیار کرنے کا حق تسلیم کیا جائے۔ اس لئے کہ ہر فریق نے کتاب وسنت سے استشہاد کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ ایک کا استشہاد دوسرے کے نزدیک کامل نہیں۔ چنانچہ ہم اپنی تحقیق کے مطابق جس موقف کو مجروح ومطروح سمجھتے ہیں اس کی بھی توہین وتنقیص نسبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے جائز نہیں سمجھتے، تضلیل تو دور کی بات ہے، کیوں کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف غلط بات کی نسبت جائز نہیں اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب باتوں کو کسی مضبوط ومستحکم دلیل کے بغیر اور صحت کے امکان کے باوجود یکلخت رد کر دینا بھی صحیح نہیں۔

آپ غور کریں کہ احادیثِ مبارکہ کی محض روایتی صحت وضعف کی بنیاد پر تقسیم کا جو کام شیخ ناصر الدین البانیؒ نے انجام دیا سابقہ محدثین میں کسی نے یہ کام نہیں کیا، حالانکہ وہ بھی یہ کام اچھی طرح کر سکتے تھے مگر ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حدیث پر فنی حکم تو صادر کرتے تھے مگر دیگر وجوہات کی بنیاد پر اس کی روایت بھی کرتے اور عمل بھی برقرار رکھتے تھے، مگر شیخ کی موجودہ تقسیم نے ذخیرۂ حدیث کے ایک بڑے حصے سے عوام کا اعتماد یک لخت اٹھا دیا بلکہ ان کے دلوں میں ایک گونا بُعد ونفرت پیدا کر دیا ہے۔

غرض چونکہ یہ رویّہ احادیث مرویہ کے بارے میں ـــــ اگر چہ وہ ہماری تحقیق میں مجروح ومنسوخ یا معدول ہی کیوں نہ ہوں ـــــ ہم اختیار نہیں کر سکتے اس لئے ہم منکرین فقہ کے موجودہ سطحی طرز اختلاف کا جواب اسی طرز وانداز پر دینے سے بچنے کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں، حدیث رسول کے بارے میں یہی ہماری احتیاط آج کل کے منکرین فقہ کو سر چڑھ کے بولنے اور ہمارے موقف کو قطعاً گمراہ بتلانے کی جرأت دیتی ہے، ورنہ یہ بات نہیں کہ ہمارے پاس دلیل نہیں، نہ یہ بات ہے کہ منکرینِ فقہ کا موقف منزل من اللہ اور ناقابلِ اختلاف ہے۔

دوسرا مانع یہ ہے کہ مقابلہ آرائی یا تضلیل دیگر کا یہ سلسلہ ہماری طرف سے بھی عامیانہ سطح پر شروع ہو جائے تو اس سے بجز اس کے کہ خانہ جنگی شروع ہو کر جگ ہنسائی ہو اور دشمنان اسلام کو اس انتشارِ باہمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا سنہرا موقع مل جائے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، امت کا یہ نقصان کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا جا سکتا۔[1] اس لئے جہالت وجارحیت کا جواب تُرکی بہ تُرکی دینے کے بجائے ہمارے علماء کرام کو اپنے موقف کی سچائی اور واقعیت کا اثبات اور منکرینِ فقہ کے مختار موقف کا رد دلائل واضحہ کی روشنی میں اس وقت تک کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ وہ ائمہ مخالف پروپگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ائمہ کے اتباع کا بالاجماع جائز بلکہ عوام کے لئے ضروری ہونے کے باوجود وہ اسے جب تک شرک سے ناحق تعبیر کرتے اور مقلدین کو گمراہ قرار دیتے رہیں گے تب تک اپنی حقیّت کا دفاع نہ صرف یہ کہ مقلدین کا حق ہے، بلکہ حق متوارث اور حق اجماعی کا حق ہے۔

علماء کرام کو چاہیے کہ پہلے وہ خود ان مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیں، دلائل کو سمجھیں اس کے بعد عوام الناس کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہیں، مختلف زبانوں میں عام فہم انداز میں مختصر رسائل، پمفلٹ اور چارٹس تیار کر کے اسے پھیلائیں، مساجد میں آویزاں کریں، نوجوانوں کیلئے تربیتی کلاسس لیں اور سنجیدہ علمی طریقے پر احقاقِ حق کرتے رہیں،

اسی کے ساتھ اگر یہ لوگ مناظروں اور جوابوں کا چیلنج دیں تو علماء کرام اس کے لئے بھی مکمل تیار رہیں، قطعاً پیچھے نہ ہٹیں۔ اللہ پاک تمام مسلمانوں کو حق کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے، اور منکرینِ فقہ کو توفیق عطا فرمائے کہ ان فروعی و ترجیحی مسائل کو لے کر امت شکنی کا کام کرنے کے بجائے قادیانیت، عیسائیت، اور لادینیت کا مقابلہ کرنے کی اہم ترین ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگ جائیں۔ آمین۔ وصلی اللہ علی النبی الکریم

(اداریہ: ستمبر ۱۲ء)

انها شهادة

کہتے ہیں کہ ایک عربی ادیب ''فتح بن خاقان'' نے حسد کی وجہ سے اپنے ایک ہم عصر ادیب ''ابن الصائغ'' کے خلاف مضمون لکھا، اس میں اس کی خوب ہجو اور مذمت کی، طرح طرح کی تہمتیں لگائیں اور اس کے اخلاق و عزت کا دامن داغدار کیا، ''ابن الصائغ'' کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے بہت صبر و حلم سے کام لیتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا، جواب میں کسی جذباتی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ ایک مرتبہ ''ابن الصائغ'' کہیں جا رہا تھا راستے میں اس نے اپنے حاسد ''فتح بن خاقان'' کو شاگردوں کے درمیان محفل جمائے بیٹھا ہوا دیکھا، قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا اور انها شهادة یعنی وہ سب باتیں میرے کمال کی دلیل ہیں کہہ کر آگے بڑھ گیا، وہ تو آگے نکل گیا مگر ''فتح بن خاقان'' کا حال بُرا ہونے لگا، وہ آگ بگولا اور لال پیلا ہوتا جا رہا تھا، شاگردوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ انها شهادة کہہ کر آخر ایسی کونسی گالی دیدی جو اس قدر تاثر اور غیض و غضب کا سبب ہو رہی ہے؟۔ ان لوگوں نے استاذ ہی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ دراصل اس نے اس جملے کے ذریعے اس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے:

وإذا أتتک مذمتی من ناقص

فهی الشهادة لی بانی کامل

شاعر کہتا ہے کہ اگر تمہارے سامنے کسی ناقص و عاجز شخص کی زبان سے میری برائی پہونچے تو تم متاثر نہ ہونا، کیوں کہ کسی گھٹیا شخص کا میری برائی کرنا تو میرے باکمال ہونے کی

شہادت ہے مذمت نہیں۔

"فتح بن خاقان" کہنے لگا کہ میں نے اپنے مضمون کے بیسیوں صفحات میں اس کی جتنی مذمت و برائی بیان کی تھی اور اسے رسوا کرنے کی جو کچھ کوشش کی تھی اس ایک جملہ سے اس نے مجھے اس سے زیادہ رُسوا کر دیا، مطلب یہ ہے کہ نہ جوابی مضمون لکھا، نہ گالیوں کے ڈھیر لگائے، نہ جذبات سے بے قابو ہوا، نہ توڑ پھوڑ کر کے اپنا ہی سب کچھ لٹایا بلکہ ہمت و حوصلے سے کام لے کر اور مناسب وقت کا انتظار کر کے ایسا مضبوط و تیر بہ ہدف جملہ کہا کہ دشمن کے دماغ ٹھکانے لگ گئے اور اپنی اوقات سمجھ میں آ گئی۔ واقعی جب کوئی چھوٹا بڑوں پر، جاہل قابل لوگوں پر، بے عزت عزت والوں پر، ناپاک پاکبازوں پر اور کندۂ ناتراش اصحابِ فضل و کمال پر انگلی اٹھاتا ہے تو اس کا ان کو منہ چڑانا ہی عقل مندوں کے نزدیک حاسد کی ذلت و بے بسی اور محسود کی عزت و سربلندی کی علامت و شہادت بن جاتا ہے۔

گذشتہ دو ہفتوں سے میڈیا اہانتِ اسلام کی خبروں سے لبریز ہے اور زبانیں اسی کے چرچوں سے میں سرگرم! ہوا کیا؟ کسی بدخصال و بدقماش شخص نے ایک فلم تیار کی جس میں پیغمبر اسلام و رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان ہستی کو قابل اعتراض کردار کے ساتھ نمایاں کرنے کی مذموم سعی کی، ظاہر ہے کہ اس حرکت کو ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان تو کیا کوئی شریف الطبع اور انصاف پسند غیر مسلم بھی گوارا نہیں کر سکتا!

کہا جاتا ہے کہ فلم کے تیرہ منٹ پر مشتمل چیدہ چیدہ مناظر انٹرنیٹ کی یوٹیوب نامی سائٹ پر بھی نمایاں کئے گئے، اس کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں تک یہ مناظر پہونچیں اور وہ مشتعل و بے قابو ہو کر وہ سب کریں جو ایسے مواقع پر جذبات سے مغلوب اور انجام سے بے خبر طبقہ کیا کرتا ہے، جس کا کوئی اثر مجرم پڑتا ہے اور نہ ہی مجرم کی پشت پناہی و جانبداری کرنے والوں کے کانوں پر جوں رینگتی ہے، کچھ اثر ہوتا بھی ہے تو بعد از خرابیٔ بسیار ہوتا ہے، وہ بھی کچھ زیادہ اہم نہیں محض طفل تسلی کے بطور ہوتا ہے۔

یہ جذباتی ردعمل کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ فطری اور نفسیاتی ہے، ہونا ہی چاہئے ہوتا ہی ہے، مگر عقل وشعور اور علم وآگہی کی روشنی میں دیکھا جائے تو نہ یہ دانشمندانہ طریقہ کار ہے اور نہ ہی کتاب وسنت کے مطابق ہے، جبکہ ہم بہ حیثیت انسان عقل کے اور بہ حیثیت مسلمان علم کے پابند ہیں، جذبات کے رو میں بہنے سے بنتے ہوئے کام بگڑتے تو ہیں مگر بنتے نہیں، بچہ جب اپنے منشاء کو پورا کرنے میں ناکام ہوتا ہے جو کھانا برتن، کھلونے وغیرہ اس کے سامنے رکھے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی اٹھا کر پھینک دیتا ہے یا پٹخ کر توڑ دیتا ہے لیکن بڑا آدمی ایسے مواقع پر یہ حرکتیں نہیں کرتا، کیوں؟ وہی شعور بے شعوری کا فرق!

اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر اس وقت صرف ایک مثال دیتا ہوں، ہمارے شہر میں کسی معروف مشنری اسکول کے بارے میں خبر آئی کہ وہاں طلبہ سے صلیب کی تعظیم کروائی جا رہی ہے، جیسے ہی یہ خبر اخباروں میں آئی نوجوان جذبات سے بے قابو ہو گئے اور ایک بڑے جتھے کی شکل میں اسکول پر پہونچ گئے آفس میں داخل ہوئے، وہاں رکھی ہوئی صلیب اور میری[1] کے مجسمے توڑ دیئے، سامان بکھیر دیا اور خوب ہنگامہ برپا کیا، اسکول کے منتظمین نے پولیس کو طلب کرکے ان نوجوانوں کو ان کے حوالے کر دیا، بچوں کے سرپرستوں سے وقتی معذرت اور مفاہمت کر لی، بات ختم ہو گئی، اور چند دنوں کے بعد اسکول کے معمولات مشنری کے تقاضوں کے مطابق بحال ہو گئے، اب کون ہر بار جاکے توڑ پھوڑ کرتا رہے گا۔

یہ ایک معمولی واقعہ ہے ہمارے معاشرہ کے ہزاروں واقعات میں سے، آپ سنجیدگی سے غور کریں کہ اس اقدام سے مسلمانوں کو کیا ملا؟ چار نوجوان پولس کے حوالے ہوئے، انتظامیہ نے متأثر سے ہمدردی کی، اخباروں میں موافق ومخالف تبصرے چند دنوں تک چلتے رہے، اسکول والوں نے اپنا آفس بھی بحال کر لیا اور اپنے معمولات بھی جاری کر لئے۔

---

[1] "مریم" کا اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ فی الواقع ان کے نہیں۔

اس اسکول میں پڑھنے والے مسلم بچوں کو آخر اس سے کیا فائدہ ہوا؟ اس کے بجائے اگر مسلمان بچوں کے سرپرست مل بیٹھتے، مشورہ کرتے اور اپنے اپنے بچوں کو اس اسکول سے اسی دن نکال لیتے تو ان معصوموں کے دین وایمان کا تحفظ بھی ہوجاتا اور اسکول والوں کو تعلیم کے نام پر تبلیغ کرنے کا انجام بھی معلوم ہوجاتا، لیکن افسوس! مسلمانوں نے یہ سب کیا مگر اپنے بچوں کو مشنریز میں پڑھانا نہیں چھوڑا۔ مختصر یہ کہ جن مواقع پر صبر وحلم اور عقل وشعور سے کام لے کر موٴثر وپائیدار فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت جذبات سے مغلوب ہوکر غیر موٴثر اور ناپائیدار اقدامات سے بچنا مسلمانوں کی شان اور اسلام کا شعار ہے، اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

رہ گیا یہ سوال کہ دشمنانِ اسلام کی طرف سے رہ رہ کر ایسے حالات کیوں پیدا کئے جارہے ہیں اور ان کا سد باب کیا ہے؟ تو سب سے پہلے ہمارے مدنظر رہنا چاہیے کہ یہ حالات وحادثات اتفاقی طور پر یا کسی غلطی اور نادانی کے نتیجے میں نہیں پیش آرہے ہیں، اس کے پیچھے جانی بوجھی سازشیں اور منظم طاقتیں کارفرما ہیں۔ چنانچہ جب کبھی مسلمان کسی کامیابی کی طرف گامزن ہوتے ہیں یا کوئی بامقصد جدوجہد میں مشغول ہوتے ہیں یا دشمنان اسلام کو کوئی مخالف اسلام ومسلمین ہنگامی قدم اٹھانا ہوتا ہے، یا اسلام کی حقانیت کی طرف اہلِ مغرب کا رجحان ہونے لگتا ہے تو ایسے وقت میں مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچانے اور جی جلانے والا کوئی واقعہ رونما کر کے ان کے دل ودماغ کو ماؤف اور ان کی توجہات وخدمات کو منتشر کردیا جاتا ہے، وہ چند دنوں تک اپنی بامقصد مساعی کو چھوڑ کر کسی انجانے ہدف اور بے منزل سفر کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں، میڈیا بھی سارے عالم کی آنکھوں پر انہی خبروں اور سرخیوں کے پردے ڈالے رکھتا ہے، پھر اس ہنگامے کے ختم ہوتے ہوتے ان طاقتوں اور سازشوں کے کام نکل جاتے ہیں اور ہم احتجاجیوں اور دکھی دلوں کے کام معرضِ خطر میں پڑجاتے ہیں، کاش کہ ہم اس صورتحال کو سمجھ پاتے اور کاش کہ اس بکھری

امت کا کوئی مُدبر قائد ہوتا جو اسے ہر بے مقصد کام سے یکسو کرکے مقاصد واہداف کے حصول میں لگائے رکھتا۔

یہ ایک واقعاتی اور قریبی سبب ہے، اس کے علاوہ ایک حقیقی اور مخفی سبب بھی ہے، اور وہ مسلمانوں کا خود اپنے عظیم و محسن پیغمبر، اور ان کی دعوت و تعلیم اور ان کی اداؤں اور سنتوں کی ناقدری کرنا بلکہ عملاً انہیں از کار رفتہ یا اولڈ ایج قرار دیکر شخصیت و سماج سے علاحدہ کردینا ہے، جب ہمارے ہی دلوں میں وہ اور ان کی ادائیں محبوب نہیں تو دوسروں کا کیا شکوہ؟ وہ جو کریں کم ہے۔

ان حالات کے سدباب کے لئے بھی ہماری سمجھ میں دو باتیں آتی ہیں، ایک یہ کہ مسلم حکمراں، مذہبی قائدین اور سیاسی عمائدان حرکات کے مرتکبین کو سزا دلوانے اور ان حرکتوں کے خلاف عالمی ضابطۂ اخلاق مدون کرانے کیلئے متحد ہو جائیں اور مخلصانہ جدوجہد کریں، ان واقعات کو محض اپنی پارٹیوں کو چمکانے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں

دوسرے یہ کہ عامۂ مسلمین مغرب کی اندھی تقلید ترک کرنے اور "گلوبلائزیشن" کے دھارے میں بہہ جانے کی حمایت ووکالت کرنے کے بجائے خود بھی اپنے حبیب ومحبوب ومحسن اعظم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کی کوشش کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں، اور یقین رکھیں کہ دنیا وآخرت کی سرخروئی وسربلندی اپنے آقا کی غلامی میں ہے اور بس!

اللہ پاک توفیق نصیب فرمائے آمین

(اداریہ اکتوبر ۱۲ء)

وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ أَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں دین حق سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے، جس کو توفیقِ الٰہی سے یہ نعمت میسر آ گئی اس کو پھر کسی نعمت کے نہ ہونے کا کوئی غم نہیں ہونا چاہیے، اور جس کسی کو شامتِ اعمال سے یہ نعمت نہیں مل سکی اس کو ساری دنیا کی نعمتوں کے مل جانے پر بھی کوئی خوشی نہ ہونی چاہیے، پھر یہ نعمت بعض بندوں کو شروع اور بدءِ شعور ہی سے حاصل ہو جاتی ہے اور بعض کو عقل وشعور آ جانے اور کسی باطل عقیدہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد اس سے بیزار و علاحدہ کر کے عطا فرمائی جاتی ہے، صحابۂ کرامؓ کی اکثریت کا تعلق اس دوسری قسم ہی سے تھا۔

جہاں پیدائشی طور پر مسلمان ہو جانا یعنی دین حق سے وابستہ ہو جانا اللہ تعالیٰ کا کرم پر کرم اور بندوں کی سہولت کا سبب ہے وہیں پر زندگی کے کسی بھی مرحلے میں اپنے خالق و مالک کی طرف دھیان کا ہو جانا اور حق بندگی ادا کرنے اور فریضۂ وفاداری پورا کرنے پر دل کا مائل ہو جانا بھی بڑی سعادت وقدردانی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شکرِ نعمت کی اور سچائی کا اظہار کرتے رہنے اور اس کی ادائیگی سے اپنے عجز وقصور کا اعتراف کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللّٰھم لا نحصی ثناء اعلیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دین حق اور مذہبِ اسلام کی جس وقت بھی توفیق ہو جائے اللہ کا بڑا اکرم اور اس کی عظیم نعمت ہے، بندہ کو اس پر ہمیشہ بارگاہِ ایزدی میں احسان شناس وشکر گذار رہنا چاہیے، لیکن غیر مسلم گھروں میں پیدا ہو کر ان میں پل بڑھ کر پھر اسلام میں داخل اور دینِ حق میں شامل ہونا آسان کام نہیں ہے بہت بڑا مجاہدہ اور صبر آزما کام ہے، جو

لوگ تبدیلی مذہب کی اس پُرخطر وادی اور خاردار جھاڑی سے گذر کر آتے ہیں کچھ انہیں ہی کے دل جانتے ہیں کہ یہ کیسا راستہ ہے، پیدائشی مسلمان اگر ان نومسلموں کی داستانِ غم اور بیانِ حسرت والم سن لیں ـــــــ جو وہ عاشقانِ خدا اور مجاہدانِ راہِ حق مزے لے لے کر سناتے ہیں ـــــــ تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں، ان مجاہدوں سے گذرنے کا تصور تو دور کی بات سننے کی تاب بھی نہیں لا سکتے، مگر افسوس! کہ آج ہم اللہ تعالیٰ کے اس عظیم کرم کے ـــــــ جو اس نے ہمارے ضعفِ حال پر رحم فرماتے ہوئے ہم پر فرما دیا ـــــــ کہ مسلم گھرانوں میں پیدا کر کے بنا کسی مجاہدہ و آزمائش کے دینِ حق اور نعمتِ ایمان و اسلام سے سرفراز فرما دیا، بالکل قدر نہیں کر رہے ہیں حد یہ ہے کہ اسے نعمت مان کر اس کا شکر ادا کرتے رہنے کی بھی توفیق نہیں ہو رہی ہے۔ اللہ پاک ہم کو اس کا احساس نصیب کرے۔ آمین

مذاہب کے درمیان خالی الذہن ہو کر موازنہ کرنا اور دیانت وانصاف کا چراغ لے کر ان میں سے حق کو منتخب کرنا، پھر جرأت وہمت سے کام لے کر ضمیر کے فیصلے کو علی الاعلان ظاہر کر دینا کوئی کھیل تماشہ اور آسان کام نہیں ہے، بڑی بڑی شخصیتیں حق کے احقاق کے بعد بھی اظہار سے عاجز ہو کر نامرادو ناکام ہی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ حالانکہ وہ علم وعقل کے اعتبار سے دنیا کی گنی چنی ہستیوں میں شمار ہوتے تھے، خود ہمارے ملک کے عظیم اسکالر، دستورِ ہند کے معمار اور دلتوں کے مسیحا مسٹر امبیڈکر نے اپنے پیدائشی مذہب کو اس کی ناانصافیوں اور نابرابریوں سے عاجز ہو کر جب ترک کر دیا اور بانگِ دہل دیگر مذاہب کے دعاۃ کو اپنا اپنا مذہب ان کے سامنے پیش کرنے کی دعوت دی، بہت سے آسمانی وزمینی مذاہب ان کے سامنے رکھے گئے، اسلام بھی مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ جیسی علمی وعبقری شخصیت نے خود مل کر ان کے سامنے پیش کیا، مگر ان کی نظر وفکر نے حق کی راہ نمائی نہیں کی یا پھر ان کا ضمیر اظہارِ حق کی جرأت نہ کر سکا، جو بھی ہوا ہو بہر حال وہ نعمتِ اسلام سے مشرف نہ ہو سکے اور مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ط کا مصداق ہو گئے۔

خود عہدِ رسالت میں بھی حق کے احقاق کے بعد اس کا تسلیم و اظہار کتنا مشکل کام تھا اور جن لوگوں کو فضلِ الٰہی سے اس کی توفیق مل گئی ان پر کیا بیتی اس کی ایک جھلک صحابیِٔ رسول حضرت مقداد بن اسودؓ کے اس بیان میں دیکھی جاسکتی ہے جو انہوں نے ایک غیر صحابی کی زبان سے ان کی صحابیت پر فخر اور خود کے صحابی نہ بن سکنے پر افسوس کو سن کر ارشاد فرمایا تھا:

''تم لوگوں کو چاہیے کہ ایسی فضول تمنا اور بے مطلب حسرت کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسے گھر میں پیدا کیا ہے جہاں آنکھ کھولنے کے بعد تم نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی رب نہیں سنا، دین اسلام کے علاوہ کوئی دین نہیں معلوم ہوا، اس کی برکت سے تمہیں اللہ تعالیٰ کو معبودِ برحق ماننے اور اپنے نبی کے دین کو سچا یقین کرنے کے لئے کسی آزمائش میں پڑنا نہیں پڑا، اور اللہ تعالیٰ نے ہر فتنہ سے تم کو بچالیا۔ سنو! نبی کریم ﷺ ایک ایسی بدترین قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے کہ کوئی نبی اس سے بدترین قوم کی جانب مبعوث نہیں کیے گئے، وہ لوگ بت پرستی سے بہتر کوئی دین نہیں سمجھتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی پر قرآن مجید نازل فرمایا تو قرآن نے جہاں حق و باطل میں تفریق کردی وہیں خاندانوں کو بھی ایمان لانے اور نہ لانے والوں میں بانٹ دیا، اب ایک باپ ایمان لاتا اور اپنے بیٹے کو بے ایمان دیکھتا، کوئی بیٹا مومن ہوتا اور اپنے باپ کو کفر پر دیکھتا، کوئی بھائی مسلمان ہوتا اور اپنے بھائی کو شرک پر پاتا تو اس کا دل ان کی اس محرومی پر بھر آتا اور اسے یہ ڈر ستاتا رہتا کہ اگر یہ ایمان لائے بغیر ہی مرجائے تو سیدھے جہنم میں جائے گا، پس اس زمانہ میں ہماری صورتحال یہ تھی کہ ہم اپنے عزیزوں اور محبوبوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے بجائے غمزدہ ہوتے، ہمارے دل دُکھتے، ہم یہ جانتے ہوئے کہ ہمارا بیٹا یا باپ یا ماں یا بھائی ایمان نہ لاکر جہنمی بن رہا ہے ہم کیسے سکون و سرور سے رہ سکتے تھے۔ ہمارے دل پکار اٹھتے: رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ''

(تفسیر القرآن العظیم: ۳/ ۳۱۸)

حاصل یہ ہے کہ آج ہم مسلمان بے مشقت و مجاہدہ ایمان و اسلام کی نعمت مل جانے کی

وجہ سے اس کی قدر نہیں پہچان رہے ہیں، نہ کبھی یہ سوچنے کی توفیق ہو رہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضلِ خاص نہ ہوتا وہ ہمیں حق کو پہچان کر اختیار کرنے اور اختیار کرنے کے دشوار گذار راستوں سے گذرنے کی آزمائش میں ڈال دیتا تو نہ معلوم ہم میں سے کتنے ایسے ہوتے جو یا تو حق ہی کو نہ پہچان پاتے یا پہچان بھی لیتے تو اسے اختیار کرنے کی دشوار گذاریوں اور قربانیوں کی تاب نہ لا سک کر ایمان ہی سے محروم رہتے، اللہ اکبر! مالی دولت، جائیداد، جاگیر اور کاروبار ایک طرف رہنے دیجئے کہ وہ پھر بھی حاصل ہو سکتے ہیں مگر ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بھائیوں کی الفت، بہنوں کا پیار، بیوی کا سہارا، بچوں کی محبت، خاندان کی قوت اور دوستوں کی انسیت یہ وہ دولتیں ہیں جو اگر چھن جائیں تو آدمی اُن کا متبادل نہیں پا سکتا۔ پھر بلوغ اور بدءِ شعور کے بعد اسلام میں داخل ہونے والوں کو کیا ان ساری نعمتوں سے محروم ہونا نہیں پڑتا؟ آج بھی کسی غیر مسلم کا اسلام کو اختیار کر لینا میٹھا لڈو نہیں کڑوا گھونٹ ہے، ذرا ان نومسلموں کی آپ بیتی پڑھئے، حالات سنئے اور عبرت حاصل کیجئے، تاکہ ہمیں بھی نعمتِ اسلام کی قدر و قیمت کا کچھ پتہ چل سکے۔

(اداریہ نومبر ۱۲ء)

وقف بورڈ سے ائمہ وموذنین کو تنخواہوں کی ادائیگی کا مسئلہ

اہل علم کے غور وفکر کے لئے چند معروضات

آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے ضلع پرکاشم سے تعلق رکھنے والے شیخ حسین پیراں، شیخ محبوب باشا اور شیخ قادر باشا کی جانب سے داخل کردہ درخواست کے جواب میں ریاستی وقف بورڈ کو ہدایت دی ہے کہ وہ آج سے بیس سال قبل یعنی یکم ڈسمبر ۹۳ء کو سپریم کورٹ سے جارہ کردہ ہدایت کی روشنی میں ائمہ وموذنین کی تنخواہوں کے وقف بورڈ سے اجراء کو یقینی بنائے اور اس کے لئے اندرون چار ماہ ضروری کارروائی تکمیل کرلی جائے۔ وقف بورڈ نے اس سلسلہ میں اب تک کیا کاروائی کی ہے "منصف نیوز بیورو" کے مطابق درج ذیل ہے۔

مساجد کے امام وموذنوں کو ماہانہ تنخواہیں ادا کرنے سپریم کورٹ کے 20 سال قبل کے احکام کو روبہ عمل لانے آندھرا پردیش ہائیکورٹ کی ہدایت پر وقف بورڈ، درج رجسٹر اوقاف مساجد کی نشاندہی میں مصروف ہے۔ چیف منسٹر این کرن کمار ریڈی بھی مساجد کے اماموں اور موذنوں کو سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے احکامات کی روشنی میں تنخواہوں کی ادائیگی کے مسئلہ کا مثبت حل نکالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ چند دن قبل چیف منسٹر این کرن کمار ریڈی نے صدرنشین وقف بورڈ سید شاہ افضل بیابانی کو مدعو کرتے ہوئے اماموں وموذنوں کی تنخواہوں کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا تھا، صدرنشین نے چیف منسٹر کو بتایا کہ ریاست میں ۴ر ہزار سے زائد مساجد درج رجسٹر ہیں جن کے امام وموذن کو اگر اقل ترین تنخواہ ادا کی جائے گی تو ماہانہ ۴ کروڑ سے زائد رقم کی ضرورت ہوگی اور وقف بورڈ کے پاس اتنی آمدنی نہیں کہ وہ ماہانہ ۴ر کروڑ روپے تنخواہیں ادا کرسکے۔ بتایا گیا ہے کہ چیف منسٹر نے ریاست میں درج رجسٹر اوقاف مساجد اور امام وموذنوں کی تعداد اور ان کی تنخواہوں کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ پیش کرنے صدرنشین وقف بورڈ کو ہدایت دی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ موذن کو کم سے کم ۳ تا ۴ ہزار اور امام کو

۲ تا ۸ر ہزار روپے ماہانہ تنخواہیں دینے کی تجویز ہے۔ ریاستی ہائی کورٹ نے بھی اس سلسلہ میں اندرون چار ماہ رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت دی ہے۔ وقف بورڈ ذرائع نے بتایا کہ صرف درج رجسٹر وقف مساجد کے ہی اماموں اور موذنوں کو ماہانہ تنخواہیں ادا کرنے سے متعلق سروے کیا جارہا ہے۔ جو مساجد درج رجسٹر وقف نہیں ہیں انہیں اس فہرست میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ تاہم یہ پوچھے جانے پر کہ جو مساجد درج رجسٹر وقف نہیں ہیں کیا انہیں اب درج رجسٹر وقف کیا جاسکتا ہے؟ وقف بورڈ ذرائع نے بتایا کہ ان مساجد کو جلد از جلد درج رجسٹر وقف کرادیا جائے تو بہتر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وقف بورڈ کو کئی ایسی درخواستیں وصول ہورہی ہیں جن میں اماموں اور موذنوں کو حکومت کی جانب سے ماہانہ تنخواہیں ادا کئے جانے کی تجویز پر اعتراضات کئے جارہے ہیں اور یہ سوال کیا جارہا ہے کہ آیا اماموں اور موذنوں کو تنخواہیں ادا کرنے کے بعد مساجد کے امور میں سرکاری مداخلت کی جائے گی اور اماموں اور موذنوں کے تبادلے بھی عمل میں آئیں گے؟ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ امام وموذن سرکاری تنخواہیں حاصل کرنے کے بعد کمیٹیوں کی پرواہ نہیں کریں گے۔ اس طرح کے کئی اعتراضات کئے جارہے ہیں لیکن اعتراضات کرنے والے یہ نہیں سوچ رہے ہیں کہ امام وموذن کو اگر اچھی تنخواہ ملنے پر وہ خوشحال نہیں تو کم از کم اپنے اور اپنے ارکان کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے زندگی گذار سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں امام وموذن کو اچھی تنخواہ کیلئے انتظامی کمیٹیوں کو ہر جمعہ چندہ وصول کرنا پڑتا ہے اور بڑی مشکل سے امام وموذن کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں، چند مساجد ہی ایسی ہیں جہاں مسجد کی آمدنی سے امام موذن کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں، سرکاری تنخواہ حاصل کرنے والے امام وموذن کیلئے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اب تو سپریم کورٹ کا اس سلسلہ میں فیصلہ ہے جس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے ریاستی حکومت خود بھی اماموں کو تنخواہ دینا چاہتی ہے تو وہ قف بورڈ کو سالانہ گرانٹ جاری کرے گی اور وقف بورڈ اس گرانٹ سے اماموں اور موذنوں کو تنخواہیں ادا کرے گا۔ بہرحال اس سلسلہ میں حکومت اور وقف بورڈ کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کو روبہ عمل لانے کیلئے ریاستی ہائیکورٹ میں اپنا جواب داخل کرنا ہے۔ توقع ہے کہ ۴ر ماہ بعد یہ مسئلہ حل کرلیا جائے گا کیونکہ چیف منسٹر بھی اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

(روزنامہ منصف حیدرآباد ۲۶ر ڈسمبر ۱۲ء)

مذکورہ بالا نیوز رپورٹ میں چند باتیں قابل غور ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے اس سلسلہ میں بیس سال قبل ہدایت جاری کی تھی بیس سال سے اس میں کوئی پیش رفت نہیں کی گئی، بیس سال بعد ائمہ وموذنین کے ہمدردوں کو ان کی خوشحالی نہیں تو کم از کم ضروریات زندگی پورے ہونے کا خیال اچانک کیوں پیدا ہوگیا؟

دوسری بات چیف منسٹر صاحب کو اس وقت اس موضوع سے خصوصی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی کہ وقف بورڈ کے چیرمین کو طلب کر کے ان کی مشکلات معلوم کیں اور ماہانہ چار کروڑ کا بجٹ منظور کرنے پر آمادہ ہو گئے، چیف منسٹر کی اس دلچسپی کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں وہ ان کی موجودہ سیاسی پوزیشن اور پارٹی بحران کے تناظر میں بآسانی معلوم کیئے جاسکتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جولوگ آج یہ کہہ رہے ہیں کہ سپریم کورٹ کی ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی ان سے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا سپریم کورٹ کی تمام ہدایات کیلیۓ حکومت کی ایسی ہی دلچسپی ہے؟ اور اگر سپریم کورٹ کی ہدایت ایسی ہی سوپر پاور ہے ـــــ اور ہونا بھی چاہیۓ ـــــ تو بیس سال سے کورٹ کا یہ احترام سرد خانے میں کیوں ڈالدیا گیا تھا؟ کیا ہائی کورٹ کی تازہ وارننگ سے قبل وقف بورڈ کو سپریم کورٹ کی ہدایت کا علم ہی نہ ہوا تھا؟

چوتھی بات یہ ہے کہ وقف بورڈ چار ماہ کی مہلت کے اختتام پر اگر ائمہ کو تنخواہیں جاری کرنا شروع کر دیتا ہے، تب بھی یہ تنخواہیں صرف وقف بورڈ میں درج رجسٹر ائمہ و مؤذنین کیلیۓ جاری ہوں گی تمام ائمہ و موذنین کے لئے نہیں، نیز یہ تنخواہیں وقف بورڈ اوقاف کی آمدنی سے نہیں دے گا حکومت کی منظورہ گرانٹ سے دے گا، کیوں کہ وقف بورڈ ماہانہ چار کروڑ کے مزید مصارف بڑھانے کا متحمل نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ تنخواہ سرکار سے ملے گی وقف بورڈ سے نہیں، ایسی صورت میں ایک طبقے کو جو خطرات لاحق ہیں ظاہر ہے کہ وہ حق بجانب ہیں نہ کہ لائق تنقید! جہاں تک کورٹ کے احکامات کا معاملہ ہے تو اس پر کوئی اشکال نہیں، اسلیۓ کہ کورٹ نے تو عرضی پیش کرنے والوں کی فریاد سننے اور دادرسی کرنے کا اپنا فریضہ ادا کیا ہے، خواہ وہ بیس سال قبل کا سپریم کورٹ کا حکم ہو یا زیر بحث اسٹیٹ ہائی کورٹ کی ہدایت ہو! گفتگو عرضی گذاروں سے ہے کہ آیا انہوں نے مسئلے کو اٹھانے سے قبل درپیش خطرات و مسائل کا تجزیہ اور ہمہ پہلو جائزہ کرلیا یا نہیں؟ مثال کے طور پر چند خطرات درج ذیل کیئے جاتے ہیں۔

● سب سے پہلا خطرہ تو ائمہ وخطباء کو حاصل احقاق حق کی آزادی کے ختم ہو جانے کا ہے، اسلئے کہ وقف بورڈ تو ان کی تنخواہوں کا بوجھ اٹھانے کے موقف میں نہیں ہے، چیرمین صاحب نے چیف منسٹر صاحب کو صاف بتا دیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مطلب حکومت سے فنڈ طلب کرنا ہے، جب یہ تنخواہیں حکومت کے فنڈ سے ادا کی جائیں گی تو آج نہ سہی آئندہ کبھی بھی ائمہ وموذنین کی حیثیت ملازمین سرکاری ہو جائے گی، اس کے دوررس نتائج کا اندازہ عالمی وملکی حالات پر نظر رکھنے والوں کیلئے کچھ مشکل نہیں۔

● امامت وموذنی خالص اسلامی فرائض ہیں، جن کا تعلق اصلاً مسلمانوں سے ہے، جہاں اسلامی حکومت ہوتی ہے وہاں تو مسلمانوں کا امیر ان شعائر کی حفاظت اور حفاظت کرنے والوں کی کفالت کا خود ذمہ دار ہوتا ہے، جب سے ہندوستان ایک جمہوریہ قرار پایا اور اس کی اسلامی شناخت ختم ہوگئی تب سے مذہبی خدمات کے شعبے حکومت کے ذمے نہ رہے، اس وقت سے ہندوستان کے مسلمان خالص مذہبی خدمات کو اپنا فریضہ سمجھ کر خود ہی ادا کرتے آرہے ہیں، مدارس، مساجد، اور دینی ودعوتی مراکز یہ سب ملی نظام اور شرعی احکام کے تحت مسلمان خود سنبھال رہے ہیں، اور انشاء اللہ سنبھالتے رہیں گے، ان خدمات میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے کمی نہیں، اور ان خدمات کے معیار میں بھی نسبتاً ترقی ہی ہے زوال نہیں، اگر چیکہ سست رفتار سہی، اس کے برخلاف اکادکا ذمہ داری جو ضمناً یا کسی وجہ سے حکومت کے حوالہ ہوگئی، — مثلاً دائرۃ المعارف العثمانیہ — تو اسکی اور اسمیں کام کرنے والوں کی حکومت نے جو گت بنا کے چھوڑی ہے وہ جاننے والوں سے مخفی نہیں، اسلئے زیر بحث اسکیم سے یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں جاریہ نظام بھی معرض خطر میں نہ پڑ جائے۔

● سابق میں مدارسِ اسلامیہ کو سرکاریانے کیلئے جو کوششیں ہوئی ہیں دور اندیش علماء وقائدین نے تنگ نظری کے طعنوں کے باوجود اس کی بھرپور مخالفت کی تھی، اس مخالفت کے باوجود بعض لوگوں نے اجتماعی یا انفرادی طور پر ان کوششوں کو مخلصانہ کوشش اور اپنا قانونی حق

قرار دے کر قبول کرلیا تھا تو ان کا جو حشر ہوا وہ ہمارے سامنے ہے، آج ان کی توبہ کا دروازہ (رجوع) بھی بند ہو چکا ہے، اس بری طرح پھنسے ہیں کہ اس سرکاری لقمے کو نہ نگلے بن رہی ہے نہ اُگلے، ان کا نظام ہی قابلِ افسوس حد تک معطل ہو کر رہ گیا ہے، اسلئے خطرہ ہے کہ کہیں اس اسکیم کا انجام بھی اسی شکل میں سامنے نہ آ جائے۔

● مذہبی خدمات کے سلسلہ میں سرکاری کے بجائے عوامی سرپرستی کا جو نظام چل رہا ہے اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ مسلمان دین اور اس کی سرگرمیوں سے جڑے ہوئے ہیں، ایک پنکچر جوڑنے والا بے نمازی مسلمان بھی مسجد کے نام پر پانچ روپئے چندہ دیتا ہے اور اس کا رشتہ خانۂ خدا سے کسی طرح جڑا ہوا ہے، اس بہانے مسجد کی جانب سے ہر ماہ کوئی اس سے ملتا ہے، اس طرح ذمہ داریوں کا احساس غیر شعوری طور پر ہی سہی تازہ ہوتا رہتا ہے، بے دینی بلکہ دین بیزاری کے موجودہ ماحول میں دین کے ساتھ عام مسلمانوں کے اس معمولی سے تعلق کو بھی معمولی نہ سمجھنا چاہیے، سرکاری تنخواہیں اس رشتے کو ختم کرنے میں موثر رول ادا کریں گی۔

● دیانت و امانت زوال پذیر ہے، ہوا و ہوس سے کوئی محفوظ نہیں، خدام دین بھی اس زوال سے بہر حال متاثر ہیں، ہوس کی اس ریل پیل میں ان کے خدماتِ دینیہ سے معمولی وظیفوں پر جڑے رہنے میں جہاں ان کے جذبۂ خدمت کو دخل ہے وہیں معاشی ضرورت کا بھی اثر ہے، اگر ان کی ضرورت کسی ادارے سے پوری ہو جاتی ہے تو مساجد میں پابندیٔ خدمات کا وہی حشر ہوگا جو سرکاری اسکولوں میں تعلیم و تربیت کے معیار کا نظر آ رہا ہے، مسجد انتظامیہ تنخواہ کے حوالے سے انتظامی گرفت مضبوط رکھتی ہے، زیر بحث صورت میں ائمہ و موذنین کسی کو جوابدہ نہ ہوں گے، مدارس میں ایسا ہو چکا ہے، پہلے تنخواہ ناظم مدرسہ کے توسط سے دی جاتی تھی تو ناظم صاحب دو استاذوں کے نام پر سرکار سے تنخواہ اٹھا کر چار میں تقسیم کر دیا کرتے تھے، ان استادوں نے شکایت درج کرائی تو ان کے اکاونٹ کھلوا کر راست

دی جانے لگی، پھر جب تنخواہوں کے لئے ناظم کے محتاج نہ رہے تو مدرسہ کے کسی انتظامی معاملے میں ناظم کی پرواہ نہ رہی، نتیجۃً مدرسہ کا نظام سرکاری اسکولوں کے نظام سے بدتر ہوگیا۔

● اس کے علاوہ بھی آگے چل کر کئی ایک مسائل درپیش ہوں گے، مثلاً ائمہ ومؤذنین کی پابندیٔ وقت کا نگران کون ہوگا، اوراس سلسلہ میں وہ کس کے آگے مسئول ہوں گے؟ تنخواہ وقف بورڈ سے حاصل کریں گے تو مسجد کی کمیٹی کی حیثیت کیا رہے گی؟ مسجد کمیٹیوں کے ذریعہ جاری ہوگی تو حساب وکتاب کے حوالہ سے کمیٹی وعملہ مسجد کے درمیان شکایات پھر عدالت بازی، یونین سازی جیسے اقدامات بھی پیش آسکتے ہیں، جو خدام دین کے کردار پر بدنما داغ بن کر ظاہر ہوں گے، (یہ محض نکتہ آفرینی نہیں ہے مدرسہ بورڈ میں یہ سب ہوچکا ہے) ائمہ ومؤذنین کے تقرر وتعطل کا حق کس کو ہوگا اور کس بنیاد پر ہوگا؟ تنخواہوں کی عدم ادائیگی یا تاخیر کی صورت میں ــــــ جیسا کہ سرکاری محکمات میں آئے دن ہوتا رہتا ہے ــــــ ائمہ ومؤذنین کس سے مطالبہ کریں گے؟ یہ خدمات عارضی اور یومیہ مزدوری سمجھی جائے گی یا مستقل ملازمت؟ عارضی کی صورت میں حساب کتاب کس کے ذمہ ہوگا اور مستقل کی صورت میں چھٹیوں کے مسائل اور پینشن کا مطالبہ کیا مسلّم ہوگا؟ وغیرہ بیسیوں مسائل سے متعلق اس اسکیم میں اب تک کوئی ضابطۂ عمل واضح نہ ہوسکا۔

● وقف بورڈ ایک قومی ادارہ ہے جس پر نظر رکھنا اور اس کی شرعی رہنمائی کرنا رہبران اسلام کی ذمہ داری ہے، نیز حکومت بھی عوامی خدمت گذار ہے اس کی بدعنوانیوں کی نشاندہی تمام عوام کی طرح ائمہ وعلماء کا بھی حق ہے، سرکاری امداد سے تنخواہیں حاصل کرنے والے ائمہ وعلماء حق کی خاطر اپنے محسنوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت باقی رکھ سکیں گے یا نہیں؟

● فی الحال محراب ومنبر سے صرف مذہبی واسلامی پیغام نشر ہوتے ہیں، سیاسی ہنگاموں کے لئے خانۂ خدا میں کوئی گنجائش نہیں ہے، سرکاری امداد سے تنخواہیں حاصل کرنے کے بعد بھی محراب ومنبر کا یہ تقدس برقرار رہ سکے گا یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مختصر یہ ہے کہ ائمہ و موذنین کے جن ہمدردوں نے یہ مسئلہ اٹھایا اور عدالت تک پہونچایا اور عدلیہ کی جانب سے انہیں حمایت حاصل بھی ہوگئی ـــــ اگر چہ کہ ۱۹۹۳ء سے تاہنوز عملی کامیابی اس میں نہ مل سکی ـــــ ان حضرات نے ائمہ کرام کی خوشحالی بھی نہیں صرف ضروریاتِ زندگی فراہم ہوجانے کی اہمیت پر تو نظر فرمائی ہے مگر اس اقدام کے نتیجے میں ملنے والے غیر یقینی منافع کے بمقابلہ یقینی مفاسد پر غالباً نظر نہیں کی یا انہیں قابلِ اعتناء نہ سمجھا، اور اب بھی سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں، اسلئے ہم امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرکزِ دعوت اور مقام امامت کے وارثین وجانشین خوش نصیبوں سے ادباً گذارش کرتے ہیں کہ وہ کم از کم اس اسکیم کے حصے دار بننے سے قبل ہزار باران خطرات وخدشات پر نظر فرمائیں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ اس منصبِ جلیلہ پر جہاں ہم ان کی ٹوٹی پھوٹی نیابت کو بھی باعثِ صد افتخار وعزت سمجھتے ہیں، وہیں سادگی پسندی ومعاشی تنگی میں بھی ان کے ساتھ اس ادنیٰ مشابہت کو ـــــ جو ان کے مقابلے میں سمندر سے قطرہ کی نسبت بھی نہیں رکھتی ـــــ سینکڑوں فراخیوں اور خوشحالیوں پر ترجیح دینے کی ہمت پیدا کریں۔

اس سب کے باوجود ہم خدام دین کے لئے وظائف ومشاہرات میں اضافہ واستحکام کی ضرورت کے مخالف نہیں ہیں، جبکہ وہ اوقافی آمدنیوں کے ذریعہ (احکام اوقاف ـــــ کے مطابق) ہو یا کمیٹیوں کی حسنِ تدبیر اور حمیتِ مذہبی کے ذریعے ہو۔ مسلمان الحمدللہ مذہب کے معاملے میں اب بھی غیرت مند ہیں، درج رجسٹر ائمہ وموذنین کیلئے آندھرا پردیش وقف بورڈ بے حساب املاک واوقاف رکھتے ہوئے بھی ماہانہ چار کروڑ کے بجٹ کو ناقابلِ تحمل قرار دے رہا ہے، جبکہ آندھرا پردیش کے مسلمان درج شدہ اور غیر درج شدہ تمام مساجد کے ائمہ وموذنین، خدام، بجلی پانی، جانمازوں، چاندنیوں اور تعمیر وتوسیع کے لئے کم از کم آٹھ کروڑ ماہانہ صرف کر رہے ہیں، اگر مسجد کمیٹیاں وصولی میں اضافہ کریں اور کم ضروری خرچوں میں تخفیف کریں تو وقف بورڈ جس نئے اسکیل کی بات کر رہا ہے ان شاء اللہ اس سے زیادہ

نہیں تو اتنی تنخواہیں تو مسجد کمیٹیاں عوامی تعاون سے خود دے سکتی ہیں۔ یہ عاجز بتیس سال سے امامت کی خدمت کا شرف رکھتا ہے، کمیٹیوں اور ان کے طرزِ عمل کو اچھی طرح جانتا ہے خدامِ مسجد کے وظائف میں کوتاہی کی چند وجوہات بھی آخر میں اپنے تجربات سے ذکر کرتا ہوں۔

● مسجدوں کی کمیٹی میں شامل ہونے والے عام طور سے عہدہ پسند لوگ ہوتے ہیں جنہیں اقتدار اور دارو گیر سے زیادہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی، بہت رعب سے آتے ہیں اور وقتاً فوقتاً خدامِ مسجد کو طلب کر کے مواخذہ و مطالبہ کرتے رہتے ہیں، انہیں ان بے چاروں کے دکھ درد سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

● یا پھر تعمیر و توسیع مسجد کے جذبے سے آتے ہیں، وہ آمدنی کی پائی پائی سے بس مسجد بنانے اور سجانے کا منصوبہ بناتے رہتے ہیں، امام و موذن کے مشاہرے وظیفے کا کوئی خیال دھیان نہیں ہوتا۔

● اکثر کمیٹیوں میں ہمدرد و مخیر لوگ آگے نہیں بڑھتے، وہ ان جھگڑوں میں پڑنے سے بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ ماہانہ چندہ دیدیں نماز ادا کرلیں، گھر میں آرام سے رہیں، یہ لوگ شخصی طور پر امام و موذن کی کچھ نہ کچھ خدمت بھی کرتے رہتے ہیں مگر وہ موقتی ہوتی ہے۔

● کئی مساجد کی آمدنیاں اچھی خاصی ہیں مگر منتظمین کا دل ان آمدنیوں کو خدامِ مساجد پر خرچ کرنے میں بخیل ہوتا ہے، رسمی پروگراموں اور جلسوں کے نام پر سخاوت سے صرف کرتے رہتے ہیں، کئی مساجد کے بینک کھاتوں میں پیسہ پڑا ہوا ہے مگر امام و موذن کی تنخواہ اسی طرح جزوی چل رہی ہے۔

● اکثر مساجد میں تو دو ہی آدمیوں کا عملہ ہے، بڑی مساجد میں تین تا پانچ افراد کا عملہ ہوگا، اگر مسجد کمیٹیاں وصولی سرمایہ کا صحیح نظام بنائیں اور اس میں دلچسپی لینے کو اپنا قابلِ جوابدہی فرض سمجھیں تو اس عملے کی مناسب تنخواہوں کے لئے بقدرِ ضرورت سرمایہ انشاء اللہ

ضرور فراہم ہوسکتا ہے، بشرطیکہ احساس ذمہ داری ہو۔ ماشاء اللہ آج کل شہروں سے لے کر قصبوں تک کئی مساجد ایسی ہیں جن کی کمیٹیاں فرض شناس ہیں جس کی وجہ سے ان مسجدوں کے ائمہ وموذنین کے مشاہرات وقف بورڈ کے ممکنہ مشاہرات سے کہیں زیادہ ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ مسلم قوم اس معاملے میں اب بھی غیور ہے، ہمیں مذہبی معاملات میں کسی حکومت کے حوالے ہونے اور ان کے وعدوں پر اعتماد کر کے جاریہ خوددار اور باوقار نظام کو فیل کر لینے کی کوئی ضرورت نہیں، ایک دفعہ قوم ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے گی تو دوبارہ ان میں اس کا شعور پیدا کرنے اور غیرتِ قومی بیدار کرنے صدیوں کا وقت مطلوب ہوگا جو کارے دارد ہے، اسلئے بہتر یہ ہے کہ مسجد کمیٹیاں اپنی سہولت وراحت کیلئے اس اسکیم کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے بجائے اپنی غیرت کو آواز دیں، ضمیر کو جھنجھوڑیں اور خدامِ مسجد کو خود کفیل بنانے میں اپنا فریضہ ادا کریں، آخر جس گرانی کی وجہ سے آپ کا گھر بیس پچیس ہزار روپے میں بھی مشکل سے چل رہا ہے اسی گرانی کا امام بھی تو شکار ہے، وہ اسی دودھ سے اپنے بچوں کے لئے دودھ لیتا ہے، اسی تیلی سے تیل خریدتا ہے، سلینڈر کی قیمت اس کے لئے بھی بڑھ رہی ہے، ائمہ وموذنین کے لئے کوئی سبسیڈی تو نہیں ہے پھر وہ کس طرح تین چار ہزار میں گذر اوقات کرے گا؟

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

(اداریہ جنوری ۱۳ء)

رابطہ مدارسِ اسلامیہ عربیہ
پس منظر اور ضرورت

۶ ربیع الاول ۳۴ھ کو بعد نمازِ مغرب رابطہ مدارسِ اسلامیہ عربیہ کا ریاستی اجلاس زیر نگرانی وسر پرستی حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حیدرآباد میں منعقد ہوا، اس میں ریاستی صدر رابطہ اور مدیر ماہنامہ "اشرف الجرائد" مولانا محمد عبدالقوی صاحب زید مجدہٗ نے جو استقبالیہ پیش کیا تھا، اس میں رابطے کے قیام کی ضرورت اور پس منظر پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

علماء کرام! آپ کو علم ہے کہ ہمارے مرکزِ علم اور قبلۂ فکر دارالعلوم دیوبند نے آج سے ۱۹ رسال قبل مدارس اسلامیہ کے تئیں پیش آمدہ مخصوص احوال کے پس منظر میں ایک کل ہند نمائندہ اجلاس ۲۰ ر ۲۱ رمحرم ۱۴۱۵ھ دارالعلوم ہی کے مہمان خانہ میں اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمہ اللہ کی صدارت میں طلب کیا تھا، جس میں باتفاق رائے درج ذیل عناوین پر پانچ تجاویز پاس کی گئی تھیں۔

۱۔ نصابِ تعلیم ۲۔ طریقۂ تعلیم ۳۔ نظامِ تربیت ۴۔ متحدہ نظام ۵۔ مخالف مدارس پروپیگنڈہ کی مذمت

ان میں سے نمبر ۴۔ کے تحت کہا گیا تھا:

"مدارس اسلامیہ کا یہ نمائندہ اجتماع مدارس کے داخلی وخارجی مشکلات کے حل اور تعلیمی معیار کی بلندی کے لئے اس ضرورت کا شدت سے احساس کرتا ہے کہ دارالعلوم کی فکر سے وابستہ تمام مدارس کا ایک مربوط اور متحدہ نظام قائم ہو، جس کے ذریعہ متحدہ طور پر مشکلات کو دفع کرنے کی جدوجہد کی جاتی رہے" (رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۲۰)

مگر چونکہ یہ کام نزاکت کا حامل تھا اور اس کے لئے ایک قابل قبول لائحہ عمل مرتب ہونا وقت طلب کام تھا، اسلئے سردست یہ طئے کیا گیا:

"ابتدائی مرحلہ میں یہ اجتماع مناسب سمجھتا ہے کہ دارالعلوم میں ایک ایسا رابطہ کا دفتر قائم کیا جائے جو اپنے سے منتسب دینی اداروں سے تعلیمی رپورٹوں کے حصول کی جدوجہد کرے۔۔۔۔" (رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص:۲۱)

اس نمائندہ اجتماع نے یہ بھی طئے کیا تھا کہ "ملک کے تمام علاقوں کے مدارس پر مشتمل ایک کل ہند مدارس اسلامیہ عربیہ اجتماع بُلایا جائے، جس کی تعمیل میں ۲۰ تا ۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ کو پورے ملک کے ذمہ داران مدارس کا ایک سہ روزہ اجتماع منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے طول وعرض سے دو ہزار دو سو سے زائد مندوب ذمہ داران مدارس نے شرکت کی"۔

اس اجلاس کے فکر انگیز خطبۂ صدارت میں حضرت مولانا مرغوب الرحمن رحمہ اللہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس کے چند اقتباس پیش خدمت ہیں۔

مدارس کے قیام کے پس منظر اور غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

"مدارس دینیہ کے تاریخی پس منظر سے ان کے اغراض ومقاصد کی نشاندہی بھی ہوجاتی ہے یعنی دینی تعلیمات کے تحفظ، کتاب وسنت کی اشاعت اور مسلم معاشرہ کی حفاظت و اصلاح کیلئے یہ اسلامی گروکل تعمیر کئے گئے ہیں بالفاظِ دیگر علم وعرفان کی یہ چھاؤنیاں اس غرض سے قائم کی گئی ہیں کہ ان سے دین کے سچے مخلص خادم اور اسلام کے جانباز وجرأت مند سپاہی تیار کئے جائیں، جو اسلامی عقائد وشعائر اور دینی اخلاق وروایات کے داعی ونقیب بنیں اور باطل طاقتوں کی فتنہ سامانیوں سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کریں، اسی لئے ان مدارس کا نظام تعلیم وتربیت امام الہندؒ کی تحریک دعوت واصلاح کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور نصاب تعلیم خالص دینی رکھا گیا ہے اور ان کا مقصد تاسیس، نصب العین اور مطمح نظر دین

اور صرف دین ہے، اور وہ اسلامی تعلیمات کی تدریس وترویج کا اور دینی عقائد و مآثر کے احیاء کے لئے قائم کئے گئے ہیں"۔

(رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۲۵، ۲۶)

ان مدارس کے ارتباط واتحاد کی ضرورت پر اس طرح روشنی ڈالی:

"ہمارے مدارس دینیہ کے اکثر اساتذہ دارالعلوم دیوبند سے سلسلۂ استناد رکھنے کی بناء پر عملی طور پر دارالعلوم سے مربوط ہیں، ہمارا عہد اجتماعیت کا عہد ہے، آج سیاست، تجارت، ملازمت، صنعت وغیرہ سب شعبے تنظیم کے دائرے میں اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں اگر مدارس دینیہ بھی باہم مربوط ہو جائیں تو ان کا یہ باہمی رابطہ (ایک دوسرے سے) اخذ واستفادہ میں مفید ہوگا اور اس رابطہ سے تعاون وتناصر کی فضا ہموار ہوگی، (اگر) مدارس کے اساتذہ میں علمی افادہ واستفادہ کا ماحول بن جائے اور مدارس میں باہمی رقابت کی جگہ ایک دوسرے کی اعانت ونصرت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو مدارس کے علمی وانتظامی مسائل کے حل میں بڑی مدد ملے گی"۔

(رابطہ مدارسِ اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۲۸)

اس وقیع اور ملک گیر اجلاس کے موضوعات میں ایک موضوع "رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ" پر غور وخوض بھی تھا، اس موضوع کا تعارف کراتے ہوئے حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہٗ العالی نے یوں ارشاد فرمایا:

"مدارس اسلامیہ ملک کے گوشے گوشے میں دین کو باقی رکھنے اور اسے پھیلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر آج انہیں دہریت پسندوں اور اسلام دشمن عناصر کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑ رہا ہے، مغرب نواز، اسلامی تہذیب وثقافت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں، اس ماحول میں رہ کر دنیا کو دین سے روشناس کرانا اِنھیں دینی مدارس کا کام ہے، دہریت جس قدر آج کے دور میں پروان چڑھی اور جس طرح آج یورپ اسلام دشمنی پر آمادہ

ہے وہ روزروشن کی طرح عیاں ہے۔آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان اسلام مخالف عزائم کا منظم ہوکر مقابلہ کیا جائے ، انفرادی کام کے مقابلہ میں جماعتی کام میں برکت ونفع زیادہ ہوتا ہے، پھر باہمی رابطہ سے ایک دوسرے کوتقویت پہنچتی ہے۔انہیں مقاصد کے تحت رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے“۔

(رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص:۳۷)

ذیلی کمیٹی نے رابطہ کا جو خاکہ مرتب کر کے پیش کیا تھا اس کی تمہید اس طرح ہے:

”ایک مقصد کے تحت کام کرنے والے مختلف اداروں کے درمیان ربط وتعلق کی اہمیت محتاجِ دلیل نہیں ہے، خصوصاً دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج پر کام کرنے والے ادارے کہ ان کا نصب العین محض تعلیم نہیں بلکہ یہ تعلیم کے ساتھ اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی ہمہ جہت اصلاح کیلئے قائم کئے گئے ہیں، اور اسی لئے ماضی میں بھی یہ ادارے ایک دوسرے سے مربوط رہے ہیں۔البتہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے ابتدائی ایام میں اس ربط کے اظہار میں بڑے خطرات تھے، حکمراں انگریز، مسلم علماء کے ساتھ جو وحشت ناک سلوک کررہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس ربط کا اظہار نہ ہو۔اکابر میں ایسی عظیم المرتبت شخصیات موجود تھیں کہ ان کی سرپرستی ہر طرح کے اتحاد اور تعاون کی ضمانت تھی مگر اس کے باوجود کبھی سالانہ امتحان اور کبھی سالانہ اجتماع میں شرکت کے ذریعہ اس ربط کو مستحکم کیا جاتا تھا اور کبھی حساب وکتاب میں یکسانیت کے عمل کے لئے ایک دوسرے سے تعلق مضبوط کیا جاتا تھا، دارالعلوم کی قدیم روداروں سے ان حقائق کا یقین حاصل کیا جاسکتا ہے۔مگر اب صورتحال دونوں اعتبار سے بالکل دگرگوں ہے، اب ہمارے درمیان ایسی شخصیات نہیں ہیں کہ ان کے سایہ میں اتحاد کا یہ عمل خودبخود وجود میں آجائے اور اب اتحاد اور ربط کے اظہار میں بھی کسی طرح کا اندیشہ یا خطرہ نہیں ہے اور یہ کہ ربط واتحاد کی ضرورت اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔“

نمائندہ اجتماع مدارس اسلامیہ منعقدہ یکم و ۲ر جولائی ۱۹۹۴ء نے مدارس اسلامیہ عربیہ کے باہمی ربط کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے دار العلوم کو ذمہ دار بنایا تھا، چناں چہ مقررہ کمیٹی نے اس کے لئے ایک خاکہ تجویز کیا جن میں چند باتوں کی خصوصی رعایت رکھی گئی ہے۔

(۱) باہمی رابطہ کی یہ ضرورت اس طرح پوری کی جائے کہ کسی بھی ادارے کی خود مختاری متاثر نہ ہو۔

(۲) رابطہ کے استحکام کے جملہ امور باہمی مشورے سے انجام پائیں۔

(۳) سالانہ اجتماعات میں زیر بحث آنے والے بنیادی نقاط متعین ہوجائیں جو مدارس عربیہ کی ضرورت یا ان کے فرض منصبی سے متعلق ہیں"۔

(رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دار العلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۳۸،۳۹)

رابطے کے قیام کی اس تجویز کو اجلاس نے نہ صرف یہ کہ منظور کیا بلکہ اسی وقت اکثر ذمہ داران مدارس نے فارم فلپ کر کے دار العلوم کے ساتھ رشتۂ الحاق قائم کرلیا۔

مرکزی رابطے نے صوبائی رابطوں کے لئے جو دستور پاس کیا ہے اس کی روشنی میں ریاست سے مرکزی رابطہ سے ملحق شدہ مدارس کے ذمہ دار حضرات ہی مجلس عمومی کہلائیں گے، اور انہی میں سے اکیس ارکان عاملہ کا انتخاب ہوگا، ریاستی صدر کا انتخاب مرکزی عاملہ میں ہوتا ہے، نائب صدر و ناظم اعلیٰ ریاستی عاملہ میں سے ہی طئے پاتے ہیں، اور اس انتخاب کیلئے مرکزی رابطے سے کسی مبصر کا شریک رہنا ضروری ہے۔

(اداریہ فروری ۱۳ء)

دارالعلوم دیوبند میں تحفظ سنت کا مشاورتی اجلاس

۱۴ رفروری ۱۳ء کودارالعلوم دیوبند نے جامعہ کی عظیم الشان مسجد رشید میں ملک بھر سے تشریف لائے ہوئے علماء کرام کا مشاورتی اجلاس منعقد کیا، جس کی اطلاع اور دعوت کافی پہلے دیدی گئی تھی۔ راقم عاجز بھی ۱۲ رتاریخ کو ار بجے کی فلائٹ سے روانہ ہوکر ۱۰۔۳ کو دہلی پہونچا، حیدرآباد ایر پورٹ پر مولانا عبدالرؤف صاحب قاسمی (شیخ الحدیث جامعۃ الہدیٰ مرادآباد) سے ملاقات ہوگئی تھی جو حیدرآباد میں مجلس تحفظ ختم نبوت آندھراپردیش کی جانب سے منعقدہ دس روزہ جلسہائے سیرت میں بحیثیتِ مہمان مقرر تشریف لائے ہوئے تھے اور اسی فلائٹ سے واپس ہورہے تھے، ماشاءاللہ ان کی رفاقت علم افزاء اور بہتر رہی۔ دہلی ایر پورٹ پر مولانا اقبال صاحب قاسمی (سابق شیخ الحدیث جامعہ باقیات الصالحات ویلور) سے بھی ملاقات ہوگئی، مولانا موصوف دیوبند پہونچنے کے لئے کسی رفیق کے متلاشی تھے، مولانا علمی و تحقیقی مزاج کے آدمی ہیں، ان کی رفاقت بسا غنیمت تھی، انہیں ساتھ لیکر دیوبند کے لئے روانہ ہوگئے، نظام الدین مرکز میں ظہر وعصر ادا کرکے یہیں پر کھانے سے فارغ ہوئے، اس کے بعد مولانا عبدالرؤف صاحب مرادآباد کے لئے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے اور ہم لوگ دیوبند کے لئے بذریعہ کار! میرٹھ کے قریب ٹرافک مسدود رہی جسے وہاں کی اصطلاح میں جام لگنا کہتے ہیں۔ مغرب عشاء راستے میں ادا کرتے ہوئے دس بجے

دارالعلوم پہونچے، مہمان خانے کا روم نمبر ۱۵ ہمارے لئے تجویز تھا، اسی میں قیام کیا، علی الصباح برادر محترم مولانا مفتی عبدالمغنی صاحب بھی اسی کمرہ میں فروکش ہوئے۔ نماز فجر میں نے مسجدِ چھتہ میں ادا کی، نماز بعد حضرت قاری عثمان صاحب مدظلہ نے ناشتہ پر مدعو فرمالیا، حضرت نے اشرف الجرائد کی مکمل فائلوں کی فرمائش کی تھی وہ بھی دینا تھی، ناشتہ کے بعد تیاری کرکے مسجد رشید پہونچے، جہاں تحفظ سنت کا مشاورتی اجلاس تھا، اجلاس میں تلاوتِ کلام پاک اور نعت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ترانۂ دارالعلوم پیش کیا گیا، بعد ازاں مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہٗ نے خطبۂ صدارت پڑھا، جس میں اجلاس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالنے کے علاوہ مسئلہ تقلید کی حقیقت واہمیت کو بھی واضح کیا گیا تھا، اس مختصر مگر جامع خطبۂ صدارت کے بعد پروگرام کے مطابق اکابرِ دارالعلوم کے موضوعاتی خطابات تھے، دارالعلوم کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری، دارالعلوم کے مؤقر استاذ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری، مدیر ماہنامہ دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی، استاذ حدیث حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہم کے خطابات ہوئے، بعدازاں باہر سے آئے ہوئے مندوبین میں سے مولانا سید اشہد رشیدی (مرادآباد) حضرت مولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی (لکھنو) مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ممبئی، مفتی غیاث الدین رحمانی اور اس عاجز (حیدرآباد) نے اپنی آراء پیش کیں۔ صبح کی نشست حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کی دعا پر اختتام پذیر ہوگئی۔ ظہر سے تا مغرب وقفہ تھا ہم نے ظہر بعد حضرت مہتمم صاحب سے اور عصر بعد حضرت مفتی سعید احمد صاحب سے گلبرگہ کے احباب کے ساتھ ملاقات کرکے گلبرگہ میں ماہِ اپریل میں منعقد شدنی دوروزہ اجلاس تحفظ شریعت میں شرکت کے لئے ان حضرات کی خدمت میں درخواست پیش کی۔

بعد مغرب پروگرام کے مطابق دوسری نشست کا آغاز ہوا، تلاوتِ کلام پاک کے بعد حضرت مولانا حبیب احمد صاحب خلف الرشید حضرت قاری صدیق احمدؒ، بحرالعلوم حضرت

مولانا نعمت اللہ صاحب، مناظر اسلام علامہ طاہر گیاوی کے بیانات ہوئے، مولانا مفتی راشد صاحب اعظمی نے دارالعلوم میں قائم شعبۂ تحفظ سنت کا تعارف اور اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد اجلاس کی تجاویز پاس کی گئیں، اور اعلامیہ کا اجراء کیا گیا، اجراء تجاویز واعلامیہ کے بعد ملک بھر سے تشریف لائے مختلف علماء کو یکے بعد دیگرے اس کی تائید اور اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا، حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری نقشبندی، اور مولانا مفتی شوکت صاحب بستوی نے بہت سلیقے سے اجلاس کی کاروائی چلائی، طلبہ واساتذہ دارالعلوم نے مہمانانِ گرامی کی بھرپور خدمت کی اور قیام وطعام کی سہولت بہم پہنچائی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔ دعاء ہے کہ حق تعالیٰ ایک اہم مقصد کے حصول اور ایک خطرناک مفسدہ کے ازالہ کے لئے کی گئی اس سعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور منظور کردہ تجاویز کے باحسن وجوہ تکمیل پانے کے اسباب پیدا فرما کر اس کا نفع عام وتام فرمائے۔ آمین

تجاویز واعلامیہ کا متن درج ذیل ہے۔

تجاویز:

دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام، تحفظ سنت کے موضوع پر منعقد ہونے والا یہ اہم مشاورتی اجلاس پورے اعتماد کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ امتِ مسلمہ کے لئے راہِ ہدایت، اہل السنۃ والجماعۃ کا وہ راستہ ہے جسے حدیث شریف میں ما انا علیہ واصحابی کے جامع الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، حضراتِ ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کی بیان کردہ تفصیلات کی روشنی میں کتاب وسنت پر عمل کرنا اور ائمہ واسلاف کے راستے پر مضبوطی سے کاربند رہنا، جسے ہر دور میں امت کے سوادِ اعظم نے اختیار کیا اور جس کی نمائندگی پوری جامعیت کے ساتھ اس دور میں حضرات اکابر دیوبند کے ذریعہ ہوتی ہے۔

اس راہِ ہدایت سے امتِ مسلمہ کو منحرف کرنے کی جو ناروا کوششیں گذشتہ تقریباً ڈیڑھ صدی سے جاری ہیں، ان کا جھنڈا موجودہ دور میں جماعتِ غیر مقلدین نے اٹھا رکھا ہے، اور علماء سے امت کا رابطہ منقطع کرنے اور علماء پر اعتماد کمزور کرنے کی مسلسل محنت کے نتیجے میں مسلمانوں کا ایک طبقہ اس نئی فکر سے متاثر ہو رہا ہے، اس لئے علماء کرام اور مدارس اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اس فکری گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور بھرپور جدوجہد سے کام لیں۔

اس مقصد کے لئے یہ اجلاس درج ذیل اقدامات تجویز کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ حضرات علماء، اربابِ مدارس اور ملت کے تمام ذمہ دار حضرات ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے۔

(۱) بڑے مدارس طلبہ کو اس موضوع پر تیار کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے طرز پر محاضرات کا نظام قائم کریں اور جن میں تکمیلات اور منتہی جماعتوں کے طلبہ شریک ہوں۔

(۲) منتخب اساتذہ کرام کو اس موضوع پر تربیت دی جائے۔

(۳) بڑے مدارس اپنے یہاں ایسے مبلغین کا تقرر کریں جو اس موضوع پر بھرپور تیاری کے ساتھ کام کر سکیں۔

(۴) اس موضوع پر اساتذۂ مدارس، ائمۂ مساجد اور مقامی علماء کی تدریب کے لئے علاقائی سطح پر تربیتی کیمپ منعقد کئے جائیں۔

(۵) جو مسائل غیر مقلدین اٹھاتے ہیں ان کے بارے میں مختصر اور جامع ومدلل کتابچے تیار کرا کے عام کئے جائیں۔

(۶) مختلف شہروں میں ''مجلس تحفظِ شریعت'' کے نام سے کمیٹیاں قائم کی جائیں، جو غیر مقلدین اور دیگر فرق باطلہ کے تعاقب کا کام کریں۔

(۷) جو سادہ لوح عوام یا عصری تعلیم یافتہ لوگ غیر مقلدین سے متاثر ہوتے ہیں ان

کو، انفرادی محنت اور عمومی جلسوں کے ذریعہ صحیح فکر سے روشناس کرایا جائے۔

(۸) ائمہ مساجد حسبِ ضرورت اس موضوع پر گفتگو کریں اور ذمہ داران مساجد اس میں ان کا تعاون کریں۔

(۹) طلبہ کو احادیث یاد کرانے کا سلسلہ جاری کیا جائے اور اُن میں بھرپور مسلکی شعور پیدا کیا جائے۔

(۱۰) یہ اجلاس، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند سے اپیل کرتا ہے کہ وہ دارالعلوم میں سرگرمِ عمل شعبہ تحفظ سنت کے دائرہ کار کو وسعت دے تا کہ اس کے ذریعہ افراد سازی کا کام بڑے پیمانے پر کیا جا سکے۔

(۱۱) سعودی حکومت اور علماء ومشائخ کو صحیح صورتِ حال سے واقف کرانے کے لئے، دارالعلوم دیوبند کی قیادت میں موقر علماء کا ایک وفد وہاں کا دورہ کرے۔ اور اعلامیہ کے مطابق اجلاس کے اندیشوں اور جذبات سے حکومتِ سعودیہ کو واقف کرائے کہ غیر مقلدین، سعودی علماء ومشائخ کا نام لے کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں، وہاں سے حاصل شدہ وسائل کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اہل حق سے سعودی عرب کی حکومت اور علماء کو دور کرنے کے لئے غلط پروپیگنڈے کا سہارا لیتے ہیں، اور جالیات کے شعبۂ تبلیغ کا بھی غلط استعمال کرتے ہیں، اس طرح وہ سعودی حکومت کی بدنامی کا سبب بن رہے ہیں اور امت میں تفریق پیدا کر رہے ہیں، لہٰذا حکومتِ سعودیہ کو چاہیے کہ وہ راہِ اسلاف سے منحرف اس فرقے کی تائید وتقویت کے بجائے اس پر قدغن لگائے۔

اعلامیہ:

علمائے ہند کا یہ نمائندہ اجلاس ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اپنے اس اذعان و یقین کا اظہار ضروری سمجھتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت نجومِ ہدایت ہے، ان کی روایت تو حجت ہے ہی ان کی درایت بھی امت کے لئے نمونۂ عمل ہے، عہد صحابہؓ میں جن احکام ومسائل کے بارے میں اجماع ہو گیا ہے وہ دین میں حجت ہیں، ان سے انحراف

جائز نہیں۔ اور جن مسائل میں ان کی آراء مختلف رہی ہیں ہمارے نزدیک حق وصواب انھیں میں منحصر ہوگا، ان سے خروج درست نہیں، اسی طرح وہ مسائل جن پر ائمہ اربعہ: امام ابوحنیفہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمھم اللہ کا اتفاق ہے اب ان سے خروج بے دینی ہے۔

یہ اجلاس اس بات کا بھی اعلان ضروری سمجھتا ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء ومحدثین کی علمی ودینی خدمات اہل اسلام کا ایک عظیم سرمایہ ہے، جن پر مکمل اعتماد ہمارے لئے خیر و فلاح اور سعادت کا باعث ہے، علمائے ہند کے اس اجلاس کا یہ احساس ہے کہ معاندین اسلام، بالخصوص یورپ اور امریکہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے دائرہ حدود ونفوذ کو تنگ سے تنگ کرنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ تحریک چلارہے ہیں، ایسے پرآشوب وقت میں پورے عالم اسلام کو متحد ہوکر ان کی اس منفی جارحانہ تحریک کا مقابلہ کرنا چاہئے، لیکن جماعتِ غیر مقلدین نے نہ جانے کن تحفظات کے تحت ان کے مقابلے کے بجائے خود مسلمانوں کے خلاف چوطرفہ محاذ کھول رکھا ہے اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو بزعم خود دین سے خارج کرنے کی جدوجہد میں مبتلا ہیں، اور افسوس وحیرت تو اس بات پر ہے کہ سعودی حکومت ان غیر مقلدین کی ہر طرح سے ہم نوائی کررہی ہے، اور "وزارة الشئون الاسلامیة" کے شعبہ "توعیة الجالیات" نے مقلد مسلمانوں، بالخصوص احناف کے اکابر علماء کے خلاف مہم چلارکھی ہے، سعودی حکومت جو اتفاق بین المسلمین کی سب سے بڑی داعی ہے، اور ماضی میں اس سلسلہ میں اس نے قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں وہی آج افتراق بین المسلمین کا سبب بنی ہوئی ہے، اس کا یہ رویہ جہاں عام مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ہے وہیں خود سعودی حکومت کے لئے بھی اس کا انجام بہتر نہیں ہوگا۔

یہ اجلاس حکومت سعودی عرب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس سلسلہ پر روک لگائے اور اس کے لئے عملی اقدامات کرے، ورنہ امت کا سوادِ اعظم ہند وبیرون ہند میں سعودی حکومت کے اس طرزِ عمل پر اپنی بے چینی کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگا۔

دو گھنٹے حکیم جسم وجاں کی صحبت میں

دارالعلوم میں تحفظ سنت کے مشاورتی اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد علی الصباح علی گڑھ کیلئے روانگی عمل میں آئی، حضرت حکیم کلیمُ اللہ صاحب مدظلہ، سے حاضری کی اجازت پہلے ہی حاصل کر لی تھی، صبح کی نماز خادم الاسلام ہاپوڑ کی مسجد میں ادا کر کے ۹ بجے علی گڑھ پہونچ گئے، حضرت کے خادم عزیزم مولوی عبدالمقسط سلمہ، نے چاء پلائی اور بتلایا کہ تھوڑی دیر میں ناشتے کا انتظام ہوگا اور ناشتے ہی پر حضرت سے ملاقات ہوجائے گی۔

چاء آنے تک میز پر رکھی ہوئی کتاب ''قافلۂ اہل دل'' اٹھا کر حضرت خواجہ غلام علیؒ کے ملفوظات دیکھنے لگا تو ان ملفوظات پر نظر پڑی:

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا نام حق تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے کہ کھانا قوتِ شہوانی ونفسانی پیدا نہ کرے، بلکہ ایسی طاقت دے جو اطاعت وعبادت میں صرف ہو، فقراء ہر لقمہ کے اول میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ پڑھتے ہیں، مجتمع ہو کر کھانا بہت برکت رکھتا ہے لیکن ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کرے، کھانے پینے کے بعد حدیث میں جو دعا آئی ہے اس میں وجعلنا من المسلمین سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام اللہ کی نعمتوں میں ایک عظیم نعمت ہے، اس نعمت کا شکر بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔

دل میں آیا اہل اللہ کی باتوں میں بھی عجیب تاثیر ہوتی ہے، دوسو سال گذرنے کے بعد بھی ان باتوں میں بلا کی تازگی اور غضب کی تاثیر محسوس ہوتی ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کلام نبوی اور کلام الٰہی کا کیا مقام ہوگا۔ اللہ اکبر!

ساڑھے نو بجے دستر خوان لگا اور حضرت حجرہ سے باہر آئے ملاقات ہوئی، بہت ہی شفقت ومحبت سے معانقہ فرمایا، چند اور مہمان تھے جو پہلے سے مقیم تھے ان سب کے ساتھ ناشتہ ہوا۔ گرم گرم پوری، آلو کی سبزی، آملیٹ، بریڈ مکھن، ناشتے میں شامل تھے۔

حضرت نے ناشتے کے دوران دیگر مہمانوں کا مجھ سے اور میرا ان سے تعارف کروایا، مجھے وسوسہ بھی کبھی نہ آیا کہ حضرت کو اپنی شُدبُد جو دینی خدمات چل رہی ہیں ان کا تفصیلی علم ہوگا، مگر حضرت حکیم صاحب مدظلہٗ نے مدرسے کا، لکھنے پڑھنے کی مشغولیت کا، اور فرق باطلہ سے متعلق جن خدمات کا موقعہ ملا تھا ان کتابوں کا تذکرہ بھی تعارف میں فرمایا، جس سے اپنے چھوٹوں کے کام سے ان کی باخبری وآگہی کا اندازہ ہوا۔

تحفظِ سنت کانفرنس سے متعلق اس عاجز سے پوچھا کہ کیسی رہی؟ اور خود ہی فرمایا: تقابل وتفاضل اور اہانت وتنقیص کے بغیر اپنی بات پھیلائی جاتی رہے اس سے کام ہوگا اور انشاء اللہ نفع ہوگا۔

ناشتے کے بعد چاء آئی تو میں نے چاء کی پیالی اپنی پلیٹ میں رکھ لی، فرمایا: پلیٹ سے علاحدہ رکھو پلیٹ کی چکنائی لگ جاتی ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ اس سے چاء میں سالن کے مہک شامل ہوکر دوسروں کے لئے تکدر کا سبب بن جاتی ہے، یہ غایتِ سلیقہ کی بات ہے۔)

میں نے مولانا یحییٰ نعمانی صاحب زید مجدہٗ کی کتاب ''تقلید اور مسلکی اختلاف کی حقیقت'' جو مجلس علمیہ آندھرا پردیش سے شائع ہوئی تھی پیش خدمت کی تو قبول فرما کر اپنے خادم کو سرہانے رکھدینے کے لئے حوالہ کیا، پھر فرمایا: دیکھو کتابیں خواہ کتنی ہی لکھدی جائیں کافی نہیں ہیں، عام مسلمانوں کو ان کے فہم کے مطابق تفہیم کی ضرورت ہے، مختصر مضامین اور عام فہم بات بہت مفید ہوتی ہے، مناظرہ ومباحثہ کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں، خود حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ نے بھی اخیر میں یہی تاثر ظاہر فرمایا تھا۔

میں نے حضرت محی السنہؒ سے متعلق اپنا لکھا ہوا ایک مضمون ملاحظے کیلئے پیش کیا تو فرمایا:

یہاں رکھ کر جائیں، بعد میں دیکھوں گا، پھر فرمایا: بزرگوں کی سوانح عمریاں پہلے تو اس لئے لکھی جاتی تھیں کہ ان بزرگوں کے احوال وسیرت کونکھارا اور دکھایا جائے لیکن ادھر میں دیکھ رہا ہوں کہ عام طور سے جو بزرگوں کے تذکرے اور سوانح لکھے جارہے ہیں تو ان میں لکھنے والے اُن بزرگوں کے ساتھ اپنے تعلق اور اپنی شان ومقام کو واضح کرنے کی زیادہ فکر کرتے ہیں کہ میرا ایسا تعلق تھا اور میرا یوں اکرام فرماتے تھے اور خصوصی معاملہ ہوتا تھا وغیرہ یعنی ان مضامین میں زیادہ زور تو اپنے کو نمایاں کرنے پر دکھائی دیتا ہے، حضرت والا کے سلسلہ میں بھی بعض ایسے مضامین نظر سے گذرے، افسوس ہوتا ہے سوانح عمریوں میں ان کی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہیے جن کا تذکرہ کیا جارہا ہے، ان کی صفات وکمالات کو امت کے سامنے لانا چاہیے تاکہ چھوٹوں کو اور نہ جاننے والوں کو ان سے سبق لینے اور اپنے اخلاق سنوارنے میں مدد ملے۔

اخلاص کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بہت تاکید سے فرمایا: دیکھو بیٹا! ہر کام اخلاص سے کیا کرو، حضرت والا[1] فرمایا کرتے تھے، اخلاص کے بغیر کوئی عمل معتبر نہیں ہے اور مثال دیتے تھے کہ جو کام تم کررہے ہو کوئی اور بھی کرنے لگے تو تمہیں غم ہوتا ہے یا خوشی؟ خوشی ہوتی ہے تو یہ اخلاص ہے، کیوں کہ دین کا کام مقصود تھا، وہ مزید ہونے لگے تو مخلص کا دل خوش ہوتا ہے۔

اشرف الجرائد کے حوالہ سے فرمایا: یہاں پہونچتا ہے، میں دیکھتا ہوں، شیعیت سے متعلق جو مضمون (ممدوح الحربی کے مضمون کا ترجمہ) تھا پسند آیا، سنجیدہ آدمی کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا۔

مدرسہ کی خیر خیریت دریافت کی، حاضرین سے فرمایا: ان کا بڑا مدرسہ ہے کافی طلبہ پڑھتے ہیں، مجھ سے فرمایا: طلبہ سے گفتگو کا جب موقع ملے تو ان سے کہیں کہ علم کا مقصد تقوی اللہ ہے، تقوی کا عام فہم موٹا موٹا مفہوم یہ بتلادو کہ تقویٰ نام ہے اللہ سے ڈرنے اور گناہوں سے

[1] حضرت محی السنہ ہردوئی رحمہ اللہ

بچنے کا، طلبہ سے کہو کہ علم کے حصول کے ساتھ گناہوں سے بچنے کا بہت اہتمام کریں، اور گناہوں سے بچنے کی ہمت وتوفیق ملتی ہے اہل اللہ کی صحبت سے، اتقوا کے بعد کونوا مع الصادقین ہے، اس کی مدرسہ میں طلبہ کو یاددہانی کراؤ اور بار بار بتلاتے رہو۔

خدامِ دین اور اہل مدارس کے درمیان مناقشات کے حوالہ سے فرمایا: اس قسم کے واقعات جن علماء کے بھی سامنے آتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے علم تو حاصل کیا مگر اہل اللہ کی صحبت نہیں پائی، کوئی ان کا بڑا نہیں، خودرائی سے کام کرتے ہیں، یہ سب حالات اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں، بزرگوں نے ہمیشہ اپنے کو کسی کا پابند رکھا ہے، حضرت والا خود اتنے بڑے مقام پر تھے مگر انہوں نے کبھی اپنے کو شیخ سے مستغنی نہیں سمجھا، حضرت حکیم الامت کے بعد سے آخر تک ہمیشہ کسی نہ کسی سے وابستہ رہے۔ مدارس میں بھی جو حالات ہو رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اساتذہ عام طور سے غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں، اسی لئے حضرت والا نے اشرف المدارس میں تقرر کیلئے اس کو شرائط میں رکھا کہ کسی شیخ سے اصلاحی تعلق ہونا چاہیے۔

فرمایا: کسی مرحلے پر آدمی اپنے کو اصلاح کی ضرورت سے مستغنی نہ سمجھے، حضرت والاؒ اگرچہ حضرت حکیم الامتؒ کے خلیفہ تھے، خود ایک مقبول ومحبوب شیخ بن گئے تھے، مگر آخر تک انہوں نے کسی نہ کسی کو اپنا بڑا بنائے رکھا، حضرت تھانویؒ نے جب اپنے خلفاء کو ہدایت دی تھی کہ آپس میں کسی کو اپنا شیخ بنالیں اور اس کی اطلاع مجھے کریں تو حضرت والاؒ نے اپنے لئے خواجہ صاحبؒ کو منتخب کر لینے کی اطلاع دی، اس پر حضرت حکیم الامتؒ نے جواب لکھا "لاجواب انتخاب ہے"۔ بعد میں بھی حضرت شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ، حضرت مولانا عبدالرحمن کیمل پوریؒ، حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ، حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کو اور آخیر میں حضرت شاہ پرتاب گڑھیؒ کو اپنا بڑا مانتے رہے۔

ایک عبرت ونصیحت کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا: کہ حضرت والا خود ایک عالم اور شیخِ

طریقت ہونے کے باوجود ان کے عجز و کسر نفسی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ کسی بات پر حضرت مفتی محمود صاحب ؒ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ میں یہاں نہیں رہوں گا، حضرت والاؒ نے اشکبار ہوکر اپنی غلطی سے معذرت کی، پھر بھی حضرت مفتی صاحب چلے گئے تو حضرت والا نے نائب[1] صاحب سے فرمایا: میرا بستر باندھ دیجئے، میں بھی یہاں سے جارہا ہوں، چنانچہ اپنا بستر لیکر اسٹیشن پہونچ گئے کہ اگر آپ خفا ہوکر چلے جائیں گے تو میں بھی آپ ہی کے ساتھ جاؤں گا، یہ کیفیت دیکھ کر حضرت مفتی صاحب واپسی کے لئے راضی ہوگئے، اس طرح اپنے استاذ کو واپس مدرسہ لے کر آئے، یہ کوئی معمولی بات ہے؟ کس قدر عجز و تواضع کی بات تھی، ہمیں سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔

بعض لوگوں کی مالی بے دیانتی اور خیانت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: آج کل لوگ دین کے نام پر دین کو بدنام کررہے ہیں چندہ میں جائز ناجائز کا کچھ خیال نہیں ہے، دوسرے مدرسوں کی یا فرضی ناموں کی رسیدیں چھاپ کر چندہ وصول کررہے ہیں، ایک صاحب پریس میں پہونچ کر اشرف المدارس ہردوئی کی رسید چھپوانا چاہتے تھے، اتفاق سے پریس کے ذمے دار مدرسہ سے واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اس مدرسہ میں آج تک رسید نہیں چھپی، چندہ کا نظام ہی نہیں ہے، انہوں نے ربط کر کے ہمیں اطلاع دی۔ یہ حرکتیں ہورہی ہیں، ایک صاحب نے چندہ کے پیسے سے اپنا مکان بنالیا، بعض لوگوں کے پوچھنے پر جواب دیتے ہیں کہ دینے والے نے مناسب جگہ لگانے کا اختیار دیا تھا، یہ حال ہورہا ہے دیانت کا، ذرا اپنے اکابر کا طریقہ دیکھو کس قدر محتاط تھے اور کیسا خوفِ خدا تھا۔

طلبہ کے سلسلہ میں فرمایا: آج کل طلبہ کے پاس قیمتی گھڑیاں ہیں، موبائیل فون ہیں، اس کے باوجود مدرسہ سے امداد بھی لیتے ہیں، انہیں اس پر غور کرنا چاہیے، جب تک امداد کے مستحق نہ ہوں مدرسہ سے امداد نہ لیں، اس سے علم میں برکت نہیں ہوتی اور موبائیل تو طلبہ رکھے ہی نہیں، اس سے آج کل بہت نقصان ہورہا ہے، اخلاق خراب ہورہے ہیں، وقت

[1] حضرت مولانا بشارت علی صاحب رحمہ اللہ

کا ضیاع ہے، طلبہ کو بار بار تاکید کی جائے فہمائش کی جائے۔ اسی طرح طلبہ کو تاکید کی جاتی رہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ مدرسہ کی روشنی کا استعمال نہ کریں، ضرورت ختم ہونے کے بعد بجلی گل کردیں، اسی طرح پانی کے استعمال میں اسراف سے بچیں، جب سمندر پر بھی وضو کر رہے ہوں تو پانی میں اسراف کی اجازت نہیں دی گئی تو مدرسہ کے پانی کا بے ضرورت ضیاع کیسے درست ہوسکتا ہے؟

مسلمانوں کے اردو زبان سے دوری کے حوالہ سے فرمایا: مسلمانوں کے غلبے کے زمانے میں جب فارسی زبان رائج ہوگئی تھی، وہی پڑھی لکھی جاتی تھی تو غیر مسلموں نے نوکریاں حاصل کرنے کے لئے خود تو فارسی پڑھی مگر اپنے گھر کی عورتوں کو نہیں سکھائی، ان کو خاندانی اور مادری زبان سکھاتے تھے، ان کی گود میں مذہبی کتابیں لا کر ڈال دیتے تھے، تاکہ اپنی زبان اور اپنی تہذیب ضائع نہ ہوجائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان ان کی نسلوں میں محفوظ اور منتقل ہوتی رہی، یاد رکھو: زبان، مانگنے سے نہیں ملتی، زبان اپنانے اور اختیار کر لینے سے ملتی ہے۔

یہ عاجز سوچتا رہا کہ انگریزوں کے غلبے کے بعد جب انہوں نے انگریزی زبان کو ہندوستان میں رواج دیا اور تعلیم کو اس سے وابستہ کردیا تو اس وقت مسلمان بھی اگر ایسا کرتے کہ مرد لوگ تو ذریعۂ معاش کے درجے میں اسے سیکھ لیتے مگر گھر کی عورتوں کو اردو زبان ہی کا عادی بنا کر رکھتے تو ان کی نسلیں آج اپنی تہذیب اور مذہب کے انمول اور قیمتی سرمایہ سے محروم نہ ہوتیں، مسلمان گھرانوں میں اردو زبان سے غفلت اور انگریزی کی طرف رجحان کے نتیجے میں انہیں فائدہ تو دو کوڑی کا نہ ہوا نقصان ناقابل تلافی ہوگیا کہ اپنی تاریخ، تہذیب اور مذہب سب کچھ سے کنگھال ہوکر بھکاریوں کی طرح کاسۂ گدائی لئے پھر رہے ہیں، دردر سے ملی تہذیبوں اور غیروں سے سنی تاریخوں کے درمیان چوں چوں کا مربہ بنے ہوئے ہیں، کمال یہ ہے کہ محروموں کا یہ قافلہ محرومی ہی کو حاصل حیات مانتا اور اسی پر نازاں

دکھائی دیتا ہے ؎

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

پونے گیارہ بجے فرمایا: اب مطب کا وقت ہو رہا ہے، اس وقت ناشتے میں اور عصر بعد تھوڑا سا وقت مل جاتا ہے ملاقات کا نظام بنا ہوا ہے۔ اب جا سکتے ہو، دیکھو! جب بھی سفر کرنا ہو دو رکعت نفل نماز پڑھ کے اور دعا کر کے سفر میں نکلا کرو، اس کا اہتمام رکھو، پھر مصافحہ کر کے رخصت فرما دیا۔

دو گھنٹے کی اس ملاقات میں جسمانی اور روحانی دونوں ناشتے ہوئے اور دونوں بہت ہی لذیذ و مفید، اللہ پاک اہل اللہ کی ان کرم فرمائیوں کی قدر کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

یہ بھی عرض کر دوں کہ اس وقت حضرت مدظلہٗ مسلسل فرماتے رہے، آواز پست تھی، غور سے سنتا رہا، نہ لکھنے کا موقع تھا نہ ریکارڈ کرنے کی طرف دھیان گیا، جو باتیں حافظے میں محفوظ رہ گئیں تھیں میں نے اطمینان و اعتماد کی بناء پر قارئین کے نفع کے لئے نقل کر دی ہیں۔

(اداریہ مارچ ۱۳ء)

قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَاراً

مدیر محترم نے ادارہ ہذا کے اساتذہ کرام کو چند دن قبل ناشتے پر مدعو کر کے خصوصی خطاب فرمایا تھا، جو فکر انگیز ونتیجہ خیز ثابت ہوا۔ اس خطاب کو مولانا عبدالرحمن محمد میاں قاسمی، استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد نے ریکارڈر کی مدد سے ضبطِ تحریر میں لایا، جسے نفعِ عام کے مدنظر شریکِ اشاعت کیا جارہا ہے۔ از: مرتب غفرلہٗ

حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا:

حضرات اساتذہ کرام! اس وقت آپ سے تین باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عام آدمیوں کے مقابلہ میں کسی کو اللہ تعالیٰ کوئی خصوصی نسبت اور کوئی خاص مقام عطا فرمائے تو اس نسبت اور مقام کا احترام ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے، اس منصب اور نسبت کا خیال اور دھیان ہمیشہ رہنا چاہیے، آپ یہ کبھی فراموش نہ کریں کہ آپ عامی نہیں عالم ہیں، یہود کے بگڑنے اور قبولیت کے بعد مردود ہونے کا سبب یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی حیثیت کو فراموش کردیا اور ان کے علماء اپنی ذات کے بارے میں بھی اور قوم کے بارے میں بھی اپنی ذمہ داریوں کو بھول گئے۔

اس وقت ہماری قوم میں بہت سے منکرات جاری وساری ہیں، جن کو آپ علماء ہی روک سکتے ہیں، یہ آپ کی ذمہ داری ہے، آپ حضرات ماشاء اللہ علماء ہیں، حدیثیں

پڑھی ہیں، یہ حدیث بھی پڑھی ہوگی کہ ایک مرتبہ اللہ کے نبی ﷺ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوئی، آپ حزن وملال فکر واہتمام سے اپنے گھر سے اٹھ کر مسجد تشریف لے گئے ــــ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ــــ مجھے بھی فکر لاحق ہوئی کہ آخر کیا بات پیش آ گئی ہے، تو میں دروازہ کے پاس کان لگا کر کھڑی ہوگئی تاکہ میں بھی سنوں کہ آپ کیا اہم اعلان فرمانے والے ہیں، آپ ممبر پر چڑھے، اور اعلان کیا کہ لتأمرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر اولیوشکن اللّٰہ عذاباً من عندہٖ[1] امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ اللہ کے پاس سے عذاب آنے کا انتظار کرو۔ عذاباً یعنی ایک خاص قسم کا عذاب جو من جانب اللہ ہوگا، خاص اس لئے کہا کہ اس امت پر مسخ کا فسخ کا ایسا عمومی عذاب تو نہیں آئے گا جیسا پچھلی امتوں پر آتا تھا۔ خاص عذاب کی توجیہ اہل اللہ نے فکر کے مسخ ہوجانے، دل کے سخت ہوجانے سے کی ہے، یہ عذاب غیر مرئی عذاب ہے، انسان کی فکر منحرف ہوجاتی ہے، اس کو صراطِ مستقیم سے ہٹادیتی ہے، بعض لوگ ایسے گمراہ ہوئے کہ ان کا دل سخت پتھر ہوگیا ــــ نعوذ باللہ ــــ یہ عذاب ہزار عذابوں کا مجموعہ ہے۔ ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک بستی کو گناہوں کی کثرت کی وجہ سے پلٹ دینے کا حکم دیا تو جبرئیلؑ نے کہا: پروردگار! اس میں آپ کا ایک ایسا خاص بندہ ہے کہ اس نے پل جھپکنے کے بقدر بھی کوئی گناہ نہیں کیا لم یعصک طرفۃ عین تو جواب دیا گیا پہلے اسی کو گراؤ اور اس کے اوپر بستی کو گراؤ، کیوں کہ اس نے قوم کو برائی سے نہیں روکا، اللہ کی نافرمانیوں پر اس کو ناگواری تک نہ ہوئی۔[2]

آپ حضرات میں سے چونکہ بعض خطبا ہیں اور ہفتہ میں ایک بار ہی سہی قوم کو کچھ سنانے کا موقعہ مل جاتا ہے، اس لئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ وعظ ونصیحت پوری تیاری اور اہتمام کے ساتھ ایک ذمہ داری سمجھ کر کریں۔ کیونکہ بہت سے خطباء کو یہ دیکھا گیا کہ وہ ایک

[1] ترمذی:۲۱۶۹، [2] بیہقی فی شعب الایمان:۷۱۸۹

دو گھنٹے قبل خطبات کی کوئی کتاب کا سرسری مطالعہ کر کے کچھ سنا دیتے ہیں، گویا بس ضابطے کی تکمیل کر دیتے ہیں، ایسا نہ کریں بلکہ ہفتہ بھر اچھی طرح مطالعہ کر کے مواد جمع کر کے ایک ضروری اور اہم عنوان پر بیان کریں تا کہ عوام الناس کو کوئی علمی فائدہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آپ وعظ میں بس جوشِ خطابت دکھا کر اور زوردار تقریر کر کے ضابطہ کی تکمیل نہ کریں بلکہ معاشرہ میں تیزی سے بڑھتی بے راہ روی اور اخلاقی و اعتقادی اغلاط پر کڑی نظر رکھ کر اپنے خطابات و بیانات میں ان کی اصلاح کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلاتے رہیں۔ علمی و عملی طور پر اپنے کو گھلائیں مٹائیں تب جا کے انشاء اللہ نفع ہوگا۔

غرض یہ ہے کہ جو خاص لوگ ہیں ان کو اپنی خصوصیت برقرار رکھنی چاہئے خصوصیت کے معنیٰ شان بگھارنا نہیں بلکہ منصب کا احترام کرنا ہے، حقوق کی ادائیگی ہے، عالم ہونا، داعی ہونا، مصلح ہونا ایک آسمانی منصب ہے یہ دنیوی عہدے نہیں ہیں۔ دنیا میں بھی خواص کا عوام کے مقابلے میں زیادہ مواخذہ ہوتا ہے، کوئی آدمی سرکاری عہدے پر ہو اور اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو فوراً پہلے اس کو معطل کر دیا جاتا ہے کیونکہ سرکاری عہدہ پر رہ کر اس نے ایسا ناروا کام کیا، اپنے منصب کا خیال کیوں نہ کیا؟۔ اب بتایئے کہ دنیا کے ادنیٰ عہدہ دار کی بے اصولی اور منصب کی توہین تعطل کا سبب بن سکتی ہے تو ہم دینی منصب والوں کے ساتھ ایسا کیوں نہ ہوگا؟، اگر ہم بھی اپنے منصب و مقام کی توہین کریں اور حق تعالیٰ ہم سے کام لینے کا ارادہ ختم کر دیں، ہمیں معزول کر دیں تو ہم کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ دنیا کے مناصب کی معزولی تو معلوم ہو جاتی ہے، اخباروں میں آ جاتی ہے لیکن حق تعالیٰ ایسی صورتیں اختیار کرتے ہیں کہ اس نے اپنے کام سے معزول کر دیا اور ہم کو پتہ بھی نہیں چلا، ہم ابھی پڑھا ہی رہے ہیں۔ معزولی کبھی کام سے محروم کر کے ہوتی ہے اور کبھی فیضان بند کر کے ہوتی ہے۔

دوسری بات جو عرض کرنی ہے وہ تدریس کی ذمہ داری کو ذمہ دارانہ طریقے پر پورا کرنے کی بات ہے، میں حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ کا ایک مضمون پڑھ رہا تھا اس میں

اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اردو شروحات نہ دیکھیں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر آپ عالم ہو کر بھی اردو شروحات پر اکتفا کریں گے تو آپ کے شاگردوں کی کیا استعداد بنے گی ان کا کیا ہوگا؟۔آپ ہدایہ پڑھاتے ہیں اور اشرف الہدایہ دیکھ کر پڑھا دیتے ہیں تو آپ خود غور کریں کہ آپ کو مکمل عالم ہو کر بھی ہدایہ کی عبارت کا ترجمہ کرنا نہیں آیا تو پھر آپ کی قابلیت اور استعداد کا کیا حال ہے؟ آپ کو خود ترجمہ اور حل عبارت کرنا کیوں نہیں آتا؟۔ہاں! بعض مسائل تحقیق طلب ہوتے ہیں، مراد معلوم نہیں ہوتی یا عبارت سخت ہوتی ہے تو ایسے وقت دیکھ لیں کہ مترجم نے کیا ترجمہ کیا ہے، یہ ثانوی درجہ کی چیز ہے، اصل تو یہ ہے کہ آپ کو کتاب متن اور حاشیہ سے ہی حل کرنا آجائے، آپ ہر سبق کا براہِ راست ترجمہ کرسکیں۔اب ہوتا یہ ہے کہ آپ بھی اردو شرح دیکھ کر پڑھا رہے ہیں اور آپ کا شاگرد بھی وہی شرح دیکھ کر آرہا ہے اور بعض اوقات یہ بھی محسوس کررہا ہے کہ استاذ صحیح سمجھ کر نہیں آئے ہیں، شرح میں تو ایسا لکھا ہے، یہ کتنا بڑا نقصان ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ استعداد کو بڑھانے کی فکر جونیئر اساتذہ بھی کریں اور سینیئر بھی کریں، اگر آپ میں جستجو وطلب نہیں، علم بڑھانے کی فکر نہیں تو کیسے کام ہوگا؟

یہاں مدرسہ میں چند دن قبل مولانا سید سلمان حسینی ندوی مدظلہ دو دن تھے، عظمتِ صحابہؓ کے جلسے میں آئے ہوئے تھے، میں آتے جاتے دیکھتا رہا کہ وہ کتابیں منگوا کر مراجعت کرکے بیان کی تیاری کررہے تھے، حالانکہ عظمتِ صحابہؓ کے جلسہ میں تقریر کرنا کیا مشکل کام ہے؟ وہ بھی ایک ایسے آدمی کے لئے جو گھنٹوں تقریر کرسکتا ہو، مگر وہ برابر مراجع کے مطالعے میں لگے رہے، کوئی ملنے آیا تو ملاقات کی پھر مطالعہ میں مصروف ہوگئے، چونکہ آدمی کے اندر جتنی جستجو ہوتی ہے جتنا مطالعہ اور مراجعت ہوتی ہے اتنا ہی اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔اسی اثناء میں حضرت قاری عثمان صاحب مدظلہ بھی تشریف لے آئے، میں نے طلباء کو کچھ نصیحت کرنے کی درخواست کی تو آپ نے ایک

حدیث پڑھی اور تفصیل سے اس کی وضاحت کی، میں بھی اس مجلس میں بیٹھا تھا، الحمد اللہ بہت سی ایسی باتیں سامنے آئیں جو میں نے کبھی نہیں سنی تھیں، جب حضرت قاری صاحب کمرہ میں گئے تو مولانا سلمان صاحب نے ان سے دو باتوں کی تحقیق کر لی، مولانا نے قاری صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ جو بات کہی کہ یہ عبارت راوی کی شرح ہے ہم تو اس کو اب تک متن سمجھتے تھے، قاری صاحب نے کہا کہ ہاں وہ شرح ہی ہے، اس کے بعد مشکوٰۃ منگوا کر متعلقہ باب اور حدیث نکلوائی اور پڑھ کر بتلایا تو مولانا سلمان صاحب نے فرمایا کہ اب ہماری غلط فہمی دور ہو گئی۔ علماء اور اہل اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ عالم عالم سے فائدہ اٹھالیتا ہے، کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی فوراً تحقیق اور اطمینان کر لیتے ہیں، اس کو علمی مشغولیت کہتے ہیں، یہ ہم کو دھوکہ ہو گیا ہے کہ ہم علم کی خدمت کر رہے ہیں، علم ایک پیشہ تھوڑا ہی ہے کہ آئے پڑھائے اور چلے گئے، علم تو ایک پیاس ہے ایک حرص ہے، جو بجھانے سے بجھتی نہیں بڑھتی چلی جاتی ہے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ نے ایک دفعہ علماء اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "دیکھو آپ لوگوں کا علم تازہ ہے اور میرے بال سفید ہو گئے ہیں، یعنی آپ ابھی فارغ ہوئے ہیں سب علم ذہن میں تازہ ہوگا، لیکن تجربہ جو ہم کو حاصل ہوا ہے وہ آپ کو نہیں ہے، اگر آپ ہم سے مستغنی ہو نگے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا"۔ اس لئے آپ اساتذہ کرام سے بھی میں کہتا ہوں کہ اپنے اساتذہ اور بڑے علماء سے مستغنی نہ ہوں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ، آپ نائبینِ رسول ہیں، ایک نائب رسول کو اپنی ذمہ داری سے لرزاں وسوزاں رہنا چاہیے اور اس کا علم تازہ ہونا چاہئے، اس کو آرام پسند نہیں ہونا چاہئے۔ اس کیلئے آپ مسلسل مطالعہ و جستجو کیا کریں، جب تک کسی بات پر خود کو اطمینان نہ ہو وہ بات دوسروں کے سامنے نہ لائیں۔ اس امت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتی ہے، قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ

اور وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ط تو آپ ہی لوگ ہیں، آپ مسئلہ بتائیں تو علیٰ وجہ البصیرت بتائیں، فتویٰ دیں تو علیٰ وجہ البصیرت، بیان کریں تو علیٰ وجہ البصیرت، سبق پڑھائیں تو علیٰ وجہ البصیرت کیونکہ آپ کی خصوصیت بصیرت ہے۔ پچھلی امتوں میں بصیرت نہ تھی نقل محض ان کا دین تھا وہ بڑوں سے جو سنتے اس پر عمل کر لیتے تھے، اس کی کوئی تحقیق نہیں کرتے کہ یہ روایت کہاں سے آئی، کیسے آئی، اس کا مفہوم و مدلول کیا ہے؟ لیکن اس امت کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا ہر کام علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے، جیسے حضرت قاری صاحب نے (مذکورہ واقعہ میں) صرف زبانی بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کتاب منگوائی اور دکھایا، مطمئن کرنا اس کو کہتے ہیں، اُنھیں اتنا اطمینان تھا کہ میں نے جو بات کہی اس کو ثابت کر سکتا ہوں۔

حضرت تھانویؒ نے حضرت کشمیریؒ کو لکھا کہ اس مسئلہ میں اپنی تحقیق سے تسلی نہیں ہو پا رہی ہے، آپ اپنی تحقیق سے مطلع کریں، باوجود یہ کہ حضرت کشمیریؒ چھوٹے تھے، لیکن حضرت تھانویؒ نے بہت ملتمسانہ اور عاجزانہ خط لکھا کہ میری نظر بس آپ پر ہی لگی ہوئی ہے آپ اگر اس مسئلہ میں رائے دے دیں تو پھر مجھے کچھ طئے کرنے میں مدد مل جائیگی۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ ہمارے اکابرِ دیوبند ضرورت پر درس میں سے اٹھ کر کسی دوسرے عالم سے پوچھ آتے تھے، اور بعض دفعہ تو کوئی شاگرد مل گیا اسی سے پوچھ لیا اور واپس آکر طالبِ علم کے اشکال کا جواب دیدیا، اس قدر تواضع، عاجزی اور دیانت تھی کہ شاگرد سے معلوم کر لینے میں بھی عار نہ ہوا، آج ہمارے پاس اتنا غرور ہے کہ ہم اپنے بڑوں سے پوچھنے کو تیار نہیں ساتھیوں سے شاگردوں سے کیا پوچھیں گے۔ حال یہ ہے کہ جو میری سمجھ میں آگیا وہی صحیح ہے، ظاہر ہے کہ ایسا آدمی ایک دن گمراہ ہوتا ہے کم از کم اس مسئلہ میں تو عمر بھر گمراہ ہی رہے گا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اپنی معلومات کی بناء پر بلا تحقیق ہی بڑوں پر تنقید کرنا شروع کر دیتے ہیں، تحقیق کے لئے تیار نہیں ہوتے حالاں کہ تحقیق میں طرفین کا فائدہ ہے۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ علم اللہ ہی کے پاس سے آتا ہے، اللہ ہی کے پاس علم کے

خزانے ہیں۔ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝۶۵ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ کتنی آیات موجود ہیں، یہ اس علم کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے فیضان سے حاصل ہو اور جو علم معلوماتِ محض ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم کا فیضان ہوتا ہے وہ ہمارے لیے نافع ہے، اس میں نورِ ہدایت پوشیدہ ہوتا ہے، جو علم ہم کتابیں رٹ رٹ کر پاتے ہیں وہ صرف علم کے الفاظ ہیں اس میں علم کے انوار نہیں ہیں، اللہ سے لو لگا کر علم حاصل کرنا اور دل میں اپنی اور امت کی آخرت کا غم ہونا چاہیے، اس لئے اقرأ کے ساتھ باسم ربك بھی فرمایا گیا ہے۔

جو آپ کے سامنے طلبہ ہیں یہ بھی امت ہی ہیں، آپ لوگ (شعبہ عالمیت میں) ساڑھے پانچ سو بچوں کو پڑھا رہے ہیں، معصوم اور بے علم بچوں نے اپنے سینے کی تختیاں آپ کے حوالہ کر دی ہیں، اپنی دماغ کی کاپیاں آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں کہ آپ اس پر جو لکھنا چاہتے ہیں لکھ دیجئے، جو نقش کرنا چاہتے ہیں نقش کر دیجئے۔ مثلاً اول میں آنے سے پہلے اس کو اول کی کتابوں کا علم نہیں تھا، دوم میں آنے سے پہلے اس کو دوم کی کتابوں کا علم نہیں تھا، وہ لاعلم خالی الذہن آپ کے سامنے آ رہا ہے اس اعتماد پر کہ ہمارے استاذ یہ کتاب پڑھا رہے ہیں اس کتاب سے جو علم آنا چاہیے وہ ہمیں بھی حاصل ہو جائے گا، اور اس فن سے ہمارا جہل دور ہو جائے گا۔ لیکن میرے دوستو! یہ اس وقت ہوگا جب آپ پہلے کتاب کو سمجھنے کا، مطالعہ کا، تحقیق کا، تفصیل کا حق ادا کریں پھر پڑھائیں، تب اُن کی امید اور ان کا اعتماد پورا ہوگا، آج آپ سبق بغیر سمجھے پڑھا دیتے ہیں، سستی ہو رہی ہو تو سو جاتے ہیں، وقت پر کلاس میں نہیں جاتے، وقت سے قبل اٹھ جاتے ہیں تو کیا یہ ان طلبہ کی امانت میں خیانت نہیں ہے؟ یقیناً ہے اور اس کو اللہ دیکھ رہا ہے، اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝۱۹ وہ آنکھوں کی خیانت کو بھی اور دل میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے چاہے کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو، پس طالب علم کا دل دماغ آپ کے

پاس امانت ہے، اگر آپ مقدور بھر سعی کر کے اطمینان بخش علم نہیں دے رہے ہیں تو آپ امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم ازدیادِ علم کی جستجو کے ساتھ ساتھ اصلاحِ اخلاق اور تصفیۂ باطن کی بھی فکر کریں۔ عزیز ساتھیو! عمر گزرتی جارہی ہے، موت کا کچھ پتہ نہیں کہ کب آجائے، ہم اپنی فکر کب کریں گے؟ کیا دین ایسی بے قیمت چیز ہے جس میں قناعت کر لی جائے، کیا تعلق مع اللہ ایسی حقیر شئی ہے جس میں کسی مقدار سے راضی ہو جایا جائے؟۔ ہمارے نبی کو تو مقصودِ حیات زندگی ہی میں حاصل ہو گیا تھا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ نازل کر کے اللہ نے انہیں صد فیصد مطمئن کر دیا تھا، اس کے باوجود آپ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا؟ اس کو جاننے کے لئے وہ واقعہ یاد کیجئے! جب ایک صبح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سرخ تھیں، چہرا پیلا ہو گیا تھا، پیروں پر ورم تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے آج رات آپ سوئے نہیں، شاید رات بھر روتے رہے تو پوچھنے والے نے پوچھا کہ آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ آپ اتنا ایثار کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو اللہ کے وعدے پر اطمینان نہیں کہ اللہ نے نہ صرف یہ کہ سب کچھ بخش دیا ہے بلکہ بڑے بڑے مرتبے آپ کے لئے خاص کر دیئے ہیں، آخر اس کے بعد آپ کو کس چیز کی پریشانی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا افلا اکون عبداً شکوراً یعنی بے شک اس کے وعدوں پر یقین کامل ہے اس کے باوجود اب جو عبادت ہو رہی ہے اور جو رونا دھونا ہو رہا ہے، وہ اس بات کے شکرانے میں ہے کہ بلا استحقاق میرے مالک نے مجھے یہ نعمت عطا کر دی، سب کو اپنی کامیابی کا علم قیامت کے دن ہو گا اور مجھے اس کا یہیں اطمینان دلا دیا گیا، ذرا غور کیجئے! نبی تو اپنے نیک انجام کے شکرانے میں عبادت کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ہمارے انجام کا تو کوئی اتہ پتہ نہیں کہ کیا ہونے والا ہے، بڑے بڑے لوگ حیران و پریشان ہیں لیکن ہم کو کوئی پریشانی نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم میں

بہت کم ایسے ہیں جو پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہونگے کہ وہ آخرت کی تیاری میں مصروف ہیں، ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ہمارے ذمہ امامتیں نہ ہوں تو ہم میں سے بہت سے فرائضِ خمسہ کی بھی پابندی نہیں کر پاتے، بس مسجد کے صدر اور مصلیوں کے ڈر سے پانچ وقت کی نمازیں پڑھا لیتے ہیں، کبھی ہم ایک مہینہ امامت سے چھٹی لیکر اپنے گھر پر ہی رہیں، اپنے کاموں میں مصروف رہیں، اور پھر نوٹ کریں کہ ہم لوگ کتنی نمازیں اس اہتمام سے پڑھ رہے ہیں جتنی امامت کی ذمہ داری کی وجہ سے پڑھتے تھے، تو پھر خود ہی آپ کا ضمیر فیصلہ کریگا کہ یہ نماز کا اہتمام نہیں ہے یہ نوکری کا اہتمام ہے، نماز کا اہتمام تو آپ کے مصلیوں اور مقتدیوں کو ہے کیونکہ ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے پھر بھی وہ وقت پر آرہے ہیں، سنتوں کا اہتمام کررہے ہیں، خشوع خضوع سے نماز پڑھ رہے ہیں، ہمیں سنن موکدہ کا بھی اہتمام نہیں رہا۔ پہلے لوگ اپنا تجزیہ خود کرلیا کرتے تھے، خاص طور پر نماز کے سلسلہ میں کیونکہ نماز افضل العبادات ہے، حضرت عمرؓ کے بقول جس کی نماز صحیح نہیں اسکے دین کا کوئی بھروسہ نہیں، اس لئے ہم کو نماز کی کسوٹی پر اپنے آپ کو دیکھنا چاہئے، جہلاء کتنا اہتمام کرتے ہیں اور ہم علماء ہوکر کتنا کرتے ہیں؟۔

ایک بات یہ بھی کہنی ہے کہ ہم اپنی شخصی زندگی کے ساتھ ازدواجی اور معاشرتی زندگی کی طرف بھی دھیان دیں کہ وہ بھی دیندارانہ ہونی چاہئے، جب ہم مدرسہ فیض العلوم میں پڑھاتے تھے محی السنہ حضرت ہردوئیؒ سال میں ایک مرتبہ ضرور تشریف لاتے تھے اور اساتذۂ کرام کے ساتھ بھی بیٹھک ہوتی تھی، ایک بات بار بار فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو آپ لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ رکھو کہ اگر ان کی سہلیاں جو غیر علماء وصلحاء کے ہاں ہوں وہ سنیں تو ان کے دل میں یہ حسرت پیدا ہو کہ کاش ہم بھی کسی مولوی کی بیوی ہوتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے طرزِ عمل کو جان کر خیر منائیں کہ اچھا ہوا ہم کسی مولوی کے ہاتھ نہ لگے۔ بعضوں کا معاملہ اہل وعیال کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ

کھلاتے پلاتے سب کچھ ہیں، لیکن ان کی زبان میں تلخی اور کڑواہٹ ہوتی ہے، جب بولتے ہیں تو کوئی ایسی بات بول دیتے ہیں کہ اس کا زخم ہمیشہ رہ جاتا ہے۔ زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے، بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جنتیوں کو بھی جنت کے دروازہ پر روک کر رضوانِ جنت پہلے دل سے کینا کپٹ کے داغ دھبے نکال دیں گے کیونکہ یہ زخم اس وقت تک رہیں گے، لیکن جنت میں جانے سے پہلے وہ زخم مندمل کردیئے جائیں گے تاکہ جنت میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تو زبان کا اتنا گہرا زخم ہوتا ہے، آپ نے بیوی کے دل پر زخم لگا تو دیا اب اس کے بعد آپ کچھ بھی کھلائیں پہنائیں کچھ بھی بھلائی کریں، یہ زخم بھولے گی نہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ سوچنا چاہیے کہ اگر بیوی آپ کے بھائی کو یا باپ کو کچھ کہہ دے تو آپ پر کیا گزرے گی؟ پھر اس کا بھی تو دل ہے کوئی پتھر نہیں، وہ تو عورت ہے اگر جہالت سے ایسی حرکت کرے تو اس کا تحمل کیا جاسکتا ہے لیکن آپ عالم ہوکر، دیندار ہوکر، واعظ ہوکر ایسا کریں تو آپ کو کیوں کر زیب دے گا۔

بعض کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ زبان سے تو محبت اور ہمدردی کی باتیں کرتے ہیں لیکن عملی طور پر اس کے تقاضہائے حیات کو پورا کرنے میں بہت کوتاہی کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی چادر کے بقدر پاؤں پھیلانا چاہیے، آپ کے پاس بے شک اتنی آمدنی نہیں ہے کہ اہلِ دنیا کی طرح عیش کریں، یہ تو ٹھیک ہے، عیش وعشرت کی بات نہیں ہے بات ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ہے۔ ہر عورت کی اپنی نفسیات ہوتی ہیں، اس کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں، ان کو اپنی حیثیت کے مطابق پورا کیجئے، یہ ضروری نہیں ہے کہ سونے ہی سے کریں، سونا نہیں ہے تو چاندی سے کیجئے، وہ نہیں تو اس سے کم سے کیجئے۔

ایک واقعہ یاد آیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سفر میں تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملتے تھے اور واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں نماز پڑھ کر انہی کے گھر جاتے تھے، ایک مرتبہ غالباً تبوک سے واپس تشریف لائے، یہ بڑا لمبا اور

کٹھن سفر تھا تو حسبِ معمول آپ مسجد گئے، نماز پڑھی پھر بیٹی کے گھر تک آئے لیکن سواری سے اترے بغیر ہی اپنے گھر چلے گئے، بچے نانا کے استقبال کے لئے دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے مگر کسی سے نہیں ملے اور گھر چلے گئے۔ اب ظاہر ہے یہ معمول کے خلاف معاملہ حضرت فاطمہؓ کے لئے بہت تکلیف دہ تھا، تڑپ گئیں، سوچنے لگیں، ابا جان گھر کیوں نہیں آئے مجھ سے کیا تکلیف ہوگئی پھر خود ہی سمجھ گئیں کہ بچوں کے ہاتھ میں جو کڑے ہیں اس کو دیکھ کر ناراض ہوگئے ہوں گے، کیونکہ ان کو معلوم تھا ابا کس چیز سے خوش ہوتے ہیں اور کس سے ناراض!۔ حضرت فاطمہؓ نے دونوں بیٹوں کے ہاتھوں سے کڑے نکالے اور ان کو توڑ دیا، یا اس کی ہیئت وشکل بدل کر ان بچوں کے ہی ہاتھ میں دے دیا اور کہا: جاؤ یہ نانا جان کو دیدو کہ بیت المال میں داخل کر دیں، بچے چھوٹے تھے، دونوں نواسے ان ٹوٹے ہوئے کڑوں کو لے کر نانا کے پاس آئے ان بچوں کا بھی دل دکھا ہوگا، بچوں کے پاس سے ان کی پسندیدہ چیز چھین لی جائے تو ان کا دل بہت دکھتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کڑے لے لئے اور حضرت بلالؓ کے حوالہ کر کے فرمایا: بلال! اس کو لے جا کر بازار میں بیچ دو اور اس سے جو رقم ملے، اس سے ہاتھی دانت کا یا سیپی سے بنا ہوا ہار خرید کر لاؤ، حضرت بلالؓ ایسا کوئی ہار خرید کر لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ فاطمہؓ کو دیدو اور اس سے کہو کہ دنیا میں اسی پر قناعت کر لے، آخرت میں اللہ پاک بہت دیں گے، دیکھا آپ نے؟ نبی عورت کی نفسیات کی کیسی رعایت فرما رہے ہیں۔ ہم مولویوں کو اس کی کچھ بھی رعایت نہیں، حسبِ حیثیت ان کے نفسیاتی تقاضوں کی تکمیل کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

بعض لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ خود تو ٹھاٹ سے رہتے ہیں اور بیویوں کو صحابہؓ کی عورتوں کی طرح سادگی سے رہنے کو کہتے ہیں، کیوں صاحب! آپ صحابہؓ جیسے مرد کیوں نہیں بنتے؟ بیوی ہی کو صحابہؓ کی عورتیں کیوں بناتے ہو۔ میرے عزیزو! اپنے گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرو ان کو خوش رکھنے ان کے جذبات کی رعایت کرنے کی

عادت ڈالو، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت دھیان میں رکھو کہ ہر کسی کو موافق مزاج عورت نہیں ملتی بلکہ شاید ہی کسی کو موافق مزاج ملی ہو، جب ایسا ہے تو اس کی طرف سے جو کچھ پیش آئے اللہ تعالیٰ کے لئے گوارا کر لینا اور صبر سے کام لینا چاہیے کہ وہ بھی کسی کی بیٹی کسی کی بہن ہے، آپ کی بیٹی، بہن کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کرے تو کیا آپ برداشت کر سکتے ہیں؟۔اگر نہیں تو پھر آپ کی بیوی بھی تو کسی کی بہن یا بیٹی ہے، اس پر ظلم وزیادتی کیسے ہو سکتی ہے؟ چند دن کی کلفت ہے پھر مزے ہی مزے ہیں۔حدیث میں ہے کہ آدمی کی بیوی تمام حورانِ جنت کی سردار ہوگی اور حسن و جمال میں بھی حوریں اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی، اگر چہ دنیا میں کتنی ہی کالی کلوٹی کیوں نہ ہو لیکن آخرت میں اس کے حسن و جمال کا مقابلہ حور بھی نہیں کر سکتی، اللہ پاک اس کو ایسا بنا دیں گے، اس لئے اگر بیوی حسبِ منشاء نہیں ہے تب بھی چند دن اللہ کی تقدیر سے راضی رہ کر اسی بیوی سے کام چلالو۔تسلی کی بہت باتیں ہیں، ایک بزرگ عرب کے ایک گاؤں سے گزرے، وہاں ایک کالا کلوٹا حبشی آدمی بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا کہ آؤ کچھ کھجور پانی لے لو، دیہاتوں میں لوگ آنے والے مہمان کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے، اتنے میں ایک نہایت خوبصورت عورت پانی لے کر آئی تو ان کو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اس شخص کی بیٹی ہے یا کون ہے؟ کیونکہ دونوں میں کوئی جوڑ نہیں معلوم ہوتا تھا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ انہی صاحب کی بیوی ہے۔اس عورت سے انہوں نے پوچھا کہ اس جوڑ کے ساتھ آپ کیسے راضی اور خوش ہیں؟ اس نے کہا: ہم دونوں بہت مطمئن ہیں اور اللہ کے فضل سے ہم لوگ جنتی بھی ہیں، اللہ رب العزت نے خلافِ توقع ان صاحب سے میرا رشتہ جوڑا، یہ جوڑا اگر چہ مجھے اپنے معیار کا سمجھ میں نہیں آتا لیکن میں اللہ کی تقدیر سے راضی ہوں صبر کرتی ہوں، و الصبر ثوابه الجنة اور میرے شوہر کو چونکہ توقع نہیں تھی کہ میری جیسی حسین بیوی مل جائے گی، لیکن اللہ نے ان کو اپنے کرم سے ایسی بیوی دیدی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تیرا شکر ہے، تیرا کرم ہے، ظاہر ہے شکر کا ثواب بھی جنت ہے، پس شکر کے

عوض ان کو جنت مل رہی ہے اور صبر کے عوض مجھ کو جنت مل رہی ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی والدہ خیر النساء صاحبہؒ نے خود لکھا ہے، ہمارے گھر میں یہ بات چل رہی تھی کہ ہمارے ایک عزیز کے بیٹے سے میرا رشتہ ہو جائے، ان کی غربت کا یہ حال تھا ہم ہی لوگ ان کا خیال کر لیتے تھے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں، میرے والدین متفکر ہو رہے تھے کہ ہم کھاتی پیتی بچی کو ایسے گھرانے میں کیسے بیاہ دیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں جب رات کو سو گئی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک خاص منظر تھا اس میں سے آواز آ رہی تھی فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ صبح میں نے والدین سے کہہ دیا کہ اللہ نے وہیں پر میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی ہے مجھے وہیں پر بیاہ دیجئے، چنانچہ وہیں شادی کر دی گئی، فرماتی ہیں کہ اللہ پاک نے مجھے یہ دو بیٹے عطا فرمائے اور انہی میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ نے چھپا رکھی تھی۔ ایک مولانا ڈاکٹر عبد العلیؒ اور ایک مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ان سب باتوں سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اگر گھر والی موافق مزاج نہ ہو اور دل ٹوٹتا ہو تب بھی ایک تو کسی کی بیٹی اور لاڈلی ہونے کا خیال کر کے اس پر کوئی زیادتی کرنے سے بچیں، دوسرے اللہ تعالیٰ سے اس صبر و تحمل پر اجر و ثواب کی امید کر کے دل مضبوط رکھیں، چار دن نباہ لیں پھر ہمیشہ کی زندگی میں یہ سب کچھ نہ ہوگا، مزے ہی مزے ہوں گے۔

اسی کے ساتھ اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں دین کی خدمت میں لگایا، اہلِ حق میں سے بنایا، ہمیں علم دین سے جوڑ کر رکھا، اس کے لئے ہماری روٹی بھی اللہ نے اس سے جوڑ دی۔ شکر کی تینوں قسموں کو زندہ رکھیں، شکرِ عملی، شکرِ قلبی، شکرِ لسانی۔ گھر کے ماحول کو لڑائی جھگڑے کا ماحول نہ بنائیں صبر و تحمل کا ماحول بنائیں۔ گھر میں کتاب کی تعلیم ہو اور صحابہؓ و صحابیاتؓ کے حالات سنائے جائیں، اگر ان کے حالات ہمارے سامنے آئیں گے تو گھر میں خود بخود تہذیب آئے گی۔ اپنی بچیوں اور چھوٹے بچوں کے لباس کا بھی خاص

خیال رکھیں، عوام کے لئے تو ہم خیر سختی نہیں کرتے لیکن ہمارے گھروں کا تو ایک معیار ہونا چاہئے، مسنون زندگی ہونی چاہیے، دوسروں کے لئے نمونہ اور اسوہ ہونا چاہیے۔

میں سفر کرتا رہتا ہوں اکثر جگہ لوگ پوچھتے ہیں مولانا! ہمارے گھر کی عورتیں پوچھتی ہیں کہ آپ لوگ تو مرد ہیں کہیں پر بھی جا کر دین سیکھ لیتے ہیں، ہم عورتیں کس کے پاس جائیں؟ کس کی صحبت میں رہیں؟ ہم بھی کچھ سیکھنا چاہتے ہیں، اس سوال سے اتنی شرمندگی اور ندامت ہوتی ہے کہ کیسے ہم کہہ دیں اور کس منہ سے کہہ دیں کہ ہمارے گھر بھیج دو، چار دن رہیں گی تو اللہ والی بن کے جائیں گی۔ ہم لوگ اپنے گھروں کا ایسا ماحول بنانے کی کوشیش کریں کہ عوام الناس اگر اپنی عورتوں کو دیندار بنانا چاہیں تو ہمارے گھروں میں بھیجا کریں کہ جاؤ، دن بھر رہو، دیکھو کہ مولوی صاحب کے گھر میں کیسا دین کا ماحول ہے، امام صاحب کے گھر سے دین سیکھ کر آؤ۔ ایسا ماحول بنانے کے لئے ہمیں کچھ قربانیاں دینی پڑیں گی، کچھ ایثار کرنا پڑے گا، کچھ صبر اور حلم سے کام لینا پڑے گا، اپنے گھر میں ہر چیز ایسی ہو کہ لوگ اس کو دیکھ کر اگر اختیار کرلیں تو نقصان نہ ہو، فائدہ ہو۔

دیکھئے! ہماری کوتاہیوں پر بعض لوگ تو تنقید کرتے ہیں کہ علماء کے گھر میں ایسا ہو رہا ہے؟ اور بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ مولانا کے گھر میں یہ کام ہو رہا ہے تو غلط تھوڑا ہی ہوگا، ان کے بچے ایسا کر رہے ہیں اگر غلط ہوتا تو ایسا کرتے؟ تو ایک تو ایسا عقیدت مند ہے کہ اسی کو دین سمجھ کر بلا تحقیق ہماری نقل کر لیتا ہے اور ایک ایسا حاسد ہے جو بلا تحقیق ہم کو بدنام کر دیتا ہے، کم لوگ ایسے ہیں جو پوچھ کر عمل کرتے ہیں، اب ان عقیدت مندوں کو بچانا بھی ہماری ذمہ داری ہے، خاص کر لباسِ نسوانی کے معاملے میں بالکل لاپروائی نہ کریں آج کل بازار میں کپڑے ایسے آرہے ہیں جو کسی طرح اسلامی تقاضوں پر پورے نہیں اُترتے، اسلئے گھر میں اپنی عورتوں کو سمجھایا جائے کہ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اے نبی کی عورتو! تم عام مسلمانوں کی عورتوں کی طرح نہیں ہو، یہ خصوصیت ہے کہ تم ہمارے

دین کے خادموں کی عورتیں ہو۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ حجاز کے امیر تھے، ان سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری زوجۂ محترمہ دنیا سے رحلت کر گئیں تو اسکے بعد یٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاۗءِ کہہ کر قرآن کس کو مخاطب کر رہا ہے؟ کس مصلحت سے اس کو قیامت تک باقی رکھا گیا؟ مولانا نے فرمایا کہ نبی تو نہیں ہیں، نائبینِ انبیاء موجود ہیں یہ آیت انھیں کی عورتوں کو مخاطب کر رہی ہے۔ مشائخ کی عورتوں کو علماء کی عورتوں کو داعیوں کی عورتوں کو مخاطب کر رہی ہے۔ یٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ اے نبی! (کی طرح جو لوگ دین کے داعی اور معلم ہیں ان) کی عورتو! لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاۗءِ تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اللہ تمہارے مردوں سے دین کی خدمت لے رہا ہے، چونکہ وہ داعی ہیں، اسلئے تم کو ان کے مقام کے مطابق رہنا پڑے گا۔ تو آج اپنی عورتوں کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اللہ نے تمہارے مردوں کو علمِ دین کی خدمت میں لگایا ہے۔ لہذا تم اس مقام کی نزاکت کا لحاظ رکھو، بہت سے کام جائز ہیں تب بھی تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں۔ آج عورتوں کو منا کر ہم ان سے اپنے کام تو نکال لیتے ہیں لیکن دین کے کام نہیں نکال رہے ہیں۔

حضرت شاہ حکیم اختر صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ بیوی اگر ٹی وی یا کسی ناجائز چیز کا مطالبہ کرے تو ہرگز مت دلاؤ یہ کہدو کہ اللہ کا غضب نازل ہوگا، بڑی قدرت والے اللہ کو ناراض کر کے خود بھی چین سے نہیں رہو گی، مجھے بھی چین سے رہنے نہ دو گی۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ اگر پچیس ہزار میں ٹی وی آتا ہے تو ٹی وی تو مت لاؤ لیکن اس کو پچیس ہزار روپیئے دے کر اس سے کہدو کہ قالین لالو، کپڑے، زیور وغیرہ خرید لو، میں تمھارے ساتھ کوئی بخل نہیں کر رہا ہوں بلکہ اللہ کی ناراضگی سے بچانے کے لئے کہہ رہا ہوں یہ پیسے رکھ لو، کوئی جائز چیز لے لو۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تم پیسے بھی نہیں دو گے، متبادل بھی نہیں دو گے اور اس کے مطالبہ کو بھی پورا نہیں کرو گے تو اس کے اندر ہٹ دھرمی آئیگی، وہ کہے گی کہ اصل میں آپ

پیسے بچانے کے لئے میری خواہش کو پورا نہیں کررہے ہیں۔اس لئے اس کو بتادو، میں سخی ہوں بخیل نہیں ہوں، میں تم پر خرچ کرونگا مگر جائز امور میں کروں گا، ناجائز امور میں نہیں کرونگا۔الخیر! یہ باتیں میں نے اسلئے بتادیں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم لوگوں کے اپنے گھروں میں دین سے بڑی غفلت ہورہی ہے۔دوسرے لوگ ہماری باتیں سن کر دیندار بن رہے ہیں، رسوم ورواج ختم ہورہے ہیں، شادی بیاہ کے خرچ میں احتیاط کررہے ہیں۔لیکن ہمارے یہاں بس ایک جواب ہے کہ صاحب! ہماری عورت مانتی نہیں ہے، یہ تو کوئی عذر نہیں ہے بھئی! ہم لوگوں کو ان امور کی اصلاح کرنی چاہئے، اور یاد رکھئے! گھر والوں کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خود اپنی اصلاح نہ ہوجائے، کیوں کہ اگر خود اپنے اخلاق خراب ہوں بیوی سے مطالبہ اچھے اخلاق کا کریں، اپنی زبان کڑوی ہو بیوی سے مطالبہ اچھی بولی بولنے کا کریں اور ہم ہر روز اپنے رشتہ داروں سے، نامحرموں سے ملتے رہیں اور بیوی سے مطالبہ پردہ کا کریں تو وہ ہرگز نہیں مانے گی۔وہ تو برابری کا دعویٰ کرتی ہے، وہ کہے گی کہ آپ کے لئے کوئی قانون نہیں سب قانون میرے لئے ہیں؟ اگر آپ متقی ہیں تو میرا دل آپ سے زیادہ پاک ہے۔اس لئے اپنی اصلاح سے کام شروع ہو، قوا انفسکم و اھلیکم ناراً فرمایا گیا ہے۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنا کوئی رہنما بنالے، کسی بڑے رہنما کا انتظار نہ کرے اسکے ملنے ملنے تک عمر گزر جائے گی، جب اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوجائے گا تب کوئی عالمی شیخ ملے تو اسوقت تک اپنے بننے کا وقت بھی ختم ہوجائے گا۔اسی لئے سردست جو مہیا ہے اسی پر اکتفا کرو، اسی کو اپنا شیخ بنالو، رہنما بنالو، ایسا رہنما جس کے ساتھ آپ کا تعلق صداقت و دیانت کا ہو، یہ نہیں کہ اچھے کاموں کی اطلاع کرتے رہیں اور گڑبڑ کی کوئی اطلاع نہیں۔یہ نفاق ہے اس لئے ہر چیز کی اطلاع کرو وہ دعا کریگا، کوئی تدبیر بنائے گا۔تمام مشائخ جو مخلص ہیں راتوں کو اٹھ کر اپنے مریدوں کی اصلاح کے لئے روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں تب ہی

ہمارے کام بنتے ہیں، ہمیں اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر رکھنا چاہئے اور شیخ سے تعلق صحیح رکھنا چاہئے اس زمانے میں اولاً تو ہماری اس طرف توجہ نہیں ہے اگر کسی کو ہے بھی تو رسمی قسم کی ہے۔ کیوں کہ محض کسی کو شیخ بنا رکھنا کافی نہیں، مجالس میں پابندی سے جاؤ، بات غور سے سنو اور نوٹ کرنے کا اہتمام کرو، تدبیر سے کام نہ بنے تو شیخ سے مشورہ کرو کہ کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی تک یہ صفت پیدا نہیں ہوئی، ابھی تک اصلاح نہیں ہوئی۔ یہ سلسلہ اطلاع حالات اور اتباعِ ہدایات کا جاری رہے گا تو ایک دن منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے یعنی تقوی اللہ اور تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے گی۔

بس اب دعا کر لیجئے کہ اللہ پاک ہم سب کو اپنی مرضیات کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(اداریہ اپریل ۱۳ء)

اِدھر بھی تو دیکھئے!

ملک میں لڑکیوں کی عصمت دری اور بے آبروئی کا مسئلہ اخبارات کی سرخیوں کا موضوع بنا ہوا ہے کہ نوجوان صنفِ نازک کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اب تو معصوم بچیاں بھی ہوس کے پجاریوں کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس مسئلے کو لے کر شدید اور طویل احتجاج کا سلسلہ بھی جاری ہے، عوامی جلسے جلوس سے لے کر وفاقی ایوانوں تک ہر طرف اسی کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ ہے بھی مسئلہ ایسا ہی اہم اور نازک! کون عقل مند عورت کی اس ذلت کو گوارا کر سکتا ہے اور کون باضمیر حیا کی اس دیوی کو لٹتا جلتا اور اُجڑتا ہوا دیکھ سکتا ہے؟ مگر میں آج آپ کو ایک دوسرا منظر دکھانا چاہتا ہوں کہ جس عورت کی عزت وعصمت کی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے خود وہ کیا کر رہی ہے؟ گذشتہ ہفتے مقامی اخبار ''منصف'' کے صفحۂ جرائم وحادثات پر پولیس کا ایک پریس نوٹ ایک برقعہ پوش لڑکی اور دو خوبرو نوجوانوں کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا، نیوز کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

''ذی شان نامی ایک نوجوان کے ساتھ ثانیہ نامی ایک لڑکی کام کرتی تھی، دونوں میں تعلقات اس قدر بڑھ گئے کہ بات معاشقے کی حد تک پہونچ گئی، ثانیہ کے والد بیرون ملک کام کرتے ہیں اور وہ خود ایونٹ مینجر کی حیثیت سے تقریبات میں کلچرل پروگراموں کا کام کرتی ہے، ایک اور لڑکی حُسنیٰ ـــــ جو شادی شدہ ہے اور اس کا شوہر بھی بیرون ملک کام کرتا ہے ـــــ کا تعلق بھی ذی شان سے ہو گیا اور حد سے بڑھ گیا، حُسنیٰ نے جب دیکھا کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے کوئی اور لڑکی بھی اس کو چاہتی ہے تو اسے اپنے عاشق کے ساتھ اس کی

شرکت گوارا نہ ہوئی اس لئے اسے راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی، ایک دن حُسنیٰ ایک منصوبے کے تحت مَلِک اور دیگر چند دوستوں کو ایک کار میں لے کر ثانیہ کے گھر پہونچی اور اسے کسی پروگرام میں ساتھ چلنے کے لئے کہا وہ تیار ہو کر ان کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوگئی، یہ لوگ سیدھے ایک ہوٹل پہونچے جہاں اطمینان سے رات کا کھانا کھایا اس کے بعد پٹرول پمپ پر رک کر گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، ساتھ ہی ایک بوتل میں بھی پٹرول لے لیا، اس کے بعد شہر سے باہر نکل کر کسی تاریک مقام پر انہوں نے گاڑی روکی، حسنیٰ کے دونوں دوستوں نے ثانیہ کے ہاتھ پیر پکڑ لئے اور حسنیٰ نے ثانیہ کے منہ میں ڈوپٹہ ٹھونس کر اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ اس کا دم نکل نہ گیا، پھر تینوں نے مل کر اس کی لاش کو جھاڑیوں میں پھینک دیا، پھر حسنیٰ نے اس پر ساتھ لایا ہوا پٹرول چھڑک کر آگ لگادی تاکہ لاش ناقابلِ شناخت ہو جائے، اس کاروائی کے بعد یہ لوگ اطمینان سے اپنے گھر لوٹ آئے، اس جگہ اتفاق سے پولیس کی گاڑی پہونچی آگ جلتی دیکھ کر پولیس والوں نے تفقد کیا، آگ بجھا کر ثانیہ کی لاش دواخانہ عثمانیہ میں منتقل کر دی''

کیا آپ کسی لڑکی —— وہ بھی تین بچوں کی ممتا سے بھرے دل والی لڑکی —— سے اس کی توقع کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں!۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ آج ہمارے معاشرہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اخبارات میں تو ایک آدھ واقعہ آجاتا ہے ورنہ یہ روز روز کے قصے ہیں، جن کو پڑھتے پڑھتے ان کی اہمیت ختم ہوگئی ہے، اب ہم ایسے واقعات پر ایک اچٹتی اور سرسری نظر ڈال کر اور ایک آدھ فقرہ کس کر آگے بڑھ جاتے ہیں، اس لئے کہ برائی شروع میں برائی محسوس ہوتی ہے پھر دھیرے دھیرے اس کی شناعت دلوں میں گھٹتی چلی جاتی ہے۔ اس واقعے کو بھی بس اس طرح دیکھ لیا اور پڑھ لیا گیا ہوگا۔

غور کرنا یہ ہے کہ یہ ایک حُسنیٰ اور ثانیہ کی بات نہیں ہے ہر گھر میں کوئی حسنیٰ کوئی ثانیہ موجود ہے، یہ ایک ذی شان اور ملک کی بات نہیں ہے ہمارے ہر گھر میں ذی شان اور ملک

موجود ہے، سوال یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کے اخلاق اس حد تک نازل کیسے ہوگئے؟ اس کے اسباب کیا ہیں اور ان کے تدارک کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟۔ ہمارے نزدیک اس کے چند واضح اسباب ہیں جن کا کوئی صاحب خبر انکار نہیں کرسکتا مثلاً:

نوجوان بیویوں کو چھوڑ کر بیرون ملک چلا جانا:

جب سے روزی روٹی کی دشواریاں دور کرنے کے لئے باپ بچوں کو چھوڑ کر یا شوہر جوان بیوی کو چھوڑ کر بیرون ملک جانے لگے ہیں تب سے ان بچوں اور بیویوں کا حال ناقابلِ بیان ہوگیا ہے، فطری بات ہے کہ شریف سے شریف عورت بھی ازدواجی رشتے کی حقیقت سے واقف ہوجانے کے بعد طویل مدت تک تقاضۂ نفس کو برداشت نہیں کرسکتی، بالخصوص کھڑی جوانی میں اور اخص الخصوص آج کے ماحول میں۔ پھر جب بھوکے کو حلال کھانا نہ ملے اور پیاسے کو حلال مشروب نہ ملے تو سوائے اس کے کہ وہ حرام تک پہونچ کر اپنی بھوک پیاس مٹائے کیا راستہ باقی رہتا ہے؟ لازماً شریف عورت گھٹ گھٹ کر دق کی مریض ہوجاتی ہے اور جنہیں شرافت کا پاس ولحاظ نہیں وہ خاندانی یا بیرونی مردوں سے دل بہلائیاں کرنے لگتی ہیں جس کا انجام بدکاری تک پہونچ جاتا ہے۔

چند دن قبل سولہ سترہ سال کا ایک نوجوان کچھ مشورہ کرنے کیلئے وقت لے کر میرے پاس آیا، مشورہ یہ تھا کہ ''ابا چودہ پندرہ برس سے باہر رہتے ہیں، دوتین سال میں ایک دفعہ آتے ہیں، والدہ شروع ہی سے چچا کے ساتھ تعلقات رکھی ہوئی ہیں، جب تک میں چھوٹا تھا صرف کھٹک ہوتی تھی اب تو یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ ان لوگوں کے تعلقات ازدواجی ہوگئے ہیں، چچا جب چاہتے ہیں آکر شب باشی کر کے چلے جاتے ہیں، والدہ بھی راضی ہیں والد بھی اپنے بھائی کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتے، اب مجھے والدین سے چچا سے اور اپنے آپ سے اس قدر نفرت ہوگئی ہے کہ کھانا پینا بھی اچھا نہیں لگتا، باربار خودکشی کر لینے کا داعیہ پیدا ہوتا رہتا ہے، ایک آدھ دفعہ کوشش بھی کیا مگر ناکام ہوگیا، ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے''؟

یہ ایک مثال ہے ان عورتوں کی بے راہ روی اور بدکرداری کی جن کے شوہر چار ٹکوں کی

کمائی کے لئے اپنے گھر سے بے خبر دوسرے ملکوں میں پڑے ہوئے ہیں! یہ خلیج میں پڑے ہوئے لوگ تو خیر پھر بھی کبھی کبھی گھر کا چکر لگا جاتے ہیں جو لوگ مغربی ملکوں میں غیر قانونی طور پر برسوں پڑے رہتے ہیں وہ ڈالرز تو خوب کما رہے ہیں مگر انہی ڈالرز کے بل بوتے پر وہاں شوہر غیر عورتوں میں مست ہے اور یہاں بیوی غیر مردوں میں مگن! حالانکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کی بے حیائی و بدکرداری کو گوارا کر لینے والے کو ''دیوث'' کا خطاب دے کر اس پر لعنت فرمائی ہے۔ واقعی جس عورت کے سر پر شوہر کا سائبان یا باپ جیسا نگہبان نہ ہو، وہ شہوت کے بھوکے بھیڑیوں سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتی، شاید اسی لئے اسلام نے بے جوڑ رہنے والے مرد اور عورت کو ملفس و محتاج قرار دیا ہے۔

باپ کی نگرانی اور تربیت سے بچوں کا محروم ہونا:

اس کا سبب بھی اکثر بیرون ملک ملازمت ہے، اگرچہ باپ انہی بیوی بچوں کی راحت و آرام خوشحالی اور اعلیٰ تعلیم کو مقصود بنا کر پردیس کی کلفتیں اور صعوبتیں برداشت کرتا ہے مگر اس کا منفی اور مضر پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ یہاں بچے اسی مال کے غرہ میں آ کر آوارہ گردی کر رہے ہیں، ضدی ہو رہے ہیں، یہ لوگ ماں کو خادمہ سے زیادہ نہیں سمجھتے، تعلیم سے قطعاً دلچسپی نہیں لیتے، موٹر سائیکلوں پر یاروں دوستوں کے گروہ میں مٹر گشت کرنے ہوٹلوں میں کھانے، سگریٹ نوشی، نشہ خوری، فلم بینی اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں ٹائم پاس کر رہے ہیں، انہیں تہذیب و اخلاق کا پتہ نہیں، بڑوں چھوٹوں کی تمیز نہیں، دین و ایمان کا احساس نہیں، بس انہیں پیسہ چاہیے اور دوست احباب کا مجمع! یہ لڑکوں کا حال ہے اور لڑکیاں بھی ان امور میں ان سے کچھ کم نہیں ہیں، کالجس میں تعلیم حاصل کرنے کے نام پر جو حرکات کر رہی ہیں اور جن ناقابل تصور اعمال کی مرتکب ہو رہی ہیں ان کی تفصیل کیلئے قلم کو یارائے تحریر نہیں ہے، ان لڑکیوں کو اس قدر بے محابانہ و بے باکانہ حالت میں دیکھ کر یہ ماننا مشکل ہے کہ ان کا کسی مسلم گھرانے سے تعلق ہے۔ کالج میں زیر تعلیم ایک نوجوان کا کہنا ہے کہ ''ہم

اگر لڑکیوں سے کچھ احتیاط بھی کرنا چاہیں تو وہ خود ہمیں چھیڑتی ہیں، اور بے اعتنائی کریں تو موضوع مذاق بنا کر ہمارا جینا مشکل کر دیتی ہیں" کسی نوجوان کا کہنا ہے کہ " کالجس میں مسلم لڑکیوں کی جو صورتحال ہم دیکھ رہے ہیں اس کی روشنی میں اپنی بیوی بنانے کے لئے کسی لڑکی پر یہ اعتماد کرنا مشکل ہے کہ وہ کسی سے دوستی کی ہوئی نہیں"

دو ہی چار دن قبل کی بات ہے کہ ایک صاحب نے بتلایا "ان کے بچے نے باہر سے آ کر جب اپنی شادی کی تو سنت کا پورا اہتمام کیا، لڑکی والوں پر ایک روپیہ کا بوجھ نہیں ڈالا، سب کچھ ساز و سامان اپنے خرچ سے تیار کیا، مہر نقد ادا کیا، کیوں کہ وہ اچھی زندگی اور اچھی اولاد کا متمنی تھا مگر اس وقت اس کا دل ٹوٹ کے رہ گیا جب شادی ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ بیوی کو پندرہ دن کا حمل ہے، اس نے اقرار کیا کہ کلاس فیلو سے اس کے تعلقات تھے، اب ان صاحب کا بچہ کسی قیمت پر اس لڑکی کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے تیار نہیں ہے، ادھر لڑکی کے والدین بھی حیرت زدہ اور پریشان ہیں کہ ہماری بچی نے ایسی حرکت کیسے کی اور کب کی؟"

تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں کی بے حسی اور غیرت ملی سے محرومی:

آج ہمارے دانشوروں کو ملت سے ہمدردی اور ان کی ترقی و خوشحالی کے دعوے تو بہت ہیں اور کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں مگر افسوس کہ وہ انہی تعلیم گاہوں کے تربیت یافتہ ہیں جہاں تعلیم کے عمدہ ہونے کے لئے اختلاطِ جنسی، بے حجابی و بے باکی اور دین بیزاری کو لازم سمجھا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پرائمری سے لے کر ڈگری تک تمام مراحل تعلیم میں دین و ایمان اور اخلاق و تہذیب کا کوئی گذر نہیں ہے۔ بلکہ کالج کلچر میں تو ایمان و اخلاق کا تذکرہ بھی انہیں اچھا نہیں لگتا، وہ ایسی باتوں کو دقیانوسی اور گذرے ہوئے وقتوں کی باتیں سمجھتے ہیں، ایسے مشورے دینے والوں کو بیک بینی و دو گوش برطرف کر دینے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، اس لئے اب تدریس کا پیشہ تہذیب و تربیت کا ذریعہ ہونے کے بجائے دولت اندوزی کا

وسیلہ بن کر رہ گیا ہے، مینجمنٹ کا مطمح نظر آمدنی اور عملے کا مبلغ طلب آمدنی! قوم کے بچے بد تہذیبی کی کس جہنم میں جاتے ہیں ان کو اس سے کوئی مطلب نہیں، بلکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان تعلیم گاہوں میں اگر کوئی دین پسند اور باحیا طالب علم پہونچ جاتا ہے تو وہ ساتھیوں ہی کا نہیں لکچررز اور مینجمنٹ کا بھی اس وقت تک معتوب رہتا ہے جب تک کہ کامن کلچر کا حصہ نہیں بن جاتا، اس سلسلے میں بعض باخبر دانشوروں ہی سے میں نے سنا ہے کہ غیر مسلم کالجس کا تہذیبی ماحول مسلم کالجس کے ماحول سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے، جبکہ جہاں تک تعلیم گاہوں کو بطور مشن اور تحریک کے استعمال کرنے کا معاملہ ہے تو اس وقت سوائے مسلمانوں کے تمام مذاہب والے اس میں سرگرم عمل ہیں، مسلمانوں کو ایسا کرنے میں شرم سی محسوس ہوتی ہے یا آمدنی متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادھر کچھ عرصے سے عصری تعلیم گاہوں کو اسلامیانے کا شعور بیدار ہو رہا اور احساس جاگ رہا ہے مگر اس کام میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جو یا تو متشدد غیر مقلد ہیں یا پھر اسلام کا ناقص تصور رکھنے والے مخلص ہیں۔

گھروں میں حجابِ شرعی کا اہتمام نہ ہونا:

آج کل والدین عام طور سے دینی احکام اور شرعی مطالبات سے بالکل بے خبر ہیں، گھروں میں نہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ذکر ہے نہ صحابہؓ وصحابیاتؓ اور اسلافِ امت کے واقعات کا مذاکرہ! بحیثیت مسلمان اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ، اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب کے کیا حقوق ہیں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ عقیدۂ آخرت کیا مطالبہ کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے مسلمان گھرانوں میں جواب تو کیا مل سکتے ہیں ان سوالات کیلئے بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس لئے حلال وحرام کی تمیز پاکی ناپاکی کا فرق، ایمانداری و بے ایمانی کی اہمیت حتی کہ توحید و شرک اور ایمان وکفر کے مفاہیم سے بھی نابلد ہیں، نہ قرآن صحیح پڑھنا آتا ہے نہ ضروریاتِ دین سے آشنائی

ہوتی ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ گھروں میں شرعی پردہ کا اہتمام بھی نہیں ہے، رسمی پردہ تو ہے وہ بھی دیندار کہلائے جانے والے گھرانوں میں، یعنی باہر نکلتے وقت با حجاب ہوتی ہیں، باقی چچازاد، پھوپی زاد، خالہ زاد، ماموں زاد بھائی بہنوں کے درمیان اسی طرح سالی اور بہنوئی کے درمیان نیز بھاوج اور دیور کے درمیان، ممانی اور بھانجوں کے درمیان، خالو اور بھانجیوں کے درمیان شریعت نے پردہ کا جو حکم دیا ہے، دینداروں کے ہاں بھی اس کا اہتمام نہیں ہے۔جس کی وجہ سے گھروں کا ماحول بد سے بدتر ہوتا جارہا ہے۔حالانکہ حجاب شرعی کے احکامات باقاعدہ قرآن کریم میں نازل ہوئے، احادیثِ صحیحہ میں موجود ہیں، سلف صالحین بلکہ خود ہمارے گھرانوں کے بڑوں بزرگوں میں اس کا نہایت اہتمام تھا،مگر آج یہ احکامات تہذیب جدید کی نذر ہو گئے مسلمانوں کی تہذیب کی جو صورتحال ہوتی جارہی ہے وہ مغرب کی حیوانیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

ایک نوجوان کا کہنا ہے کہ انہیں تعلیمی سلسلہ میں دوسرے شہر جانا پڑا، انہوں نے وہاں مسجد کا حجرہ کرایہ پر لے لیا اور تعلیم شروع کردی، چچا جو بیرون ملک رہتے ہیں انہیں پتہ چلا تو انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ شہر میں میرا گھر رہتے ہوئے بھتیجا مسجد کے حجرہ میں کیوں رہ رہا ہے، میرے گھر پر کیوں نہیں رہتا، ایسی غیریت کیوں برت رہا ہے؟ چچا کی ناراضگی دور کرنے کے لئے اس کے والد نے چچا کے گھر منتقل کردیا، اس کا بیان ہے کہ اب میرے گھر پر رہنے کے بھروسے پر چچا نے اپنے بچے کو ہاسٹل میں شریک کردیا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گرما کی سخت رات تھی میں پیاس کی شدت کی وجہ سے نیند سے بیدار ہوا، پانی پینے کے لئے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا تو چچی دالان میں سو رہی تھیں، میرے جذبات قابو سے باہر ہو گئے میں ان کی چارپائی پر لیٹ گیا، وہ بیدار ہوئیں تو گھونسے اور لاتیں مار مار کر گھر سے باہر کردیا، کہنے لگا: میں تو نمازوں کا پابند تھا اور نیک زندگی کا عادی تھا مگر چچا کی اس مہربانی نے مجھے ذلیل ورسوا کردیا کہ اب اپنی موت کو ڈھونڈھتا اور مخلوق سے منھ چھپاتا پھر رہا ہوں۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ پردے کے معاملے میں اچھے

خاصے لوگوں کو توجہ نہیں ہے بلکہ توجہ دلانے والا ان کو دشمن سا محسوس ہوتا ہے، آخر اللہ رسول کی خیر خواہیوں پر اعتماد نہ کر کے اپنی پاکبازیوں پر ناز کرنے والوں کا یہی حشر نہ ہوتو اور کیا ہو؟

موبائیل فون اور مخرب اخلاق آلات کا شیوع:

ایک اہم اور بڑا سبب جدید مصنوعات کا تیزی سے پھیلنا بھی ہے، موبائیل، انٹرنیٹ کی مختلف سائٹس، اور دن بہ دن متعارف ہوتے جارہے آلاتِ لہوولعب نے صرف تہذیب اسلامی ہی پر اثر نہیں ڈالا شرافتِ انسانی کا بھی حلیہ بگاڑ دیا ہے، جاسوسی ڈراموں اور بلو فلموں کے ذریعے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کا رجحان دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے، اور جنسی بے راہ روی روز افزوں ہے، ان آلات کے ذریعے گھر بیٹھے دنیا بھر سے روابط کا قیام اور تبادلہ خیالات وجذبات عام عادت بن گئی ہے، صلحاء وشرفاء بھی ڈھیرے ڈھیرے ایسی خرافات وواہیات میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں، نیز ان آلات کے بے محل استعمال سے آپسی تعلقات اور ازدواجی اعتماد مجروح ہوکر ناخوشگواری وطلاق تک نوبتیں پہونچ رہی ہیں، صاحبِ اولاد عورتیں تک موبائیل فون اور چیاٹینگ وغیرہ کے ذریعہ اجنبی مردوں کے ساتھ معاشقے میں مشغول ہیں جس کے بھیانک نتائج آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔

یہ اور ان جیسے مزید اسباب ہیں جو ادنیٰ تأمل سے سمجھ میں آسکتے ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان ہر پہلو اور ہر زاویئے سے ان خوفناک اور ناقابل یقین مگر سماج میں تیزی سے بڑھتے ہوئے احوال کو بدلنے کے لئے غور وفکر کریں، سماج کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے ان اسباب کے تدارک کے لئے آگے آئیں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کریں، علماء اپنا فریضہ ادا کریں، سماجی خدمت گذار اپنی ذمہ داری نبھائیں، سیاسی قائدین اپنا حصہ ادا کریں، تعلیمی ادارے اپنا فرض ادا کریں، سب مل کر ملت اسلام کو اسلام پر جمے رہنے اور اسی پر مرنے میں مدد فراہم کریں، تب جا کر ہم کچھ اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوری ملت کی حفاظت فرمائے۔ آمین (اداریہ مئی ۱۳ء)

اختلاف سے کہاں مفر ہے؟

اتحاد کے داعیوں سے مودبانہ التماس

اختلاف انسانی فطرت کا جزولاینفک ہے، زبانوں میں اختلاف ـــــ، زمانوں میں اختلاف، شکل وشباہت میں اختلاف، قدوقامت میں اختلاف، رنگ ونسل میں اختلاف، ہر ہر چیز میں اختلاف ہے، بلکہ یہ اختلاف حق تعالیٰ کی حکمت نے خود رکھا ہے اور اسے اپنی قدرت کی علامت بتایا ہے، ارشادِ ربانی ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ارض وسماء کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ اختلاف اگر وسعت وسہولت اور بندوں کی ضرورت وراحت کا سبب ہے تو وہ قدرتِ خداوندی اور رحمتِ الٰہی کا مظہر ہے۔ یہ اختلاف جہاں غیر اختیاری امور میں تکوینی طور پر پایا جاتا ہے وہیں اختیاری امور میں بھی تشریعی طور پر موجود ہوتا ہے، بلکہ غیر اختیاری اختلاف سے یہ اختیاری اختلاف کہیں زیادہ ہوتا ہے، پھر اختلاف علومِ دنیویہ وعقلیہ میں جس طرح مسلم ہے اسی طرح علوم دینیہ ونقلیہ میں بھی معتبر ومستند ہے، کیوں کہ کوئی نقل عقل سے مستغنی نہیں ہوسکتی اور کوئی عقل نقل سے بے نیاز نہیں ہوسکتی، دونوں کا جوڑ ہے بلکہ نقل کی مشروعیت ہی عقل والوں کے لئے ہوئی ہے، مجانین اس کے مخاطب نہیں ہیں۔

اگر کوئی شخص نقل صحیح کو کافی سمجھ لے، اس میں عقل کے استعمال کو ضروری نہ جانے تو اس کا صحیح ہونا خود ذرائع عقل پر موقوف ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جس کے انتہائی معتبر اور قدیم نوکر نے اطلاع دی کہ آپ کی بیوی بیوہ ہوگئی ہیں تو یہ شخص سر پکڑ کر بیٹھ

گیا اور غم سے نڈھال اور اشکبار ہو گیا، کسی نے توجہ دلائی کہ آپ کے ہوتے ہوئے آپ کی بیوی بیوہ کیوں کر ہو سکتی ہے تو موصوف فرمانے لگے وہ تو صحیح ہے مگر ہمارا یہ نوکر کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور کبھی ہم سے بے وفائی نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کا اس نامعقول خبر کو محض صحتِ نقل کی بنیاد پر اختیار کر کے مغموم ومحزون ہونا عقل وشعور سے محرومی اور نقل کی مخاطبت سے نااہلی کی دلیل ہے۔ اسی طرح حقائق کی تلاش ــــ بالخصوص مغیبات وایمانیات ــــ میں عقلِ محض پر بھروسہ کافی نہیں نقلِ صحیح پر اعتماد بھی ضروری ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ ایک بچے کو اپنے والد کا والد ہونا اگر کسی عقلی دلیل سے معلوم کرنا ہے تو اس کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی، جو صورت بھی اختیار کی جائے گی وہ مشکوک ومشتبہ ہی ہوگی سوائے اس کے کہ وہ نقل صحیح پر اعتماد کر لے'' یعنی ماں کے یا دائی کے یا اہلِ محلہ واعزہ کے یہ کہنے کو کہ تم فلاں صاحب ہی کی اولاد ہو صحیح مان کر تسلیم کر لے۔

مختصر یہ کہ عقل اور نقل دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، ادھر یہ بھی طے ہے کہ عقل اور عقل میں کافی تفاوت ہوتا ہے، یکسانیت نہیں ہوتی، چنانچہ احکام نقلیہ کے سمجھنے میں خود اسلام کے عہد اول یعنی عہد صحابہؓ میں بھی اختلاف ہوا، بلکہ نبی کی موجودگی میں بھی ہوا، یہ اختلاف اگر قدر تحمل سے زیادہ ہو یعنی حق وباطل یا حلال وحرام تک پہونچ گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نشاندہی فرماتے ہوئے ان کے علم کو درست کیا اور حق کو حق، باطل کو باطل بتلا دیا۔ مثلاً ایک صحابیؓ کے احکام صوم کے سلسلہ میں نص قرآنی حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ سے معروف دھاگوں کے رنگ مراد لینے کو غلط قرار دیتے ہوئے صحیح مفہوم کی نشاندہی فرما دی، اور اگر یہ اختلاف قابلِ تحمل تھا، اس سے امت کو سہولت وراحت مل سکتی تھی مگر اس کی وجہ سے مقاصد شریعت متاثر ہونے کا اندیشہ نہیں تھا تو آپ نے اس اختلاف میں کسی طرف کی تصویب اور طرفِ آخر کی تغلیط کو ضروری نہ سمجھا، کیونکہ اس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ تھیں، اور وہ اختلاف نظامِ تکوینی کا ایک حصہ تھا،

جیسے غزوۂ اُحد میں درہ پر کھڑے کئے گئے صحابہ کرامؓ کا اختلاف کہ ان لوگوں کے درمیان حکمِ نبی کی مراد سمجھنے میں اختلاف ہوا اور وہ لوگ دو علاحدہ نتائج پر پہونچے اور اپنے اپنے اجتہاد پر ہی عمل کیا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانب کو غلط اور کسی کو صحیح قرار نہیں دیا، اسی طرح نمازِ مغرب ذوالحلیفہ میں پہونچ کر پڑھنے کے حکم کو سمجھنے میں دو صحابہؓ کے درمیان اختلاف ہوا اور دونوں نے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کیا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں سے کسی کی بھی تصویب و تغلیط نہیں فرمائی، کیوں کہ یہ ایسا ناگزیر اختلاف تھا کہ اس سے مفر نہ تھا۔

بلکہ اس سے بھی آگے دیکھئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے بعد دین کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے اختلافات کی صحابہ کرامؓ کو خبر دی تو اس وقت نہ ان کی مذمت فرمائی اور نہ انہیں ایسا نہ ہونے دینے کا حکم فرمایا بلکہ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ کے مطابق اکابر صحابہؓ —— خلفاء راشدین —— پر اعتماد کر کے ان کی اتباع کر لینے کا حکم دیا، ظاہر ہے کہ یہ اختلاف کے ناگزیر اور فطری حصے کا تحمل ہی تو تھا، کیوں کہ ایسا اختلاف امت کے حق میں یُسر و وسعت کا سبب تو ہوسکتا ہے مگر مقاصد کی خلاف ورزی کا ذریعہ نہیں بن پاتا۔ اس سلسلہ میں کتبِ احادیث میں بہت مثالیں ملتی ہیں، ان سب کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، امت کے اسلاف واخلاف نے اس موضوع پر اس قدر لکھ دیا ہے کہ مزید اضافے کی کوئی ضرورت نہیں، یہاں صرف یہ یاددہانی کرائی جارہی ہے کہ اخلاص پر مبنی اختلاف میں (جو مقاصد کو پانے کی جدوجہد میں پیدا ہوجاتا ہے) تشدد و تعصب اور تنگی و زبردستی کا کوئی جواز نہیں ہے، اور اسی وجہ سے عہد صحابہؓ میں اختلاف تو بہت ملے گا مگر اس کی وجہ سے افتراق کہیں نظر نہ آئے گا۔

وفاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پچیس برس بعد جب قصاصِ عثمانی کے مسئلے کو لیکر دو جلیل القدر صحابہ کی آراء میں اختلاف ہوا تو وہ اختلاف بھی اگرچہ اخلاص و للٰہیت کی مضبوط بنیادوں پر ہوا تھا اور اسی وجہ سے قتال تک پہونچنے کے باوجود ان میں بغض وعناد پیدا نہ کرسکا تھا مگر

بد قسمتی سے اس وقت تک ہوا و ہوس اغراض نفسانی کے پروردوں کا ایک ٹولہ تیار ہو گیا تھا جس نے اس مخلصانہ و مومنانہ اختلاف کی آڑ میں دنی اغراض کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلام میں سب سے پہلے نفسانی و شیطانی اختلاف کی بنیاد ڈالی، اور جو رفض و خروج کے دو مکروہ و منحوس شکلوں میں ڈھل کر ظاہر ہوئی، صحابہؓ تو سب کے سب اس سے بری ہیں کہ وہ یا تو اس میں مبتلا ہی نہ ہوئے تھے یا کچھ دیر کیلئے التباس میں پڑ گئے تھے، باقی ان منافقوں نے یہیں سے فرقہ بندی کرنے اور اختلاف کو انتشار بنانے میں کامیابی حاصل کی، اس وقت سے اب تک جتنے فرقے اسلام کی تاریخ میں دکھائی دیتے ہیں ان سب کا سلسلۂ نسب انہی اجداد منافقت و مخالفت سے جا ملتا ہے، یعنی ان کے افکار و نظریات یا روافض سے مشابہ ہوتے ہیں یا خوارج سے۔

خوارج اعمال و اخلاق میں مضبوط مگر فہم نصوص میں کوتاہ تھے، اور روافض علم و عمل دونوں سے کورے اور مسلمانوں کے بدخواہ تھے، ہر دو کا بنیادی مشن شیرازۂ امت کو بکھیرنا اور اتحادِ امت کو تار تار کرنا تھا اسی طرح آج بھی ان کے پیروکار اسی ڈگر پر چل رہے ہیں، اور کمال یہ ہے کہ اتحاد کا نعرہ لگا کر اتحادِ امت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، فرق صرف اس قدر ہے کہ خوارج کے یادگار علمی موشگافیاں اور دین میں احتمال و اشکال پیدا کر کے امت میں انتشار پھیلا رہے ہیں اور روافض کے پیروکار عملی سازشوں اور بغلی گھونسوں کے ذریعہ امت کا ناسور بنے ہوئے اور اُمت کشی میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اتحاد اتحاد کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں اور بڑے حسین عنوانات و تعبیرات کا سہارا لیتے ہیں، مگر اتحاد سے ان کی مراد اپنی اپنی تحقیق اور رائے کو ترک کر کے ان کے خیال کو قبول کر لینا یا ان کی جماعت میں شامل ہو جانا ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف ہی ختم کر دیا جائے، جبکہ ایسا ہو نہیں سکتا اور اگر ہو جائے تو اس کا نام اتحاد نہیں ہوتا وحدت ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اتحاد کے لئے اختلاف ضروری ہے، اتحاد میں ہر فریق اپنی فرعی شناخت کو محفوظ رکھتے ہوئے اصولی طور پر

ایک دوسرے سے جُڑ جاتا ہے جب کہ وحدت کو اتحاد کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ خود ایک اکائی اور اصل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ دین نام ہے نقل کو عقل سے یا روایت کو درایت کی روشنی میں قبول کرنے کا، پس نقل یعنی دین واحد ہونے کے باوجود عقل یعنی فہمِ دین میں تفاوت ہونے کی وجہ سے امورِ دنیا کی طرح امورِ دین میں بھی اختلاف ایک ناگزیر امر ہے، اور جب تک وہ اخلاص اور دیانت پر مبنی ہے سراپا رحمت اور فضل خداوندی ہے، نیز یہ کہ جب تک دین میں اس کی گنجائش تسلیم نہیں کی جائے گی اتحادِ ملت کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ایسا ہونا فطرتاً محال ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں میں اسی وقت اتحاد ہوا جب ان کے اختلاف کو تسلیم کیا گیا اور جب کبھی حق اختلاف کا انکار کیا گیا ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ اس لئے اتحاد کے داعیوں اور ملت کے دانشوروں سے گذارش ہے کہ وہ اختلاف اور مخالفت وعناد کے درمیان فرق کو محسوس کریں کہ پہلا محمود ہے دوسرا مذموم! محمود کو اس کا حق ملنا چاہیے کہ آپس میں اس کا تحمل کیا جائے اور مذموم کو اس کا حق ملنا چاہیے کہ دلوں سے نکال باہر کیا جائے ورنہ جس اتحاد کی آپ دعوت دیتے ہیں کہ سب لوگ ایک ہی مسلک پر جمع ہو جائیں سو وہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ واللہ اعلم

(اداریہ جون ۱۳ء)

چند معروضات
علماءِ کرام کی خدمت میں
نہایت ادب واحترام کے ساتھ!*

علماءِ کرام! آپ کا بہت اونچا مقام ہے، اللہ پاک نے آپ کو ملتِ اسلامیہ کی کشتیٔ ہدایت کا ناخدا اور نسلوں کی صحیح راہنمائی کے لئے راہ نما بنایا ہے، جو کام ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قبل انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لیا جاتا تھا وہ ان کے بعد علماء کے ذریعہ لیا جارہا ہے اور لیا جاتا رہے گا۔ علم اور علماء کے فضائل میں بے شمار احادیث موجود ہیں اور آپ کے علم میں ہیں، یہاں صرف دو حدیثوں کا مذاکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امام احمدؒ نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علماء کے بارے میں ارشاد فرمایا: ان مثل العلماء فی الارض کمثل النجوم فی السماء یهتدی به فی ظلمات البر والبحر فاذا انطمست النجوم اوشک ان تضل الهداة۔ (مسند احمد: ۲/ ۱۵۷) زمین پر علماء کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان پر ستارے، جن کے ذریعہ بحر و بر کے اندھیروں میں روشنی حاصل کی جاتی ہے، جب تارے ڈوب جاتے ہیں تو راہ گیروں کے بھٹک جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

علماءِ کرام غور فرمائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ارشادِ مبارک میں کس قدر جامعیت کے ساتھ علماءِ امت کے مقام بلند کی تعریف فرمائی ہے اور ساتھ ہی ان کی نازک اور حساس ذمہ داری کی جانب بھی کس قدر لطیف اشارہ فرمادیا ہے۔ یعنی علماء کی بلندیٔ مقام

کا حال تو یہ ہے کہ گویا وہ آسمان کے ستارے ہیں اور منصب کی نوعیت یہ ہے کہ ان کے علم وعمل کی روشنی عوام الناس کے جہل کی تاریکیوں کو کافور کر دیتی ہے، نیز جس طرح عرب کے لوگ خشکی اور تری کے سفروں میں آسمان کے روشن ستاروں کی مدد سے اپنی منزلوں کے راستے پہچان لیتے تھے اسی طرح عامۂ مسلمین اُخروی نجات وکامیابی کی منزلیں علماءِ دین کی روشنی وراہنمائی ہی میں طے کر پاتے ہیں، حدیث کے آخر میں یہ وضاحت بھی فرمادی کہ اگر ستارے ڈوب جائیں گے یعنی علماءِ کرام بگڑ جائیں گے تو پھر پوری امت بے راہ اور بے یار ومددگار ہو کر رہ جائے گی۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابودرداءؓ سے علماء کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب۔(ترمذی:۴/۳۱۲) بے شک عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی کہ چودھویں رات کے چاند کو تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے۔

اس روایت میں بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی حسین انداز میں علماءِ اسلام کو متنبہ فرمایا ہے کہ ان کا خود روشن ہونا کافی نہیں ہے، ان کی خصوصیت تو چودھویں کے چاند کی طرح اپنی چمک سے عالم کو منور اور روشن کر دینے کی ہونی چاہئے۔

سبحان اللہ! اگر انہی دو روایات پر ہم بار بار غور کر لیں تو ہمیں جہاں اپنے مرتبۂ بلند کا اندازہ ہوگا وہیں اپنی ذمہ داریوں کی نزاکت کا پتہ بھی چل جائے گا۔اللہ تعالی اپنے فضل سے ہمیں اپنے نبی کی ان توقعات کو پورا کرنے والے علماءِ کرام میں شامل فرمائے۔آمین

قارئینِ کرام! جب ہم اپنے اکابر پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کی روشن وتابناک زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے اندر اپنی ذات کے سدھار ونکھار کی فکروں کے علاوہ امت کی ہدایت ونجات کا درد وغم بھی نظر آتا ہے، آہِ سحر گاہی کے ساتھ بصیرتِ درس گاہی بھی دکھائی دیتی ہے، وہ ایک طرف شب بیدار اور تہجد گذار تھے تو دوسری جانب علم

وتحقیق کے بحر ناپیدا کنار بھی تھے، وہ عابد تھے تو داعی ومبلغ بھی تھے، مختصر یہ کہ رھبان فی اللیل بھی تھے فرسان فی النھار بھی تھے۔ بالخصوص ہمارے اکابر علماءِ دیوبند کی زندگیاں قریب العہد ہونے کی وجہ سے ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح عیاں اور روزِ روشن کی طرح تاباں ہیں۔ یہ حضرات ذکر وشغل اور اوراد ووظائف کی حد درجہ پابندی اور تصوف و سلوک کی مستی ولطف اندوزی کے دلدادہ ہونے کے باوجود علوم اسلامیہ تفسیر وتحدیث، فقہ و فتاویٰ، بلاغت وادب، تاریخ وسیر حتی کہ فلسفہ ومنطق میں بھی کسی سے کم نہ تھے اور کسی کے آگے خم بھی نہ تھے۔ یہی نہیں کہ وہ کسی جگہ بیٹھ کر چین سے حفاظتِ دین کی خدمات انجام دے رہے ہوں بلکہ آگے بڑھ کر اشاعتِ دین کا فریضہ بھی پوری ذمہ داری سے ادا کر رہے ہوتے تھے۔ مدارسِ دینیہ کا جال پھیلانے کی بات ہو یا دعوت وتبلیغ کی عالم گیر تحریک کا مسئلہ، تزکیۂ نفس وتصفیۂ باطن کا کام ہو یا فرقِ ضالہ وافکارِ باطلہ کے تعاقب وتردید کی جدوجہد، وطن عزیز کو بیرونی دشمنوں سے آزاد کرانے کی جنگ ہو یا ملک کے باشندگان کو حکمرانوں سے حقوق دلوانے اور ان کی نادانیوں سے بچانے کی ضرورت! جس میدان پر نظر ڈالو اور جس طرف پلٹ کے دیکھو بلا مبالغہ آپ کو ہر میدان کی صفِ اوّل میں علماءِ دیوبند ہی نظر آئیں گے۔ ہمارے اسلاف نے امت کے دین کی فکریں بھی اوڑھیں اور ان کی دنیا کے غم بھی کھائے تب کہیں جا کر ہم اس ملک میں اپنے دین وایمان اور مساجد ومراکزِ اسلامیہ کی سلامتی کے ساتھ جینے کا پھل کھا رہے ہیں۔ ورنہ یہ ملک جن بیرونی واندرونی سازشوں کا شکار تھا اور اب تک ہے، اگر اسلافِ کرام کی بصیرت ودور اندیشی اور حکمت و معاملہ فہمی نیز ایثار وقربانی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہندوستانی مسلمانوں کے شاملِ حال نہ رہتی تو ہمارا دین وایمان تو بڑی بات ہے جسم وجان کا تحفظ بھی ممکن نہ ہوتا۔ تقبل اللہ اعمالھم وکثر امثالھم وجزاھم عنا خیر الجزاء واحسنھا

علماءِ ذی احترام! یہ ان کا کام تھا اور اب ہماری باری ہے، مغرب کا جبر واستبداد،

امریکہ کی بُری نظریں اور ہندوستان کی بدلتی ہوئی قدریں مسلمانانِ ہند کی جانب اٹھ رہی ہیں اور اسرائیل کے دستِ خونیں اس ملک کی طرف بڑھ رہے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کا سکون مغربی آقاؤں کے سکون کو غارت کر رہا ہے، اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آزادی دشمنانِ اسلام کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ ہمارے حکمراں اسرائیل و امریکہ کی کاسہ لیسی ڈھکے چھپے تو پہلے ہی سے کر رہے تھے اب تو اخبارات مشترک منصوبہ بندی کی خبریں بھی دے رہے ہیں، آئے دن نئے نئے قوانین بنائے جارہے ہیں، کبھی یکساں سول کوڈ کی بات ہے تو کبھی وقف بورڈ میں ترمیم کی وکالت! کبھی دینی مدرسہ بورڈ کی تجویز ہے تو کبھی رائٹ ٹو ایجوکیشن کی تحریک! ظاہر ہے کہ یہ اور ان جیسے مسائل کا تعلق مسلم امت سے ہے اور امت کو ان تجاویز کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حالات سے باخبر رہنا اور قانونی و جمہوری جدوجہد جاری رکھنا ہمارا آئینی حق اور اسلامی فرض ہے۔

ملت کے مسائل کا یہ خارجی رُخ ہے، اس کا داخلی رُخ بھی ہے، جو اس سے کچھ کم اہم نہیں ہے، وہ ہمارے درمیان ہمارے دشمنوں کے رحم وکرم پر پنپ رہے اور دولت ودھن کی بیساکھیوں پر بڑھ رہے فتنے ہیں، قادیانیت وعیسائیت، انکارِ حدیث وانکارِ تقلید، شیعیت وبریلویت جیسی مختلف گمراہیاں پھر ان سے جنم لینے والے تازہ بہ تازہ فرقے اور حدیث الوجود جماعتیں اسلاف کے مقابلے میں ہماری بے توجہی وچشم پوشی اور آرام طلبی وکم کوشی کا خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور سر چڑھ کے بول رہے ہیں، ان کے مقابلے کے لئے افسوس کہ اب ہمارے پاس نہ آہِ سحر گاہی کا سرمایہ ہے اور نہ ہی عزم وحوصلے کا متاعِ گراں مایہ! نہ تحقیق ومطالعہ کا ذوق نہ تردید ومقابلے کا شوق۔ ہاں! اس صورتحال کی خطرناکی کا احساس اور کسی مردِ غیب کے ظہور کا انتظار سب ہی کو ہے کہ ؎

مَردے از غیب بیروں آید وکارے بکند

برادرانِ گرامی! ہوسکتا ہے کہ وہ مردِ غیب ہمارے سینے میں سو رہا ہو، وہ مردِ غیب کون

ہے؟ حوصلہ و ہمت کا وفور اور خالق سے نسبت کا نور ہے، حضرت خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں ؎

رستم خفتہ ہے تو، کس بل نہیں ہے کم ترا
جاگنے کی دیر ہے، پھر ہے وہی دم خم ترا
یہ اگر ہو جائے زائل نیند کا عالم ترا
چار سو دنیا میں لہرانے لگے پرچم ترا

کہتے ہیں کہ انگریزوں کے ہاتھ اسپین کا سودا کر لینے والے آخری مسلم تاجدار جب اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ ملک بدر ہو رہے تھے تو ایک پہاڑی پر سے اپنے محل کی طرف دیکھ کر زار و قطار رونے لگے، ان کی والدہ جو اپنے بیٹے کی سہل انگاری و سہولت پسندی سے سخت ناراض تھیں اس کا رونا دیکھ کر فرمانے لگیں:

''بیٹا! تو نے جب مردوں کی طرح دشمن کا مقابلہ نہیں کیا تو اب عورتوں کی طرح رونے سے کیا فائدہ؟''

بہر حال! ہندوستانی مسلمانوں کو آج فتنوں کے ابھرنے پر شکوہ و شکایت اور رنج و ملال سے کہیں زیادہ ہمارے حوصلہ و ہمت اور ہمارے عزم و حرکت کی ضرورت ہے۔ الحمدللہ! ہمارے علماء میں بے پناہ صلاحیتیں اور غیر معمولی قوتِ عمل موجود ہے جو اس گئے گذرے زمانے میں اور بہت کوتاہیوں کے باوجود بسا غنیمت ہے، بلکہ معاصر تحریکوں میں بھی کم یاب ہے مگر مشکل یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے اکثر جگہوں پر یہ صلاحیتیں باہمی رنجشوں اور آپسی مخاصمتوں کی نذر ہو جا رہی ہیں۔ جماعتوں میں سے جماعتیں بن رہی ہیں، مدرسوں سے مدرسے نکل رہے ہیں، کام کام سے ٹکرا رہا ہے، افراد افراد سے متصادم ہیں، اس نفسا نفسی اور کشاکشی نے ہمارے شیرازۂ اتحاد کو بکھیر دیا ہے، جو وقت مطالعے اور تحقیق میں لگنا چاہیے تھا، وہ تذکروں اور تبصروں میں لگ رہا ہے، جو صلاحیت امت کی خدمت میں صرف ہو سکتی تھی وہ ساتھیوں کو کمزور کرنے میں کھپ رہی ہے۔ شہروں سے لے کر قصبوں

تک خدامِ دین کے درمیان نااتفاقیوں اور تلخیوں کی اطلاعات ہیں، یہ اور بات ہے کہ کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ اور کہیں حلم ووقار کے پردوں میں مستور ہے تو کہیں نادانی و بے صبری کے ہاتھوں میں مجبور!

اس لئے سب سے پہلے ہم کو حلم وتحمل، عفو ودرگذر اور صبر وشکیب کی صفات سے متصف رہنے کی عادت ڈال لینا ہوگا، یہ صحیح ہے کہ سب کے خیال وآراء اور سب کے مزاج ومذاق ایک نہیں ہوتے لیکن ہم سب کا مسلک ایک ہے اور جماعت ایک ہے، جماعت کو مستحکم رکھنے کی فکر ہم کو تمام مصالح پر مقدم رکھنی ہوگی، قابل اصلاح امور میں ایک دوسرے کی خیر خواہی ضرور کریں مگر آدابِ اختلاف میں اپنے بزرگوں کی روش ملحوظ رکھیں۔

علماءِ ذی احترام! اتحاد واتفاق کا شیرازہ جمع کر لینے کے بعد ہمیں دو کام کرنے ہیں، ایک تو اسلام اور اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف جتنی تحریکیں ہمارے علاقے میں کام کر رہی ہیں ان کی نشاندہی کر کے ان کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں، ان کے نظریات وخیالات کی تحقیق کریں، ہم سے پہلے علماءِ کرام اس پر کام کر چکے ہیں تو ہم اس کو فراہم کر کے خوب اچھی طرح سمجھیں، نفسِ اختلاف، وجوہِ اختلاف، قوتِ اختلاف، اس اختلاف کے اثرات ونتائج اور ان کی تردید کے دلائل کی خوب تحقیق کر کے انہیں ذہن نشین کر لیں، تاکہ خود کو اطمینان ہو جائے اور دوسروں کو پوری ہمت اور کامل بصیرت کے ساتھ دعوتِ حق دے سکیں۔ دوسرے یہ کہ عوام میں سے ہر عمر اور ہر طبقے کے کچھ افراد منتخب کر کے ان کے لئے تربیتی ورکشاپ رکھیں، ہفتہ میں ایک دن ایک گھنٹے کی کلاس میں پوری وضاحت وصراحت اور دلائل کے ساتھ ان باطل تحریکات کی حقیقت بیان کریں، جب وہ مطمئن ہو جائیں تو ان سے کہیں کہ آپ کے حلقۂ تعلق میں جو اس فتنے سے متاثر ہیں انھیں سمجھا کر حق کی طرف واپس لانے کی کوشش کریں، کیوں کہ اہل باطل کا کام عوام سے عوام میں چل رہا ہے اور عالمانہ انداز کے مقابلے میں عامیانہ طریق پر ذہن سازی کی جارہی ہے، عالم اگر

عوام سے الجھتا رہے گا تو اس کا مقام باقی نہیں رہے گا۔ اس کے برخلاف علماء عوام کو تیار کرکے عوام کو کام پر لگائیں تو شاید بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔ خود اہل باطل کی طرف سے بھی آج کل جلسے کم اور افراد میں ذہن سازی کی محنت زیادہ ہورہی ہے، اس میں نہ شور وشر ہے نہ خرچ وصرف، دیکھتے دیکھتے ان کے ہم نوا ایک سے دو ہورہے ہیں اور دو سے چار، جب پانی سر سے اونچا ہوجاتا ہے تب ہم کو پتہ چلتا ہے اور ہم ایک بڑا جلسہ کرکے ان کا حکم بیان کردیتے ہیں اور کام ختم۔ ضرورت پر بڑوں کے مشورہ سے جلسہ بھی کرسکتے ہیں لیکن انفرادی دعوت مسلسل جاری رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے بعض نوجوان علماء نے شہر میں اس طریقے کو اختیار کیا تو اس کے خوش آئند نتائج پائے ہیں۔

شرکاءِ اجلاس! ایک اور مسئلے کی جانب اس وقت توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ یہ ملک جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں اس میں دیگر اقوام بھی رہتی ہیں، ادھر مسلمانوں کے نام سے بہت سے ایسے مذاہب موجود ہیں جو فی الحقیقت مسلمان نہیں، اسی طرح وہ لوگ بھی ہیں جو اصولی اعتبار سے مسلمان ہونے کے باوجود فروعی اعتبار سے فکری وعملی گمراہیوں کے شکار ہیں یا بدعات وخرافات میں مبتلا ہیں۔ ظاہر ہے کہ نہ ہم ان سے الگ ہوسکتے ہیں اور ان کو اپنے سے جدا کرسکتے ہیں، ایسی صورت میں ہمارے ان کے ساتھ روابط وتعلقات کیسے ہوں؟ کس حد تک اختلاف کیا جائے اور کس حد تک اتفاق؟ اس مسئلے میں ہمارے بہت سے ساتھی افراط وتفریط کے شکار ہیں اور حفظِ مراتب کا لحاظ نہیں کر پارہے ہیں۔ میں یہاں ملک کی عظیم علمی شخصیت، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور آپ میں سے اکثر کے استاذِ گرامی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کا وہ ارشاد جو آپ نے اسی سوال کے جواب میں فرمایا تھا نقل کردینا کافی سمجھتا ہوں۔ مفتی صاحب مدظلہٗ نے فرمایا تھا:

''ہم ملکی اور سیاسی معاملات میں تمام مذاہب کے ساتھ اتحاد کرسکتے ہیں، ملی اور قومی

معاملات میں تمام مسالک اور مسلم جماعتوں کے ساتھ اتحاد کر سکتے ہیں، مسلکی معاملات میں سوائے اپنے مسلک والوں کے اور کسی جماعت و مسلک سے ہم جڑ نہیں سکتے۔'' تاکہ امتیاز برقرار رہے اور لوگوں کو اشتباہ نہ ہو۔

اس لئے وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی جیسے لیبلوں سے دھوکہ کھا کر ہمارے علماءِ کرام کا بلا کسی خاص ضرورت و داعیۂ ملی کے ہر کسی اسٹیج پر رونق افروز ہو جانا اور محض مادّی منفعتوں کے لئے ہر کسی کو اپنے جلسوں اور پر گراموں میں بلانا اور ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا اپنے مسلک کو کمزور کرنے اور غلط مسالک کو مضبوط کرنے کے مترادف ہے، اس سلسلہ میں اکابر کے تصلب و پختگی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ وہ نہ خواہ مخواہ کسی کے پیچھے پڑے رہتے تھے اور نہ ہی بلا ضرورت اپنے مخالفین سے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ آخر ہر کوئی اپنی شناخت بنائے رکھتا ہے، اس میں کسی سے سمجھوتہ نہیں کرتا، ہم ہی لوگ کیوں دوغلے ہو جائیں؟؟

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ پاک ہمیں حدودِ اختلاف کی فہم نصیب فرمائے، ہمارے اتحاد کو مضبوط تر فرمائے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(اداریہ جولائی ۲۰۱۳ء)

ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں!

امام احمدؒ نے مسند (۳/۱۵۴) میں اور امام بیہقی نے سنن (۴/۷۸) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ ''جس شخص کے پاس امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کے پاس وفاداری نہیں اس کا دین نہیں'' اسی طرح بخاری و مسلم رحمہا اللہ (بخاری: ۶/۱۸۵) نے بہت ہی تفصیل کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ قیامت کے دن اپنے سروں پر خیانتوں کے اموال اٹھا کر لائیں گے، اس بوجھ سے نجات کیلئے انہیں سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی مددگار نظر نہ آئے گا، مگر جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کریں گے کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات دلا دیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں صاف ارشاد فرمائیں گے: حقوق العباد کے معاملے میں ''میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا، خیانتوں کے اس انجام کے بارے میں تو میں نے دنیا ہی میں تمہیں بتلا دیا اور تبلیغ کا حق ادا کر چکا تھا''۔ کل قیامت کے ہولناک دن پیش آنے والی اس صورتحال کی اللہ تعالیٰ سے علم پا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو نہ صرف خبر دی بلکہ تاکید فرمائی کہ ''خبردار! میں تم میں سے کسی کو اس صورتحال میں نہ دیکھوں''۔ ایک اور حدیث (بخاری: ۱۱/۵۹۲) میں ہے کہ کسی سفر میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا جا رہا تھا، لوگ سواریوں پر سے سامان اتار رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم مِدعم آپ کی اونٹنی کا سامان کھول رہے تھے کہ اچانک کسی دشمنِ اسلام نے انہیں اپنے تیر کا نشانہ بنایا، وار اتنا طاقتور تھا کہ وہ اپنی زندگی

بچا نہ سکے، مگر صحابہ کرامؓ نے جب نبی ﷺ کو اس کی شہادت کا مژدہ سنایا تو آپ نے فرمایا ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس شخص کے عمامے پر — جو اس نے خیبر کی غنیمت میں سے تقسیم سے قبل بِلا اجازت لے لیا تھا — آگ بھڑک رہی ہے''۔ صحابہ کرامؓ اس سچی خبر اور خیانت کے اس خوفناک انجام سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے اموال میں غور کرنا شروع کیا، کوئی معمولی سے معمولی چیز میں بھی شبہ ہوا تو لا کر خدمتِ اقدس میں پیش کر دی، یہاں تک کہ ایک جوتے کا تسمہ لانے والا — مفتوحہ علاقے سے اٹھا کر اپنے جوتے میں لگا لیا تھا — وہ بھی لا کر خدمتِ والا میں پیش کر دیا، آپ نے لوگوں سے فرمایا ''یہ جہنم کی آگ کے تسمے ہیں''۔ یعنی تقسیم سے قبل جو مال بھی مالِ غنیمت میں سے کوئی لیتا ہے تو اسے اس کا حق نہیں ہے، یہ عمل عنداللہ خیانت شمار ہوتا ہے جو نارِ جہنم میں لے جانے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ بے شمار صاف وصریح روایات اور آیات ایسی ہیں جن سے دینِ اسلام میں ''امانت وخیانت'' کے مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جب بے امانت شخص کو بے ایمان[1] تک کہہ دیا گیا تو اور کس وعید کی ضرورت ہے؟ اسی لئے ہمارے سماج کے عام بول چال میں بے ایمانی کا لفظ بددیانتی کا مترادف بن گیا ہے، ایک — کافر بھی کہتا ہے ''بے ایمانی مت کرو، ایمانداری کی بات کرو، وغیرہ'' جب امانت اور ایمان کا اتنا قریبی رشتہ ہے تو صحابہ کرامؓ اور اولیاءِ عظام اس کی اہمیت سے غفلت کیوں کر برت سکتے تھے؟ چنانچہ صحابہؓ کے ہاں دین کا پیمانہ دیانت ہی قرار پا گیا تھا، امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے سامنے کسی شخص کی دیانتداری کی شہادت دی گئی، آپ نے شہادت دینے والے سے پوچھا: کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملت کی؟ اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی؟ اس کے ساتھ کبھی سفر کیا؟ جب اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے پوچھا: پھر کس چیز سے اس کی دیانت کا پتہ چلایا؟

[1] لاایمان کا ظاہری مفہوم

بس مسجد میں راتوں کو لمبی لمبی نفلیں پڑھتا ہوا دیکھ لیا ہوگا اور سمجھ لیا کہ یہ بہت دیندار و دیانتدار آدمی ہے، یعنی زہد و طاعت اور کثرتِ عبادت سے کسی کی دین و دیانت پرکھی نہیں جاتی، بلکہ معاملات کی صفائی، وعدہ وفائی اور حقوق کی ادائی کے ذریعہ دین و دیانت کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ جو اس میں خوفِ خدا اور حساب کا احساس رکھتا ہے حقیقت میں وہ ایمان دار و دیانتدار کہلانے کا مستحق ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ اور جو کوئی اللہ سے نہیں ڈرتا، ہر چہ آمد در گھسیٹ کا مصداق بنا رہتا ہے اس کا دین اور ایمان مشکوک اور غیر محفوظ رہتا ہے، فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ مختصر یہ کہ اسلام نے امانت و دیانت کو معیارِ ایمان اور بدعہدی و خیانت کو معیارِ نفاق بتلایا ہے، حدیث (بخاری: ۱/۸۹) میں ہے: اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا كَامِلاً وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ۔ اہل علم و صلاح کیلئے یہ احادیث مشتے از خروارے ہے ورنہ وہ خود اس سلسلے کی آیات و احادیث سے خود ہی بہت واقف ہیں۔

ان آیاتِ شریفہ و احادیثِ مبارکہ کا جو اثر صحابہ کرامؓ کے اخلاق پر پڑا ہی امت کے علماء اور اولیاء پر بھی اس کا غیر معمولی اثر پڑا، بالخصوص ہمارے اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ و کثر امثالھم دیگر صفات کی طرح اس معاملے میں بھی اپنا ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں، تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے جو معاملات و مالیات میں ان کی خداترسی و خشیتِ الٰہی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

● امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ جب انہوں نے بصارت سے محرومی کے بعد تدریس کا سلسلہ بند کر دیا تو یہ معمول بنا لیا کہ جو رقومات و ہدایا خانقاہ کو پہونچتیں انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیتے تھے کہ اب یہاں درس و تدریس کا سلسلہ موقوف ہے، لوگوں نے کہا بھی کہ کسی اور مصرف میں استعمال کی اجازت لے لی جائے،

مگر آپ نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا، یہ دیانت وامانت ہی کی بات ہے کہ عقیدت مند تو بھیجنے کا سلسلہ موقوف نہیں کرتے مگر حضرت لینے کا سلسلہ بند کردیتے ہیں، حالانکہ کسی اور مصرف میں صرف فرما سکتے تھے، سب کارِ خیر تو بند نہیں ہوئے تھے، مگر ان کے اندر موجود دیانت اور روز قیامت حساب وکتاب کی نزاکت انہیں مجبور کرتی تھی کہ بآسانی خطیر رقمیں اور کثیر آمدنیاں واپس فرمادیں۔ کیا ہم ایسا کرسکتے ہیں کہ جو کام ختم ہوگئے یا کم ہوگئے ان کے حوالے سے ملنے والی رقومات واپس کردیں؟ ہم تو اشارۃً کنایۃً حتی کہ دبی زبان ہی سے سہی اس کو اطلاع دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کہ اب ہمارے ہاں یہ مصرف نہیں رہا آپ کہیں اور صرف کردیں۔

● حضرت مولانا احمد علی سہارن پورؒ کو تعمیر مدرسہ کے سلسلہ میں کلکتہ بھیجا گیا، کافی بڑی رقم اپنے تعلقات کی وجہ سے مدرسہ کے لئے لے کر آئے، جب حسابات پیش کئے تو اخراجاتِ سفر میں ایک مقام پر جانے آنے کا کرایہ اپنی تنخواہ میں سے یہ کہہ کر وضع فرمایا کہ وہاں اگرچہ چندہ بہت ہوا مگر جانے کی نیت ایک دوست سے ملنے کی تھی چندہ کرنے کی نہ تھی۔ سوچئے کہ یہ کیا احتیاط ہے اور کیسی پرہیزگاری ہے؟ کیا آج سفراء حضرات بلکہ وہ علماء جو تعطیلات میں یا خصوصی مواقع پر فراہمی سرمایہ کیلئے مدرسوں اور دینی اداروں سے بھیجے جاتے ہیں وہ حساب وکتاب کے پیش کرتے وقت ایسی دیانت داری و پرہیزگاری کا ثبوت دے سکتے ہیں؟ یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ دوست نے کھانا کھلادیا تو بھی خرچہ میں لکھواتے ہیں، چاء نہیں پی تھی تو بھی خرچ میں ڈال دیتے ہیں، پیدل گئے تھے تو بھی کرایہ شمار کرادیتے ہیں، اور بھی ایسی ایسی خیانتیں علم میں آئی ہیں کہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا، کمیشن کی نحوست نے تو اس عظیم خدمت کو ایسا کاروبار بنادیا ہے کہ ڈوب مریں تو بہتر ہے۔

● مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت حکیم الامتؒ سے معلوم کروایا کہ مدرسہ میں مہمان آتے رہتے ہیں، کیا مدرسہ کی جانب سے ان کی ضیافت کی جاسکتی ہے؟ حضرتؒ نے

جواب دیا: اگر اس مہمان کے آنے سے مدرسہ کا معتدبہ نفع ہے تو مدرسہ سے ضیافت کردی جائے ورنہ خدام مدرسہ میں سے کوئی انہیں اپنا مہمان بنالے۔ یعنی اکرامِ ضیف سے پہلوتہی بھی نہ کی جائے اور مدرسہ کے مال کا استعمال بھی مشکوک نہ ہونے پائے۔

● شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کے ساتھ بہت سے علماء وصلحاء مظاہر کی مسجد میں معتکف ہوتے تھے ان میں بہت سے امراء بھی ہوتے تھے، ان کا آنا ملک بھر میں مدرسہ کے تعارف اور آمدنی کا مؤثر ذریعہ بھی تھا، مگر شیخؒ نہ صرف یہ کہ ان سب کو شخصی مہمان بناتے تھے بلکہ ایک مہینے کا کرنٹ کا بل بھی خود ادا کرتے تھے کہ میرے مہمانوں کی وجہ سے بجلی زیادہ استعمال ہوئی ہے۔

● قریب زمانے میں عارف باللہ حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ گذرے ہیں، مقبولیتِ عامہ کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی، حضرت ان کو اپنا مہمان سمجھتے تھے، کبھی مدرسہ سے کھلا بھی دیتے تو اپنے جیب سے اس کی قیمت جمع فرمادیا کرتے تھے۔ کیا آج ہم بھی مدارس میں ایسی احتیاط برت رہے ہیں؟ ہم تو اپنے مہمانوں کا بار بھی کسی بہانے مدرسہ کے مطبخ پر ڈال دینے میں پیچھے ہٹنے والے نہیں رہے۔

● محی السنۃ حضرت ہردوئیؒ اپنے زیر انتظام مدارس کے حسابات خود جانچتے تھے اور کسی صرفے میں ذرا بھی کھٹک ہوتی تو اسے مدرسہ سے منظور نہیں فرماتے تھے، ایک مرتبہ ایک مدرسہ والوں نے رسید کا مضمون اور ڈیزائن تبدیل کر کے معروف کاتب سے اچھی کتابت کروالی تھی، جس پر سو روپئے کا صرفہ آیا، جب حضرتؒ نے حسابات میں اس کو دیکھا تو فرمایا: اس تبدیلی کی کوئی ضرورت نہ تھی، ایک تو عوام میں رسید کی وضع بدلنے سے شبہ پیدا ہوگا، دوسرے کام تو اس سابقہ وضع کی رسیدوں سے بھی چل رہا تھا، اس لئے یہ مصارف بلاضرورت ہوئے، پہلے خلجان کا حل یہ نکالا کہ ان رسائد کو اندرون مدرسہ استعمال کر کے ختم کرلیا جائے اور عام استعمال کے لئے رسیدیں سابقہ وضع ہی پر چھپتی رہیں، دوسرے خلجان کا مداوا اس

طرح فرمایا کہ: جن مقامی ذمہ داروں نے ایسا کرنا طئے کیا تھا وہ اپنے جیب سے اس زائد خرچ کا بوجھ اٹھالیں یہ رقم مدرسہ جاری نہیں کرے گا، چنانچہ تین آدمیوں نے مساوی طور پر اس خرچ کو تقسیم کر کے مدرسہ میں جمع کروادیا ۔

یہ چندواقعات میں نے بعض اکابر کے بطور مذاکرہ ویاددہانی کے یہاں رقم کردئے ہیں جوآپ حضرات کے علم میں پہلے سے ہیں اوران کے علاوہ بھی آپ بہت کچھ جانتے ہیں اصل وجہ ان کے ذکر کی اس امر کی جانب اپنی اوراحباب کرام کی توجہ مبذول کرنا ہے کہ فی زمانہ مدارس کے مالیات کا استعمال دن بہ دن نامناسب شکل اختیار کرتا جارہا ہے، تعلیم سے زیادہ تعمیر کی فکر ہے اور کام کی توسیع سے زیادہ وصولی کی تکثیر پر نظر ہے، عمارات میں تقابل وتفاضل دیکھنے میں آرہا ہے، مصارف میں قدرضرورت پر اکتفا کیا جاتا ہے نہ محل صرف کی واجبیت کا اندازہ کیا جاتا ہے، صدقات واجبہ کی تملیک یا تو مدنظر ہی نہیں یا نہایت استخفاف کے ساتھ کرلی جاتی ہے، حیلۂ تملیک مواقع خاصہ تک محدود ہونے کے بجائے عام کرلی گئی ہے، وصولی سرمایہ میں بھی احتیاط نہیں ہے، کمیشن کے جواز اور رواج نے اس کام میں اخلاص وللّٰہیت کو ختم کردیا ہے، ان جگہوں پر جہاں اس پر عمل ہے بہت ہی افسوس ناک صورتحال ہوگئی ہے ۔ بہت سی جگہ ذمہ داروں کے مصارف متعین نہیں، وہ جو کچھ خرچ کریں سب مدرسہ کا بوجھ ہے، طلبہ کی ضروریات اورحاجات کی فکر بہت کم ہے حالانکہ زکوۃ وصدقات کی رقومات نہ استعمال ہوسکنے کی وجہ سے انہیں سے تملیک کراکے دوسرے کاموں میں صرف کی جارہی ہے، مگران کے لباس خوراک اور شخصی ضروریات پر مستحق ہونے کے باوجود کما حقہ توجہ نہیں کی جارہی ہے۔ علاقائی مدارس میں طلبہ کی تعداد مختلف معلوم اسباب کے تحت گھٹتی جا رہی ہے، اہل مدارس اس کا رونا تو رورہے ہیں مگر اپنی توجہات اور سرگرمیاں مکاتب کی طرف مبذول کرنے کے لئے تیار نہیں، حالانکہ اس سے خوشگوار اور مثبت تبدیلیوں کی توقع ہے، اس کے برخلاف موجودہ صورتحال یوں ہی زوال پذیر رہی اوراہل مدارس اپنے

اطراف واکناف مکاتب کا جال نہ پھیلا سکیں تو اندیشہ ہے کہ جس طرح یورپ میں عدم استعمال کی وجہ سے چرچ فروخت کئے جا رہے ہیں ہمارے مدارس کی یہ بڑی بڑی عمارتیں بیچ دینے کی نوبت نہ آجائے، بعض علمائے کرام بھی جن کے پاس وسائل مالیہ ہیں وہ ان کے صرف میں علاقے کی ضرورت کا پورے طور پر سروے نہیں کر پارہے ہیں، بس پیچھے لگے رہنے والوں کے اصرار پر کروڑوں روپئے خرچ کر کے ایکروں زمین پر وسیع وعریض عمارات کا ایک دارالعلوم بنوادیتے ہیں، چھوٹی جگہوں پر اچانک اتنی بڑی مسلم پراپرٹی کو دیکھ کر حاسد اور دشمن الگ جلنے لگتے ہیں اور کام کی مقدار اس عمارت کے اعتبار سے افسوس ناک حد تک قلیل ہوتی ہے، ابھی اس ادارہ کی مقبولیت ومرجعیت تو کیا تعارف بھی پورا نہیں مگر مہمان خانہ عظیم الشان اور باقاعدہ ایک مدرسہ کے برابر ہوتا ہے، جس میں شاید و باید مہمانوں کے قیام کی نوبت آتی ہے۔ ان کے مقابلے میں کئی مدارس ضرورت کے مقام پر قائم ہیں، خوب کام کر رہے ہیں مگر اسبابِ ظاہری سے محروم ہیں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں اگر ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کی شوکت پرشکوہ عمارتوں ہی سے ہے تو یہ ہماری بہت بڑی بھول ہے جس کی ہمارے طبقے سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

انبیاء کرام کی تاریخ تو کھلی کتاب ہے ہی اولیاء کرام اور اسلاف عظام کے احوال بھی ذہنوں سے اوجھل نہیں کہ اصل چیز جہد وعمل اور امت کے غم میں گھلنا مرنا ہے۔ سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ وہ جو اسلامی دنیا کی عظیم الشان عمارات ہیں بخارا و سمرقند کے مدارس اور عالم اسلام کی تاریخی مساجد یہ علماء کرام کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہیں، خلفاء وامراء کی خواہشات کی دین ہیں، علماء نے ہمیشہ کام اور کاموں کی فکر پر توجہ مرکوز کی، وسائل کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ نے اہل خیر کے قلوب کو متوجہ کیا تو وسائل بھی بقدر ضرورت انجام پاتے گئے، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ مخلص علماء وسائل کی بہتات کو آزمائش سمجھتے اور اس سے گھبراتے رہے، اور اب صورتحال یہ ہے کہ بہت سے ذمہ دار حضرات نے مدرسہ

کو چند معلموں کے حوالے کر کے اپنی ساری تگ ودو وسائل ظاہرہ کے پیچھے وقف کر رکھی ہے، اس کی وجہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ نو فارغ اور غیر تربیت یافتہ علماء جو ماتحتی کا داغ اپنے دامن پر دیکھنا نہیں چاہتے اور ضرورت ہونے نہ ہونے کا اندازہ کئے بغیر نیز بڑوں سے مشورے لئے بغیر مدرسے قائم کرتے چلے جارہے ہیں، ذرا ناظم سے اختلاف ہوا مستعفی ہو کر دوسرا مدرسہ کھول لیا، جگہ خریدنے اور عمارت بنانے میں لگ گئے، ابھی فارغ ہو کے آئے، کوئی تجربہ کام کا نہیں مدرسہ شروع کر دیا، دس بیس بچوں کو لے کر بیٹھ گئے۔ کام برائے نام اور جلسے عظیم الشان ہو رہے ہیں۔

ایک علاقہ کے ذمہ دار مدرسہ نے مجھے جلسے میں بہت اصرار سے دعوت دی، مجھے ایسا لگا کہ دو چار علماء ہوں گے، بہت دور کا سفر تھا تو میں ہوائی جہاز سے پہونچا اور اس کے لئے بہت کام آگے پیچھے کرنے پڑے، جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ بہت بڑا جلسہ ہے اور پوری ریاست اور اطراف واکناف سے ۴۲ را کابر علماء بلائے گئے ہیں (سب کو ایسا ہی اندھیرے میں رکھ کر بلایا ہوگا) لاکھوں روپیہ تو صرف کرایوں پر صرف کیا، معلوم ہوا کہ ساؤتھ آفریقہ سے چندہ لاتے ہیں اور یوں کھپاتے ہیں، اس گاؤں میں ذرا ذرا سے فاصلے سے کئی مدارس ہیں، میں نے خود تین دیکھے مگر طلبہ کی تعداد برائے نام، تینوں مدرسوں کے بچے ایک مدرسہ میں بہ سہولت پڑھ سکتے ہیں، تعدُّدِ مدارس بقدر ضرورت میں کوئی حرج نہیں بلکہ ہونا چاہئے مگر اس طرح نہیں ہونا چاہیے جیسے وہاں دیکھا کہ بیچ میں ایک مکان ہے اس جانب ایک مدرسہ مسجد اور اُس جانب ایک مدرسہ مسجد، دونوں دیوبندی الفکر عالم ہیں، دونوں مدرسوں میں سب سے شاندار جگہ مہمان خانہ ہے، کارپیٹس، بیڈس، کولرز، ہیٹرز، قیمتی ٹائیلٹ اور باتھ روم عالی شان صوفہ سیٹ وغیرہ۔

مدارس میں مہمان خانہ بھی بے شک ایک ضرورت ہے مگر شریعت میں ضرورت کی بھی کوئی تعریف ہوتی ہے؟ اسی گاؤں کے ایک مدرسہ میں تو معلوم ہوا کہ جو مسجد زیر تعمیر ہے ناظم

صاحب کی خواہش ہے کہ وہ مسجدِ رشید کی طرح لگے، اس کے لئے ہر ممکن صرفہ فرمایا جارہا ہے، بعض لوگ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسی جامعات کی تعمیروں کا حوالہ دیتے ہیں مگر ان کو سوچنا چاہیے کہ وہ تاریخی مقامات اور عالمی مراکز ہیں، متعدد اور متنوع کام وہاں سے ہوتے ہیں، دنیا بھر سے لوگ ان کی زیارت کیلئے پہونچتے ہیں ان مراکز سے تقابل کوئی معنی نہیں رکھتا، پھر یہ بھی تو دیکھیں کہ آج دیڑھ صدی کے بعد ان کو یہ حیثیت حاصل ہوئی ہے، آغاز جس طرح ہوا اور کام جن جانفشانیوں اور قربانیوں سے سرانجام ہوتے رہے، ان کو کیوں نہیں دیکھا جاتا؟

دارالعلوم دیوبند کے ایک ذمہ دار استاذ نے بتلایا کہ کسی صاحب کے شدید اصرار پر وہ مدرسہ کے جلسے میں گئے، کچھ لوگ جمع تھے بیان ہوا، بعد میں مقامی لوگوں نے بتلایا کہ یہ سب لوگ دوسری جگہ سے جمع کئے گئے ہیں، مقامی کوئی نہیں اس لئے کہ سب ان کی حرکتوں سے نالاں ہیں، آپ ذرا مدرسہ کی تحقیق کرلیجئے، انہوں نے مدرسہ دیکھنا چاہا تو رات ہوجانے کا بہانہ کرکے ٹال مٹول کرتے رہے، پھر جب دکھانا ہی پڑا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے اسی کے دروازے پر ایک شعبہ کا بورڈ تھا، کھڑکی پر ایک شعبے کا بورڈ تھا، کسی اور جگہ ایک شعبے کا بورڈ تھا۔ ایک اور مدرسہ میں خود میرا جانا ہوا دو کمرے اور آٹھ شعبے ہیں، خوب اشتہار ہوتا ہے اور خوب وصولی کی جاتی ہے، پیسہ جو آرہا ہے انہی کاغذی تشہیرات پر صرف ہورہا ہے، کام ہر شعبے میں برائے نام ہے، جبکہ بڑے بڑے کام کرنے والے اداروں میں بھی تشہیر پر اتنا صرفہ نہیں کیا جاتا، ظاہر ہے کہ جب آدمی کا مقصود شہرت و دولت ہو تو اسے کام سے کیا لینا دینا؟

یہ چند متفرق باتیں مدراس اسلامیہ میں مالیات کے بے ڈھنگے استعمال کی جو میں نے لکھی ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ بہت سے مدارس جو غیر ذمہ دار علماء نے کھول رکھے ہیں جن کی کوئی شوریٰ ہے نہ ہی کوئی موثر سرپرست ہے جو ذمہ دار پر اپنا اثر رکھتا ہو، ان کی

وجہ سے ایک طرف مدارس کی بدنامی و بے اعتمادی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، دوسری جانب قوم کا سرمایہ بے محل صرف ہوتا جارہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تحریکِ مدارس کی برکتیں اٹھتی چلی جارہی ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اربابِ مدارس ان امور پر غور کریں اور مالیات میں امانت ودیانت کی اہمیت کو نظر انداز نہ کریں، بلکہ اپنے اکابر کے مزاج ومنہاج پر مستقیم رہنے کی کوشش کریں۔ انہی خطرات کی وجہ سے ہمارے اکابر اولاً تو عہدوں اور منصبوں سے دور بھاگتے تھے، اور کوئی ذمہ داری زبردستی ڈال ہی دی جاتی تو پائی پائی کے بارے میں جواب دہی کا احساس رکھتے تھے۔ حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ فرماتے تھے: مدارس کا دنیا کے لئے چلانا آخرت کا سب سے بڑا عذاب ہے اور آخرت کے لئے چلانا دنیا کا سب سے بڑا عذاب یعنی انتہائی مجاہدہ ومحاسبہ کا کام ہے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب مدرسوں کی ذمہ داری اور سرپرستی قبول کرنے سے بہت گھبراتے تھے اور فرماتے تھے کہ شخصی طور پر کسی معاملت میں خیانت ہوجائے تو جب احساس ہو آدمی اس سے معافی مانگ کر یا تلافی کر کے عہدہ برآ ہوسکتا ہے مگر قومی املاک واموال میں خیانت کرنے والا کس کس سے معافی مانگ سکتا ہے؟ کسی ایک آدمی کی چیز تو ہے نہیں۔ اسی لئے حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے وصیت فرمائی تھی کہ دینی اداروں کے پہلے تو ذمہ دار بنیں ہی نہیں اور اگر ضرورت پر بنا پڑے تو معاملہ ایسا رکھیں کہ مدرسہ سے تو ہمیں کچھ ملنا باقی ہو مگر ہمارے ذمے مدرسہ کا کچھ نہ نکلے۔ بے شمار واقعات ہمارے اکابر کے ایسے موجود ہیں کہ باوجود حساب وکتاب صاف ستھرا رکھنے اور اور مالیات میں خوفِ خدا کا لحاظ رکھنے کے بھی وقفے وقفے سے احتیاطاً مدرسہ میں چندہ دیتے رہتے تھے کہ انجانے میں بھی کوئی بے احتیاطی ہوگئی ہو تو اس طرح تلافی ہوجائے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے اسلاف کا سچا جانشین بنائے بالخصوص مالیات کے باب میں غایت احتیاط کی صفت نصیب فرمائے۔ آمین (اداریہ ستمبر ۱۳ء)

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ہمارے ملک میں اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ منصوبہ ساز ادارے آزادانہ منصوبہ بندی کے بجائے بڑی طاقتوں اور عالمی سیاستوں کے مقاصد و منافع کے تابع رہنے پر مجبور ہیں، اسی لئے وقفے وقفے سے ایسے مسائل اٹھائے جاتے رہتے ہیں جو ماضی میں اُٹھ چکے اور قوم ان کی مخالفت کر چکی ہے، بالخصوص مسلم اقلیت اور ان کی مذہبی تہذیبی آزادی کے حوالہ سے بعض مسائل کا مختلف روپوں میں اٹھتے رہنا اور ختم نہ ہو جانا حکمرانوں اور پالیسی سازوں کی اس مجبوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دینی مدارس اور مساجد کے سلسلہ میں حکومت کی جانب سے مالی تعاون کی بات کا بھی یہی حال ہے کہ کبھی مرکزی سطح پر کبھی ریاستی لیول پر مختلف انداز اور مختلف آواز سے اٹھتی رہتی ہے، مرکزی مدرسہ بورڈ کا مسئلہ ٹھنڈا پڑا تو لازمی حق تعلیم کی شکل میں پھر نمودار ہوا، اس میں سپریم کورٹ کی رولنگ سے راحت ملی تو آندھرا پردیش حکومت نے ریاستی سطح پر اس مسئلے کو اٹھایا، ازیں قبل ائمہ مساجد کی تنخواہوں کی بات چل رہی تھی، ممکن ہے یہ بجٹ ناقابلِ تحمل محسوس ہوا ہوگا اس لئے سرد خانے میں پڑ گیا، خارجاً معلوم ہوا ہے کہ مدرسہ بورڈ کے قیام پر مقامی حکومت ابھی بھی مُصر ہے۔ اسی اثناء میں مہاراشٹر گورنمنٹ کی طرف سے دینی مدارس کے تعاون کا پیشکش سامنے آیا، افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب تک کی صورتحال کے بالکل برعکس مہاراشٹر کے علماء اور جماعات نے اس کا خیر مقدم کیا ہے، بلکہ اطلاع ہے کہ سینکڑوں مدارس نے حصولِ فنڈ کیلئے درخواستیں بھی پیش کردی ہیں۔

ایسے حالات میں لگتا ہے امامت وتدریس کی اس عظیم امانت کو خود ہم مسلمان اپنے ہاتھوں ضائع کر کے سرکاری ملازم بن جانے کے لئے راضی ہو گئے ہیں، جن کے ذمے قوم وملت کی صحیح راہنمائی اور دین وشریعت کی بے لوث حفاظت کا کام تھا وہ بھی اپنے اسلاف واکابر کے زیر سایہ ومشورہ رہنے کے بجائے خود اپنی آراء وافکار کی اتباع کو ترجیح دے رہے ہیں، اگر یہی صورتحال رہی تو ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی مراکز، مساجد اور مدارس سب خطرے کی زد میں آجائیں گے اور شاید لمحوں کی یہ خطائیں صدیوں تک سزا پانے پر مسلمانانِ ملک کو مجبور کریں گی، الامان الحفیظ!

جی چاہتا تھا کہ اس عنوان پر اپنے اسلاف واکابر کی فکر ونظر اور طرزِ عمل کی روشنی میں کچھ معروضات علماء کرام کی خدمت میں پیش کروں مگر وقتی مشاغل ومصروفیات نے اس کا موقع فراہم ہونے نہیں دیا، ہماری ریاست کے معروف اور پختہ فکر ونظر عالم دین حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ نے ۶/ستمبر کے "منصف" میں اپنے کالم "شمع فروزاں" کے تحت اس عنوان پر ایک فکر انگیز مضمون شائع فرمایا تھا، میں اس وقت یہی مضمون "اشرف الجرائد" کے قارئین کی خدمت میں روزنامہ "منصف" اور حضرت مولانا مدظلہ کے شکریہ کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ ملک میں ہماری دینی قیادت کیلئے صحیح فکر اور مضبوط عزم کے اسباب پیدا فرما کر اپنے اسلاف کے سچے اخلاف بننے کا شرف عطا فرمائے اور ہر طرح کے خطرات سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

(اداریہ اکتوبر ۱۳ء)

لوٹ پیچھے کی طرف اے مسلمان تو

اسلامی تقویم کی ابتداء سیدنا عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں صحابہ کرامؓ کے مشورہ کے بعد دینِ اسلام کے ایک اہم ترین تاریخی واقعہ ـــــ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کے واقعہ کو بنیاد بنا کر کی گئی، اسی وجہ سے اسلامی سن سنِ ہجری کہلاتا ہے، اس واقعہ ـــــ کو اس ماہِ ذی الحجہ کے اختتام پر چودہ سو چونتیس سال مکمل ہوجاتے ہیں، مسلمانانِ مکہ کی ہجرت اور مسلمانانِ مدینہ کی نصرت دو ایسے مبارک عمل ہیں جن کی بدولت اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام اور صحابہ کرامؓ کو دونوں جہاں میں کامیاب و بامراد کر دیا۔

آدمی کا وطن خواہ کتنا ہی پسماندہ کیوں نہ ہو اسے محبوب ہوتا ہے اور غریب الوطنی خواہ کتنی ہی پُرتعیش کیوں نہ ہو وطن کی محبت ولذت سے بے نیاز نہیں کرتی، بالخصوص وطن اگر جذباتی وروحانی کشش بھی رکھتا ہو، وہاں روحانیت کا سرچشمہ اور تقدس مآب بیت اللہ بھی موجود ہو تو اس سے علاحدہ ہونا بلکہ زبردستی باشندگانِ وطن کی طرف سے علاحدہ کیا جانا کوئی معمولی مجاہدہ اور سرسری حادثہ نہیں ہوسکتا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نبی؛ نبیوں کے امام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحابِ کرامؓ نے مشرکین مکہ کے ظلم وستم سے عاجز ہوکر باذنِ الٰہی مکہ مکرمہ کو خیرباد کہتے ہوئے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرلی۔ کعبۃ اللہ کے جوار سے یہ دوری امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر کتنی گراں تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ سے روانہ ہورہے تھے تو ـــــ بقول ابنِ عباس

رضی اللہ تعالیٰ عنہ —— آپ سے جذبات قلبیہ زبان مبارک کے اس طرح ظاہر ہو رہے تھے:

"اے مکہ! تو انتہائی پاکیزہ اور میرا محبوب ترین شہر ہے، اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں (تجھے چھوڑ کر) کسی اور جگہ کبھی قیام نہ کرتا" (ترمذی: ۵/۶۷۹)

ایک دوسری روایت میں ہے:

"بخدا اے مکہ! اللہ کے نزدیک تو اس زمین کا سب سے بہترین بقعہ اور محبوب ترین حصہ ہے، اگر یہاں کے لوگ مجھے زبردستی نہ نکالتے تو میں کبھی یہاں سے نہ نکلتا"

(مسند احمد: ۴/۳۰۵)

صحابہ کرامؓ کے جذبات بھی مکہ مکرمہ کے بارے میں ان کے عشق رسول اور جذب محویت کی روشنی میں صاف ظاہر ہیں کہ یہی تھے۔ اسی لئے اللہ پاک نے ہجرت کے اس عمل کو عظیم عمل اور ایمان کے بعد سب سے قیمتی عبادت قرار دیا:

"جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اپنی جان و مال راہِ خدا میں قربان کئے اللہ کے ہاں ان کا بلند مقام ہے، اور یہی لوگ کامیاب ہیں" (التوبہ: ۲۰)

یہ ہے "ہجرت" کرنے والوں کا مجاہدہ وایثار اور اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ ومقام، اس کا دوسرا پہلو "نصرت" بھی نہایت قابل عبرت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب اللہ پاک کے حکم سے ترکِ وطن کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہونچے تو باشندگان مدینہ (اوس اور خزرج) نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کشادہ دلی، خندہ جبینی اور وسعتِ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے ان پردیسیوں کا بھرپور خیر مقدم کیا، اپنے گھر، زمین، جائدادیں، اموال واملاک ان پر نثار کر دیئے، سب جانتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنا مال محبوب ہوتا ہے، وَاَمْوَالُ ِاقْتَرَفْتُمُوْهَا، اپنی جائدادیں مرغوب ہوتی ہیں، وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ، اپنی تجارتوں سے دل جڑا ہوا ہوتا ہے، وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا، اسی

وجہ سے اس کا دوسروں پر صرف کرنا آدمی پر بارِ گراں ہوتا ہے چہ جائے کہ سب کا سب لٹا دینا اور قربان کر دینا، ظاہر ہے کہ یہ اہلِ مدینہ کا تاریخی اقدام اور قابلِ تعریف و تحسین کارنامہ تھا۔ اس بے مثال اخوت و بھائی چارگی اور حمیت و ہمدردی نے اہلِ مکہ کو اپنے وطن، اعزہ و اقرباء اور اموال و املاک سے محروم ہونے کے غم سے نجات دلا کر سکون و سرور نصیب کیا

خلاصہ یہ کہ جہاں مہاجرین کا عملِ ہجرت راہِ خدا کی بے مثال قربانی تھی تو انصار کا عملِ نصرت تاریخِ سخاوت میں ایک بے نظیر ایثار تھا، حق تعالیٰ شانہ نے ان دونوں عملوں کو جو خلوص وللہیت کے اعلیٰ معیار پر تھے شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور قرآن کریم میں اس کی سند نازل کی:

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور راہِ خدا میں جہاد کیا (یعنی مہاجرین کرام) نیز وہ لوگ جنہوں نے (اپنی سرزمین پر) انہیں ٹھکانہ دیا اور ان کی نصرت کی (یعنی انصارِ مدینہ) یہی لوگ پکے مومن ہیں، ان کے لئے (اللہ تعالیٰ کے ہاں) مغفرت اور رزقِ کریم (کا وعدہ) ہے'' (الانفال:۷۴)

تاریخِ اسلام میں نبوت کے تیرھویں سال وجود میں آئے "ہجرت و نصرت" کے یہ دو عمل ہی وہ مبارک اعمال ہیں جنہوں نے دینِ اسلام کو ایک مضبوط قوت، متحد امت اور مثالی سماج کی شکل میں انسانیت کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے ظالموں سے قتال اور اسلامی نظامِ حیات کے احکام پے بہ پے نازل فرمائے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان احکامات کا عملی نفاذ فرمایا، یہاں تک کہ اسلام پورے جزیرۃ العرب میں غالب ہو کر ''لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کی تفسیر بن گیا۔

اسلامی تقویم کے سلسلہ میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہجرت کو معیار بنانا اور اسکی طرف منسوب کرنا ان کی دور اندیشی اور فراستِ ایمانی کا مظہر ہے، تا کہ ہر سال، سال کا ہر مہینہ، مہینہ کی ہر تاریخ مسلمانوں کے سامنے ان کے نبی اور اصحابِ نبی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایثار و قربانی کی یاد تازہ کرتی رہے اور وہ اس کی روشنی میں یاد رکھ سکیں کہ کسی قوم کی ترقی و کامرانی کا خواہ کوئی وسیلہ ہو مسلمانوں کی کامیابی و ترقی تو اسلام کے تئیں ایثار و قربانی اور ہجرت و نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔

آیئے! ہم عہد کریں کہ اسلامی سال ۱۴۳۴ھ کے اختتام اور ۱۴۳۵ھ کے آغاز پر اپنے گذرے ہوئے سالوں کا جائزہ ''ہجرت و نصرت'' کے ان عظیم وقائع کے تناظر میں لیتے ہوئے انہی کی روشنی میں اگلے سال کا عملی منصوبہ تیار کریں گے، تاکہ ہمیں بھی اس فتح و غلبے سے کچھ بہرہ مل سکے جو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ملا تھا۔

اس عہد کے ساتھ یہ دعا بھی کریں کہ اللہ پاک نئے سال کا آغاز عالم اسلام اور مسلمانوں کے حق میں غیبی نصرت، خیر و برکت، اور یُمن و سلامتی کا مژدہ لے کر ہو اور مسلمان نئے عزائم اور مضبوط ارادوں کے ساتھ عبدیت و بندگی کا فریضہ ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ آمین

(اداریہ: نومبر ۱۳ء)

تبصرہ بر

عمدۃ الاقاویل فی تحقیق الاباطیل

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ہی واضح ہے غیر معتبر و من گھڑت احادیث کی نشاندہی پر مشتمل ہے، احادیثِ مبارکہ دینِ اسلام کے بنیادی مآخذ میں سے ایک اہم مآخذ ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح حفاظتِ قرآن کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح حفاظتِ حدیث کا بھی معجزانہ نظام بنادیا ہے، مسلمان ہمیشہ اسلام کی ان دونوں بنیادوں کی حفاظت کے آسمانی وغیبی نظام سے مطمئن اور اس پر مفتخر رہے، بلکہ اقوامِ عالم بالخصوص ان کے اہل علم حفاظتِ قرآن وحدیث کے اس عظیم الشان اور حیرت انگیز معجزانہ نظام کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔

کسی قوم کے پاس اس کے پیشوا کی زندگی کی مکمل تاریخ، اعمال واقوال، حرکات وسکنات، احکام امر ونہی اور اخبار واعلام محفوظ نہیں، نہ ہی ان کے پاس راویوں کے صدق وکذب اور ان اخبار وآثار کی صحت وسُقم کو پہچاننے کا کوئی معقول ومؤثر ذریعہ موجود ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں تعلیمات کی جگہ مفروضات ومزعومات اور شخصیت کی جگہ تخیلات وتوہمات غالب آکر ان کا مذہب حق وصداقت کے بجائے وہم وخیال کا معجون مرکب بن گیا ہے۔

حفاظتِ حدیث کا اصل سبب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کسی

بھی معاملے میں بالخصوص دین کے سلسلہ میں کذب ووضع پر سخت تنبیہ وتہدید ہے، ارشادِ ربانی ہے: ''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر معتبر آدمی کوئی بات لائے تو تم اس کی تحقیق کرو''۔ (سورۃ الحجرات:۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو کوئی میری جانب جان بوجھ کر کسی بات کو غلط منسوب کردے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے'' (بخاری: کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی ۶/۴۹۶) وغیرہ

ان ہدایات کا صحابہ کرامؓ، تابعین عظام اور بعد کے محدثین ورُواۃ پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ حدیثِ رسول کو نقل کرتے ہوئے خوف کرتے اور انجام سے ڈرتے تھے، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ کر کسی بات کو نقل کرنا ان کے لئے ہر مشکل سے بڑی مشکل بن گئی تھی، ان حضرات کو نقلِ حدیث کے وقت ڈرتے ہوئے، کانپتے ہوئے، روتے ہوئے دیکھا جاتا تھا، یقین کے بغیر تو بیان کرتے ہی نہ تھے یقین کے باوجود غایتِ احتیاط سے کام لیتے تھے۔

ایسے دیانت دار وامانت دار پُروقار وبااعتبار لوگوں کے درمیان اواخرِ خلافت راشدہ میں بعض منافق خصلت، خبیث الفطرت اور شرارت پیشہ لوگ گُھس آئے جو اگرچہ بہت ہی کم تعداد تھے مگر مکر وخداع کے ذریعے انہوں نے ایک گروہ اپنے ہم نواؤں کا تیار کرلیا تھا جو سادگی ونادانی سے ان کے مقاصد ومفاسد کو سمجھ نہیں پاتے تھے اور ان کی ہر رطب ویابس پر اعتماد کرکے خود بھٹکتے اور دوسروں کو بھٹکانے کی کوشش کرتے تھے، ان خبیثوں نے اپنا مقام بنانے اور اپنی اباطیل واقاویل کا سکہ جمانے کے لئے اپنی من گھڑت باتوں اور خرافات کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بیان کرنا شروع کیا، لیکن جب یہ باتیں منظر عام پر آئیں تو خود صحابہ کرامؓ نے اور ان کے بعد تابعین ومحدثین نے ایسی باتوں کا مضبوط تعاقب کرکے پانی کو دودھ سے اور سیاہی کو سفید سے ممتاز کردیا۔

اس کام کیلئے جو شرعی تدابیر اختیار کی گئیں وہ بالآخر باضابطہ اصولوں پر مشتمل ایک فن کی

شکل اختیار کر گیا، روایت سے متعلق پانچ لاکھ اشخاص کے احوالِ زندگی اور معیار دیانت مرتب ہوا، اس فن اور رجال کے ماہرین وجود میں آئے جس کے نتیجے میں بفضلہٖ تعالیٰ قیامت تک کے لئے احادیث نبویہ میں تدلیس وتلبیس اور وضع وکذب کا دروازہ بند ہوگیا۔ اس انتظام سے قبل احادیث میں جو کچھ گڑ بڑ مختلف اشخاص سے مختلف اسباب کے تحت ہو چکی تھی وہ پکڑی گئی، پوری بصیرت واعتماد کے ساتھ ان کا قلع قمع کیا گیا، ایسی موضوع احادیث کو تلاش کر کے انہیں علاحدہ کتب میں جمع کیا گیا، تاکہ آسانی سے ان کی پہچان ہو سکے اور ان کے ضرر سے بچا جا سکے۔

یہ کام عربی زبان میں تو متقدمین ومتاخرین دونوں طبقوں نے انجام دیدیا تھا مگر اردو زبان میں ماضی قریب سے اس کا سلسلہ شروع ہوا، اردو زبان میں تیار کردہ اس قسم کے لٹریچر سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر لوگوں نے یہ کام خالی الذہن ہو کر حفاظتِ حدیث کے مقصد سے انجام نہیں دیا بلکہ مخصوص نظریات ومفادات اور اغراض کے تحت انہوں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا، کیوں کہ ان کتابوں میں مصنف کا انداز اور اسلوب اس کی طرف صاف اشارہ کرتا دکھائی دیتا ہے، مثلاً منکرین حدیث نے نفس حدیث ہی کو مجروح کرنے کا اسلوب اختیار کیا، علامہ تمنا عمادی اور علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی کی کتابوں میں رواۃ اور روایات کی کچھ اس طرح تشخیص وتجریح کی جاتی ہے کہ ذخیرۂ حدیث ہی پر سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور راویانِ حدیث ورع وتقویٰ اور علم وفضل کے باوجود قاری کی نظر میں جعل سازوں اور افسانہ نویسوں کا ٹولہ دکھائی دینے لگتے ہیں، بلکہ علامہ کاندھلوی نے تو اپنی کتاب کا نام ہی ''مذہبی داستانیں'' رکھا۔ اسی طرح ایک کتاب ''موضوع روایات کا چلن'' کے نام سے چھپی، جس میں مصنف نے سارا زور ''فضائل اعمال'' کی مرویات پر صرف کر کے کتاب اور اس کے مصنف کا اعتماد مجروح کرنے کو نشانہ بنایا، اسی طرح بعض لوگوں نے یہ خدمت صرف حنفیت کی بیخ کنی کے لئے سرانجام دی، غرض یہ ہے کہ غیر جانبدارانہ اور دیانتدارانہ طور پر

اردو زبان میں یہ کام کم از کم ہمارے سامنے نہ آسکا۔

زیر تبصرہ کتاب اگر چہ اسی موضوع پر ہے —— یعنی موضوع روایات کی تنقیح اور تعیین —— مگر بچند وجوہ متقدم کتب سے ممتاز ہے۔

الف: مصنف نے سب سے پہلے حفاظتِ حدیث کے اسباب وعوامل، وسائل وذرائع، وضعِ حدیث کے اسباب وعوامل، اس کی تعریف، اس کا حکم، اس کی اقسام، اس کی تاریخ، اس کو پرکھنے کے اصول، ان اصول کی تدوین، ان کی خصوصیات، ان کے ماہرین، طبقات وشخصیات، جرح وتعدیل کے بنیادی قواعد، موضوع روایات کی نشاندہی کرنے والی کتب کا تعارف اور مقام، نقد کا طریقہ کار، اس کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ اور ان کی قوتِ اثر، جمع احادیث کی اقسام اور ان کے احکام وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ایک تحقیقی مقالہ شامل کیا ہے، جو بجائے خود ایک کامل رسالہ ہے، جس سے اردو دانوں کو فنِ حدیث کی اہمیت اور اس کے لئے درکار اہلیت —— تیقظ و بیدار مغزی کے ساتھ وفورِ علم ودقتِ نظر کی ضرورت —— کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی اس کا پتہ بھی چلتا ہے کہ ہر کسی مدعیٔ معلومات کا چند حروف جان کر اپنے کو فنِ حدیث کا امام سمجھ بیٹھنا اس فن کی کیسی ناقدری اور اس شخص کی کس قدر نااہلی کا ثبوت ہے۔

ب: پوری کتاب پر وقت کے اساطین علم اور اساتذۂ حدیث بالخصوص حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہ، حضرت مولانا زین العابدین صاحب رحمہ اللہ جیسی عبقری ومتقی شخصیات نے نظر ثانی کر کے تائید وتوثیق فرمائی ہے جس سے کتاب موثوق تر ہوگئی ہے، جب کہ خود مصنفؒ کا مقامِ علم بھی اس کے لئے کافی تھا

ج: مصنف نے جہاں موضوع حدیث کی نشاندہی کی ہے وہیں اگر وہ حدیث دوسرے طریق یا دیگر الفاظ کے ساتھ معتبر مانی گئی ہے تو اس کی نشاندہی بھی کر دی ہے کیوں کہ بسا اوقات نفسِ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے، اگر چہ وہ روایت یا متن

موضوع ہوتا ہے، اس کی نشاندہی نہیں ہونے سے —— جیسا کہ بہت سے لوگوں نے نہیں کی —— عوام الناس فی نفسہٖ اس مضمون ہی کو موضوع اور خلاف اصل سمجھنے لگتے ہیں۔

د: اسی طرح اگر کسی حدیث موضوع کا مفہوم کتاب وسنت کے مطابق ہو، یا وہ بات صحابہؓ یا اولیاء سے ثابت ہو تو اس کی نشاندہی بھی کردی ہے کیوں کہ بسا اوقات کسی صحابی کا اثر، یا کسی بزرگ کا قول ہوتے ہوتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو گیا یا کردیا گیا تو جہاں اس غلطی یا گستاخی کی تشخیص ضروری ہے وہیں اس قول کی واقعیت سے صحیح نسبت کے ساتھ فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ کتاب متعدد خصوصیات کی وجہ سے اپنی مثل آپ ہے، کتاب کو مفید، موثر اور معتبر بنانے کے لئے مصنف نے کتنی محنت کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے دورانِ تصنیف ایک سو پچیس کتابوں کو مدنظر اور بیسیوں علماء حدیث سے ربط رکھا ہے۔

بہرحال یہ ایک عمدہ کام اور بہتر سلسلہ ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہو چکے کام کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور بقیہ کام کی جلد تکمیل ہو کر منظر عام پر آنے کا سامان فرمائے۔ آمین

امید کہ علماء و علم دوست عوام اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

(تبصرہ شمارہ ڈسمبر ۱۳ء)